تاریخ ادب اُردو

(1858 تا 1914)

جلد یازدہم

محمد انصار اللہ

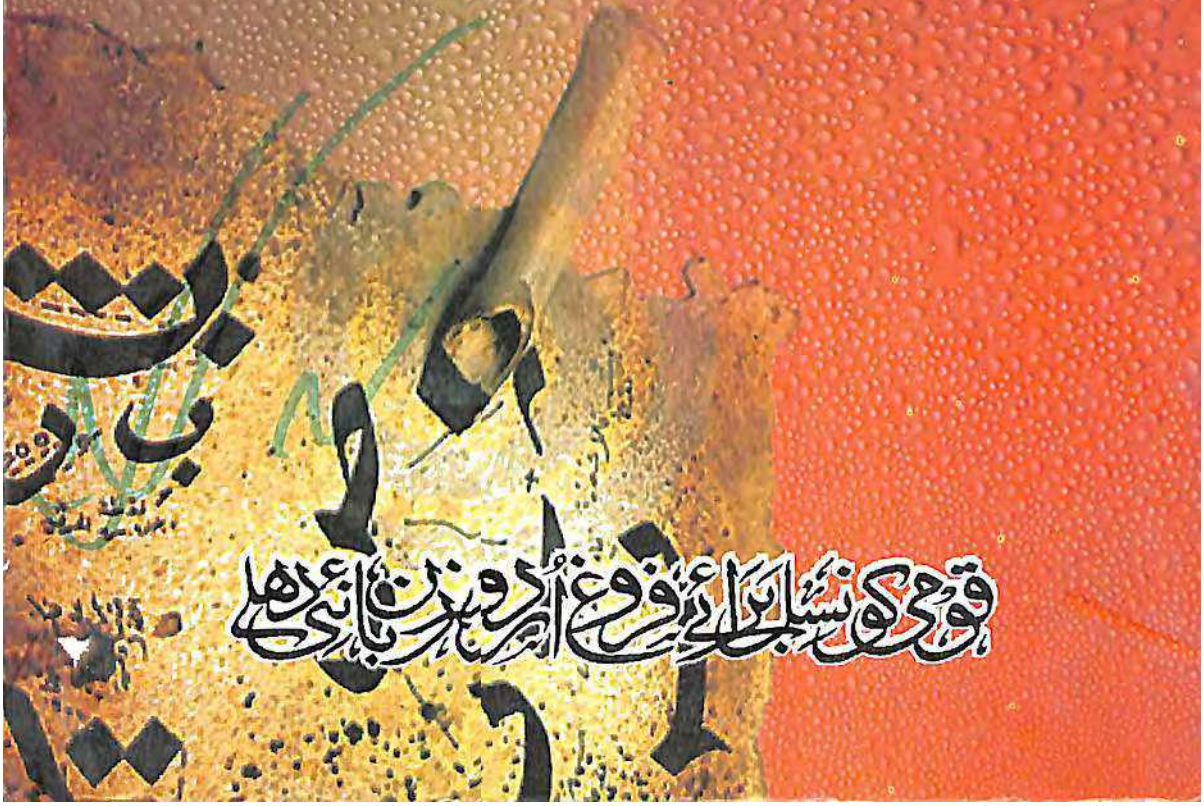

تاریخ ادب اردو

(1858 تا 1914)

جلد یازدہم

مصنف

محمد انصار اللہ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

©قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2013

تعداد : 550

قیمت : -/164روپے

سلسلۂ مطبوعات : 1798

Tareekh Adbe Urdu (Vol.XI)

By: Mohd. Ansarullah

ISBN :978-81-7587-980-5

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746

فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد، دہلی۔110006

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

اردو دنیا کی ان مقبول ترین زبانوں میں سے ہے جس کے بولنے، لکھنے، پڑھنے اور سمجھنے والے دنیا کے مختلف ممالک میں آباد ہیں اور اب اس زبان کی عمر تقریباً ہزار سال کے قریب ہوگئی ہے۔ گذشتہ ڈھائی سو سال میں اس نہایت شیریں، وقیع اور دل پذیر زبان کی چھوٹی بڑی متعدد تاریخیں اور بہ کثرت تذکرے لکھے اور شائع کیے جا چکے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، جیسا کہ اس کے نام سے بھی ظاہر ہے، اردو زبان و ادب کے فروغ، ترویج اور توسیع پر نہایت عمدہ اور مثبت مقاصد کے ساتھ وجود میں آئی ہے۔ کونسل کی کوشش رہی ہے کہ عوام و خواص میں یکساں اس ہر دل عزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تذکرے اور تاریخ کی معیاری کتابوں کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔ تذکرہ نویسی میں جامع التذکرہ کے نام سے تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

تاریخ میں پہلی کوشش پروفیسر گیان چند جین اور پروفیسر سیدہ جعفر کا سترھویں صدی کی نظم و نثر سے متعلق ہے، پانچ جلدوں پر مشتمل مکرر اشاعت کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ جبکہ

دوسرا کام پروفیسر ظفر احمد صدیقی کا اٹھارھویں صدی عیسوی کی نظم سے متعلق ہے جو ایک ضخیم جلد کی صورت میں جلد منظر عام پر آنے والی ہے۔ تیسرا کام پروفیسر محمد انصار اللہ کا انیسویں صدی عیسوی کی زبان و ادب کی نظم و نثر کے ارتقا سے متعلق ہے جو تین جلدوں اور ہر جلد تین حصوں پر مبنی ہے۔

اس طرح تاریخ ادب اردو کا یہ پروجیکٹ 17 جلدوں پر مشتمل ہوگا جن میں پہلے کی پانچ جلدیں جیسا کہ ذکر کیا گیا منظر عام پر آ چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب تاریخ ادب اردو کی ۱۱ ویں جلد ہے جو کہ پروفیسر انصار اللہ نے تصنیف کی ہے۔

ہماری کوشش ہے کہ بقیہ جلدیں بھی جلد از جلد اور بہتر انداز سے سامنے لا سکیں، اس کے لیے قارئین کرام اور ارباب علم و بصیرت کی طرف سے حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ نیز اہل علم سے گزارش ہے کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تا کہ جو خامی رہ گئی ہے وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

ڈائرکٹر

بیاں اپنا

دہلی میں محمد اکبر شاہ ثانی اگر چہ نام کے لیے ہی بادشاہ تھے لیکن خاص و عام کے دلوں میں ان کا وقار وہی تھا جو اکبر اعظم کا تھا۔ خود حضرت بادشاہ کا بھی یہ حال تھا کہ ملک کے طول و عرض میں رونما ہونے والے واقعات سے وہ خود کو بے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ کبھی ضرورت محسوس کرتے تو کمپنی کے بااختیاروں سے سفارش کر کے مناسب احکام بھی جاری کرا دیتے تھے۔

فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان کو ''دلیر و باہمت اور اس زمانے کا مدبر'' سمجھا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے علاقے کی حد میں قابل ذکر حد تک اضافہ کیا تھا۔ نواب سعادت علی خاں نے اپنے ملک کا تقریباً نصف کمپنی کے حوالے کر کے وزارت حاصل کی تھی۔ پھر غازی الدین حیدر کو کمپنی نے خطاب ''شاہِ زمن'' سے بادشاہ بنا دیا۔ لیکن اس بادشاہت کے زمانے میں فیض آباد کی رونقوں کی طرف توجہ نہیں تھی۔

ہندوستان میں انگریز ابتدا میں تجارتی مقاصد سے آئے تھے۔ ایک مدت میں جب ان کی تجارت مستحکم ہو گئی تو انھوں نے مختلف مقاموں پر فوجی چھاؤنیاں بنائیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور کانپور کی چھاؤنی تھی جسے ''ملک نصارا'' کہا جاتا تھا۔ کلکتہ میں کمپنی کا گورنر جنرل رہتا تھا گویا یہ شہر انگریزوں کا پایۂ تخت تھا۔ مدراس میں انگریز گورنر رہتا تھا۔ انگریز عملداری میں اور اس کے زیر اثر علاقے میں فکر و خیال میں ایک حد تک یکسانیت معلوم ہوتی ہے چنانچہ تاریخ ادب اردو کی

اس جلد میں ایسے ہی مراکز کی علمی اور ادبی کارفرمائی کا احوال قلمبند کیا جا رہا ہے۔ ان مراکز کے نام اس طرح ہیں:

فیض آباد، کانپور، الہ آباد، خطۂ بہار، بنگال اور مضافات (مرشد آباد، کلکتہ، ہوگلی، ڈھاکہ، سلہٹ) صوبہ متوسط (برار، برہانپور، بھوپال، جبلپور، ناگپور) گجرات (احمد آباد، بڑودہ، بھڑوچ، سچین، سورت، کھمبایت) بمبئی، دکن (حیدر آباد، اورنگ آباد، کرنول) کرناٹک اور متعلقات (میسور، کرناٹک، مدراس)

زبان اردو اس زمانے تک بیرون ملک میں بھی بعض ممالک (ایران، افغانستان، نیپال، برما، لنکا، فرنگ) میں جڑ پکڑنے لگی تھی۔

اردو ادب کی تاریخ کو (1221ھ/1806 تا 1253ھ/1837) علاقائی تقسیم کے ساتھ اس طور پر مرتب کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اس کاوش کے فروگذاشتوں سے خالی ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ارباب علم و دانش سے توقع ہے کہ وہ اس تاریخ کو بہتر اور صحیح تر بنانے میں ہماری رہنمائی فرمائیں گے۔ فقط

محمد انصار اللہ

4/1172 سرسید نگر، علی گڑھ (یوپی)

فہرست

1- فیض آباد	1
2- کانپور	49
3- الہ آباد	107
4- خطہ بہار	165
5- بنگال اور مضافات	201
الف۔ مرشد آباد	202
ب۔ کلکتہ	211
ج۔ ہوگلی	253
د۔ ڈھاکہ	257
ہ۔ سلہٹ	263
6- صوبہ متوسط	273
الف۔ برار	277
ب۔ برہانپور	283

ج۔ بھوپال	291
د۔ جبل پور	301
ہ۔ ناگپور	303
7- گجرات	309
الف۔ احمد آباد	317
ب۔ بڑودہ	319
ج۔ بھڑوچ	323
د۔ سچین	327
ہ۔ سورت	333
و۔ کھمبات	341
8- بمبئی	347
9- دکن	371
الف۔ حیدرآباد	375
ب۔ اورنگ آباد	411
ج۔ کرنول	419
10- کرناٹک اور متعلقات	431
الف۔ میسور	433
ب۔ کرناٹک	449
ج۔ مدراس	473
11- بیرون ملک	493
الف۔ ایران و افغانستان	494

ب۔نیپال 499
ج۔برما 501
د۔لنکا 507
ہ۔فرنگ 509

(1)

فیض آباد

الف۔غزل

1- اعجاز نواب اصغر علی خاں	7
2- ترقی نواب مرزا محمد تقی خاں	8
3- سوزاں مرزا احمد خاں	9
4- بریاں مرزا مظفر علی خاں	10
5- ناسخ شیخ امام بخش	10
6- آتش خواجہ حیدر علی	11
7- واہب شیخ ہدایت حیدر	11
8- رقت مرزا قاسم علی	12
9- خلیق میر مستحسن	13
10- خلق میر احسن	15
11- انیس میر ببر علی	17
12- نامی میر حسام الدین	19

13- رشک میرعلی اوسط 21
14- رند نواب سید محمد خاں 21
15- واقف 22
16- والہ 22

ب۔شاعرات

17- نازک زینت 23
18- دولھن بیگم 25

ج۔مرثیہ

انور علی مرزا 27
1- مقبل اکبرعلی 27
2- میر محمدعلی 28

د۔مثنوی

29
1- عازم 30

بارہ ماسہ

33

ہ۔ریختی

41
مخلوق سیداحسان علی 41

و۔ نثر

43
احمدعلی 43
حواشی 45

اگر چہ فیض آباد کی آبادی قدیم تر تھی، اس فیض بنیاد شہر کی تہذیب، روایت اور رونق جس کا شہرہ چلا آتا ہے، ایک خاتون کی ذات بابرکت کا فیضان تھا۔ اس خاتون کو آج بھی زمانہ بہو بیگم کے نام سے یاد کرتا ہے۔ نام اس نیک بخت کا ''لمۃ الزہرا'' تھا اور وہ محمد شاہ دہلی کے وزیر اور گجرات کے صوبے دار مؤتمن الدولہ نواب محمد اسحاق خان بہادر کی نور نظر تھی۔ پیدا ہوتے ہی بادشاہ کے ارشاد کی تعمیل میں بچی کو ''آل نال سمیت'' محل میں بھیج دیا گیا۔ وہیں پلی بڑھی۔ سالِ ولادت اس کا 1134ھ (1722) ہے۔ بادشاہ نے اپنی اس بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام سے شجاع الدولہ کے ساتھ کی۔ باپ یعنی مؤتمن الدولہ نے اپنا سارا مال متاع بطور نذر اس کے لیے پیش کر دیا۔ خواجہ عبدالروف عشرت نے لکھا ہے:

> ''یہ شادی 1158ھ (1745) میں ہوئی تھی۔ بادشاہ نے جو جہیز دیا اس کے علاوہ بائیس صوبوں کی جائیداد اور شاہی خزانے کی بے انتہا رقم صوبہ اودھ میں آئی تھی۔''[1]

لمۃ الزہرا کو سسرال سے ''نواب بہو بیگم'' کا خطاب ملا۔ بہو بیگم نہایت مدبّر اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ مذکور ہے کہ:

> ''شجاع الدولہ جوانی کی عمر اور نشہ حکومت کے تقاضے سے ابتدا میں عیاشی و تن پروری میں مشغول تھا اور اسی سبب سے بعض عمائد و ارکین کی یہ مشورت ٹھہری کہ اس کو حکومت سے خارج کر کے نواب محمد قلی خاں برادر زادہ صفدر جنگ کو کہ الہ آباد میں مقیم تھا بلا کر مسندِ حکومت پر نصب کریں۔ نواب بہو بیگم صاحب نے کہ اس کا اقتدار بہت

تھا اس ارادۂ بیجا سے ارا کینِ ریاست کو باز رکھا اور اس وقت سے نواب شجاع الدولہ
نے آئینِ ریاست داری کو کارفرمایا اور پردہ غفلت کا گوشِ ہوش سے اٹھایا۔'' 2

نواب شجاع الدولہ کی وفات کے بعد بہو بیگم نے ان کی تمام مخلات کی اولاد کو بلایا اور اپنے بیٹے نواب آصف الدولہ کو ہدایت کر کے ہر ایک کے صَرفِ خاص کے لیے رقمیں مقرر کروا دیں۔ آصف الدولہ ''لکھ لُٹ'' مشہور تھے۔ ماں نے فضول خرچیوں پر پابندی عائد کی، نتیجہ یہ ہوا کہ مسند نشیں ہونے کے بعد وہ:

''فیض آباد کے مقام کو ناخوشگوار جان کر لکھنو منتقل ہو گئے اور اس کی تعمیر شروع کی.....
لکھنو کی زمین اونچی نیچی ہے اور بازار و گلیاں بہت تنگ ہیں۔'' 3

لکھنو میں منتقل ہو جانے کے بعد بھی آصف الدولہ ماں سے رقم کا مطالبہ کرتے رہتے تھے، اس کے باوجود بہو بیگم نے اپنی زندگی میں اپنے شہر کی رونقوں کو کم نہیں ہونے دیا۔ عبدالحلیم شرَر نے لکھا ہے:

''بہو بیگم صاحب کے موجود رہنے سے فیض آباد کو ان کی زندگی تک تھوڑی بہت رونق
حاصل رہی۔ اگر چہ ان کی زندگی میں بھی نواب آصف الدولہ کی نالائقیوں نے بیگم
صاحبہ کے اطمینان میں اور اس کی وجہ سے فیض آباد کے امن وامان میں خلل ڈالا مگر اس
محترم خاتون کی زندگی تک وہ جھگڑے اور ہنگامے بھی ایک گونہ باعثِ رونق
ہو جایا کرتے تھے۔ ان کی وفات پر فیض آباد کی تاریخ ختم ہو گئی۔'' 4

بہو بیگم نے لمبی عمر پائی تھی۔ آصف الدولہ کی فیاضیاں دیکھیں۔ سعادت علی خاں کی نیابت کے بدلے میں آدھے ملک پر انگریزوں کا قبضہ دیکھا۔ آخر میں غازی الدین حیدر کی مسند نشینی کے واقعات بھی کچھ دیکھے اور کچھ سنے۔ مستقبل میں جو ہونے والا تھا بہت کچھ ظاہر تھا۔ بہو بیگم نے دور اندیشی سے کام لیا اور:

''کئی لاکھ روپیہ سرکارِ انگریزی میں جمع کر کے تمام عزیزوں، متوسلوں، اپنے ادنیٰ ادنیٰ
نوکروں کا وظیفہ نسلاً بعد نسلٍ مقرر کر دیا جو آج تک ان کی اولاد کو ملتا ہے۔ اپنے مقبرے
کے واسطے ایک معقول آمدنی گورنمنٹ میں جمع کرا دی کہ یہ مقبرہ فیض آباد گلاب باڑی
میں اب تک برقرار ہے۔ آج وہ عقلمند، خوش نصیب، کنبہ پرور لڑکی جس کا نام

اُمّۃ الزہرا، خطاب بہو بیگم اور لقب جناب عالیہ تھا.....ایک گہری قبر میں آرام سے سو رہی ہے۔ قرآن خواں اس کی قبر پر قرآن خوانی کرتے ہیں۔ ہر سال ۔ ی کا فاتحہ نہایت احتشام سے ہوتا ہے.....ایک بڑا عملہ اس تربت کی جاروب کش ۔ دمت اور حفاظت کے لیے مقرر ہے۔"5

نواب بہو بیگم نے 25 محرم 1231ھ (دسمبر 1815) بروز پنجشنبہ سہ پہر کے وقت انتقال کیا۔ ان کے مرتے ہی جس کے ہاتھ جو کچھ لگا لے کر بھاگ گیا۔ غازی الدین حیدر نے متروکۂ جدّی لینے کے لیے نصیرالدین حیدر کو بھیجا۔ فقط ایک کروڑ روپیہ اور بیس صندوقچے جواہرات کے ملے۔ تمام اعزا اور متعلقین ایک ایک کر کے فیض آباد سے لکھنو چلے گئے۔ لکھا ہے کہ:

"نواب داراب علی خاں نے سمجھایا.....کسی نے سماعت نہ کی۔ لکھنو میں چلے آئے۔"6

نواب آصف الدولہ کے فیض آباد سے چلے آنے کے بعد سبھی نامور اُمرا یکے بعد دیگرے ان کی خدمت میں لکھنو میں حاضر ہو گئے۔ گنتی کے کچھ رئیس اس شہر میں رہ گئے تھے۔ سب سے اہم نام نواب داراب علی خاں کا تھا کہ انھوں نے بہو بیگم کی وفات کے بعد بھی ان کی ڈیوڑھی کو آباد رکھنے کی کوشش کی تھی۔

بہو بیگم کی زندگی میں جو اُمرا فیض آباد میں عزّت اور وقار سے رہ رہے تھے ان میں قابل ذکر یہ تھے:

نواب اصغر علی خاں　　نواب محمد تقی خاں

نواب مرزا نصیرالدین خاں سالار جنگی

ان میں سے پہلے دو شاعر بھی تھے۔ اول الذکر کا حال شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے آخری تذکرہ میں اس طرح لکھا ہے:

"اعجاز تخلص نواب اصغر علی خاں خلف الرشید نواب نجابت علی خاں بہادر دام اقبالہ ولد نواب جنت مکاں وزیر اعظم ہندوستان شجاع الدولہ بہادر مرحوم۔ مشورۂ سخن بہ شیخ امام بخش ناسخ دارد۔"7

سعادت خاں ناصر نے بھی اپنے تذکرے میں ان کا ذکر کیا تو ہے لیکن ان کے حالات میں کچھ اضافہ نہیں کیا ہے۔ محسن نے البتہ دو باتیں مزید تحریر کی ہیں: یعنی

''باشندۂ لکھنؤ صاحب دیوان''8

یعنی شروع زمانے میں جب شیخ ناسخ فیض آباد میں مقیم تھے یہ ان سے مشورہ کرتے رہے ہوں گے۔ بہو بیگم کی وفات کے بعد جب لکھنو چلے آئے تو اعجاز نے اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا شاعر کی حیثیت سے تو ان کا مرتبہ کچھ بلند نہیں ہے لیکن ایک رئیس کے طور پر ان کی شخصیت ضرور موثر رہی ہوگی۔ بعض لوگ جو اِن کے متوسّل اور ملازم تھے ان کی روش پر چلتے ہوں گے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

جو شام تک بھی نہ آیا پیام دلبر کا — تو مر ہی جائیں گے ہم لے کے نام دلبر کا
دھڑکوں میں شبِ وصل کے کچھ چین نہ پایا — پھرتی رہی آنکھوں میں سحر شام سے تا صبح
پہنچے کبھی اپنے بھی نہ کانوں تلک آواز — نالے کروں اعجاز اگر شام سے تا صبح
نہ تھا ربطِ چمن مجھکو خزاں آئی جو گلشن پر — صبا نے خاک اُڑائی خوب ہی میرے ہی مدفن پر
نہیں دُستی جو مجھ کو وصل کی شب کاکلِ پیچاں — فسونِ عشق تو نے پڑھ دیا اعجاز ناگن پر

کیوں نہ افسوس کروں ہاتھ پہ میں مار کے ہاتھ
مرنا جینا ہے مِرا اک بُتِ عیّار کے ہاتھ

فیض آباد میں مقیم امرا میں صرف نواب مرزا محمد تقی خاں ترقی اور ان کے بیٹے شاعر کی حیثیت سے نام برآوردہ اور موثر بھی تھے۔ ان کی شاعری اور شاعر نوازی کا شہرہ بہت جلد دہلی تک پہنچ گیا تھا۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم کے تذکرے میں ہے:

''ترقی تخلص بزرگے ست در فیض آباد خوش باش، صاحب تمکین و عمدہ معاش، باجاہ و ثروت تمام، مرزا محمد تقی نام، تخشش در آلود و رنگین، فکرش بہ غایت خوب دلنشین، گویند در فیض آباد طرح مراختہ بہ خانہ ی انداخت و بہ ہر کس بزرگانہ می ساخت۔''9

شیخ مصحفی مرزا ترقی سے ذاتی طور پر واقف تھے اس لیے ان کے حالات میں انھوں نے جو تحریر کیا ہے اس کی اہمیت زیادہ ہے:

''اسدالدولہ رستم الملک میرزا محمد تقی خان بہادر ترقی تخلص عرف آغا صاحب، خلف
میرزا محمد امین نیشاپوری، جوانیست باغ و بہار۔ سرو قامتش بہ لباس موزونی آراستہ
و پنجۂ دستش بہ حنائے سخاوت پیراستہ عالی دود مانی ایشاں محتاج بہ شرح و بیان نیست۔
از ابتدائے شوقِ موزونیِ طبع تا الی الآن رجوع از تہ دل بہ اہل کمال و صاحبان سخن از
عطیہ دست اوزر بہ دست می آرند ہر کس و ناکس را محروم نمی گذارد۔''10

ان کے پورے القاب وغیرہ کے علاوہ محسن نے ان کے حالات میں بھی بعض اضافے کیے ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

''امیر ہاتو قیر نواب اسدالدولہ رستم الملک آغا مرزا محمد تقی خان بہادر فیل جنگ مغفور
ترقی خلف سید محمد امین نیشاپوری۔ ان کا مسکن فیض آباد، مقیم لکھنو، صاحب دیوان،
شاگرد رشید میر محمدی سوز۔''11

مرزا ترقی کے چند شعر یہاں مثالاً درج کیے جاتے ہیں۔

طالب تو کوئی ہے لبِ دریا شراب کا ہر دم جو کھینچ لیتا ہے ساغر حباب کا
دلچسپ کیا ہے مصرعِ موزونِ قدِ یار قابل ترقی میں ہوں ترے انتخاب کا
کاتب تقدیر گر نالہ سُنے تاثیر کا محو ہو کر لوح پر رکھدے قلم تحریر کا
صبح تک رہتا ہے اس مہ کا شب مہ میں خیال چاند بھی گویا ورق ہے یار کی تصویر کا
گر ایک شب بھی وصل کی لذت نہ پائے دل پھر کس اُمید پر کوئی تم سے لگائے دل
ترغیب دے ہے کس لیے کعبے کی تو ہمیں زاہد خدا کا گھر نہیں کوئی سوائے دل

مرزا ترقی میر سوز کے شاگرد اور ان کے طرز سخن کے دلدادہ تھے۔ وہ خود بھی موثر حیثیت رکھتے تھے اور فیض آباد میں ان کے اعزا اور اقربا بھی موجود تھے۔ مصحفی نے ان میں سے بعض کا احوال اپنے تذکروں میں لکھا ہے۔ یہاں دو کا حال نقل کیا جاتا ہے:

''مرزا احمد علی خاں شوکت جنگ المتخلص بہ سوزاں خلف نواب مرزا علی خاں مرحوم چوں
بہ آداب و امتیاز است، طبعے رسا دارد۔ از دست۔

لے جانہ شب فراق جاں کو کیا زندگی مجھ سے ناتواں کو

مجنون شکستہ پا ہے پیچھے کہہ دیجو پیام سارباں کو'' 12

''میرزا مظفر علی خاں بریاں تخلص خلف الرشید نواب احمد علی خاں شوکت جنگ سوزاں تخلص کہ ذکر ایشاں در تذکرۂ ہندی گذشت، ابنِ نواب مرزا علی خاں مرحوم جوانِ وجیہ، مہذّب الاخلاق است، ظاہر و باطنش بہ صلاح و سداد آراستہ دیدم و اخلاقِ کریمانہ و حالاتِ بزرگانہ در ایام شباب از ایشاں بہ ملاحظہ درآمد۔ از بسکہ در فہم و فراست طبع وقاد ایشاں بینظیر افتادہ گاہے کہ ارادہ بہ ظرف نظم کردن شعر آوردند در ہدایت کار نہایت نمودہ اند، بایں ہمہ خود را شاعر نمی گیرند۔ ایں ہم از بلند ہمتیِ ایشاں است۔ مشورہ بہ نواب محمد تقی خان بہادر عموے خود نمودہ اند و کم کم بایں عاصی ہم۔'' 13

سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں بھی ان کا حال تحریر ہے لیکن اس نے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ ان کے چند شعر یہ ہیں ؎

حُسن کا حور و پری کے نہ یہ عالم دیکھا ہم نے اس طرز کا انسان بہت کم دیکھا
ہجر کی شب کا میں کیا حال کہوں اے بریاں مُجھ دمِ سرد نہ اپنا کوئی ہمدم دیکھا
برچھی نے، نہ خنجر نے، نہ تلوار نے مارا عالَم کو ترے ابرو خمدار نے مارا
دم تو بھی نہ نکلا در و دیوار قفس سے سر اپنا بہت مُرغِ گرفتار نے مارا
دیکھا نہیں مجھ سا کوئی ناشاد کسی نے بھولے سے بھی مجھ کو نہ کیا یاد کسی نے
چلّائے بہت لیک نہ دی داد کسی نے افسوس سُنی اپنی نہ فریاد کسی نے

زبان ان کی بہت صاف ستھری، بیان سلیس اور رواں، اور مضامین اسی دنیائے آب و گل سے متعلق ہیں۔ محبوب بھی کوئی آدم زاد ہے اور عمدہ انسانی صفات سے متصف ہے۔ کلام تعقید اور پیچیدگی سے خالی ہے۔ یہی طرز شعر گوئی ہے جو فیض آباد کے صاف ستھرے ماحول میں مقبول و مروّج رہا تھا۔

شیخ امام بخش ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے اور اس شہر اور اہل شہر سے سکونت کا تعلّق بھی رکھتے تھے لیکن بقول ابنِ امین اللہ طوفان:

''مولد شریفش شہر مینو سواد فیض آباد است و از طفولیت در لکھنو بہ تحصیلِ علوم و تکمیلِ فنون

اوقات منیف بسر بردہ۔"14

اگر چہ فیض آباد میں بھی ناسخ کے بعض شاگرد رہ رہے تھے اُن کے طرزِ خاص کا اس شہر کے شعری ماحول پر کچھ زیادہ اثر نہیں معلوم ہوتا ہے۔ ان کے ایک شاگرد کا حال اور نمونہ کلام شروع میں درج کیا جا چکا ہے۔

شیخ ناسخ کے بعد اس شہر فیض آباد میں ایک بڑے استاد خواجہ حیدر علی آتش ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں ان کے استاد شیخ مصحفی نے تحریر کیا ہے کہ:

"موی الیہ از ابتدائے موزونی طبع کم کم خیال شعر فارسی و ہندی ہر دو می کرد لیکن میلان طبعش بہ طرف فارسی بیشتر بود۔"15

یہ اطلاع قابلِ توجہ ہے۔ شروع زمانے میں خواجہ آتش فیض آباد میں معمولاً فارسی میں شعر کہہ رہے تھے۔ اردو کی شاعری پر اس وقت ان کا اثر نہ ہونے کے برابر رہا ہوگا۔ بے شک ان کے جو شاگرد اس شہر میں موجود تھے وہ ان کے طرز کی اتباع کرتے ہوں گے۔ مصحفی کے تذکرے میں خواجہ آتش کے بعض شاگردوں کا حال لکھا ہے۔ ان میں سے ایک کے بارے میں ہے:

"شیخ ہدایت حیدر واہب تخلص، سکنہ فیض آباد، جوانِ غریب و دلچسپ است۔ بہ مقتضائے موزونیِ طبع چیزے کہ موزوں می کند آں را بہ نظر خواجہ حیدر علی آتش می گزارند و در ستارہ نوازی نیز دستے تمام دارد۔ عمرش سی و ہفت سالہ تخمیناً خواہد بود۔"16

ان کے چند شعر یہ ہیں۔

عاشقوں سے رازِ الفت کا نہاں ہوتا نہیں — بلبل بیتاب سے ضبطِ فغاں ہوتا نہیں
پنج روزہ حسن پر نازاں نہ ہو اے پُر غرور — کوئی باغ ایسا نہ دیکھا جو خزاں ہوتا نہیں
سینے کے داغوں کی گرمی سے گریباں جل گیا — آبِ اشکِ آتشیں سے اپنا داماں جل گیا
گر یہی ہے انقلابِ دہر تو سُن لی جیو — قبر میں ہندو گڑا واہب مسلماں جل گیا

دوسرے شعر میں خزاں زدہ کے معنی میں خزاں کا استعمال ہوا ہے۔ چوتھے شعر کی معنویت آج کے زمانے میں زیادہ قابلِ فہم ہے۔ کلام ان کا بھی صاف اور سلیس ہے۔ سامنے کی حقیقتوں کو مدلل انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے صنعتوں سے ان کو زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ یہ

سب باتیں وہ ہیں جو فیض آباد کی اس زمانے کی شاعری میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔

☆☆☆

نواب آصف الدولہ کے لکھنو میں منتقل ہو جانے کے بعد ایک ایک کر کے تقریباً سبھی باکمال شاعر وہاں چلے گئے۔ فیض آباد میں بیشتر وہی لوگ رہ گئے تھے جن کو اپنے مستقر سے بہت محبت تھی یا جو کسی وجہ سے گھر چھوڑ کر نہیں نکل سکتے تھے۔ ایسے میں وہاں دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شاعروں کی بن آئی اور وہ طرح طرح سے خودنمائی اور خودستائی کے مرض میں مبتلا ہو رہے تھے۔ قلندر بخش جرأت کے ایک شاگرد کے تعارف میں شیخ مصحفی نے لکھا ہے:

> ''مرزا قاسم علی رقت، قوم مغل..... مولدش شاہجہاں آباد است و در فیض آباد بہ سنِ تمیز رسیدہ طبعش از چہاردہ سالگی بہ طرف شعر میلان تمام داشت۔ آخر گفتہ گفتہ پُر گوشدہ و دراں ایام مشقِ سخن از میاں قلندر بخش جرات کردہ لیکن بہ زبانش چنیں است کہ من از جعفر علی حسرت کہ استادِ جرات است استفادہ کردہ ام۔ خیر ہر چہ باشد بیک سلسلہ است۔ عمرش سی سالہ خواہد بود۔''17

یعنی فخر اپنی صلاحیتوں یا اپنے کلام کی خوبیوں کے بجائے اس بات پر ہے کہ استاد کے استاد سے استفادہ کیا ہے اور اس طرح عملاً اپنے استاد سے برابری کا دعویٰ کیا جا رہا ہے۔ رقت کے کلام پر نظر کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاعری سے مقصود دقیق مضامین اور نازک خیالات کی پیشکش کے بجائے زبان کے روزمرہ اور محاورہ پر اپنی گرفت اور قدرت کا اظہار کرنا تھا۔ ان کے کچھ شعر یہ ہیں۔

خط وہ بھیجے رقیب کا لکھا — یہ بھی اپنے نصیب کا لکھا

چھٹ جائے کسی سے نہ ملاقات کسی کی — اللہ بگاڑے نہ بنی بات کسی کی

ہمارے سامنے مت ابر بار بار برس — جو ہم سے ہو سکے تجھ سے نہ ہو ہزار برس

جوان تم ہوئے نام خدا یہ رقت تو — گھٹا کے دیکھے ہے اب تک بھی تین چار برس

معنی اور مفہوم کے اعتبار سے ان شعروں میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ روایتی مضامین ہیں جن کو شاعر نے اپنی بول چال کی زبان میں موزوں کر دیا ہے۔

میر خلیق

شیخ غلام ہمدانی مصحفی استاد الاساتذہ تھے۔ شمالی ہند کے بیشتر مراکز پر ان کے شاگرد موجود تھے۔ پھر فیض آباد کو تو اردو شاعری کی تاریخ میں اہمیت حاصل رہی تھی اور جیسا کہ سطور بالا سے بھی ظاہر ہے یہاں ان کے تلامذہ عملاً چھائے ہوئے تھے۔ ان میں شاید سب سے زیادہ اہم شخصیت میر خلیق کی تھی۔ ان کے بارے میں قدرت اللہ قاسم نے تحریر کیا ہے:

''خلیق تخلص میر مستحسن برادر خرد میر احسن خلق پسر دوم میر غلام حسن حسن است۔ وے نیز شیریں گفتار پاکیزہ کردار حسن الخلق و الخلق واقع شدہ نسبت شاگردی بہ پدر والا تبار و برادر نامدار خود دارد۔''18

میر حسن کو بیانیہ شاعری میں کمال حاصل تھا اور ان کے اخلاف بھی اسی کے لیے ممتاز ہوئے۔ میر خلیق نے فیض آباد کے ماحول میں رہ کر غزلیں کہنی شروع کی تھیں اور اپنے والد کی ایما سے مصحفی کی شاگردی اختیار کی تھی چنانچہ خود مصحفی نے لکھا ہے:

''میر مستحسن خلیق برادر خرد میر احسن نیز از شانزدہ سالگی شوق شعر پیدا کردہ، چیزے بہ خیال خویش موزوں می کرد و درست و نادرستش را والد بزرگوارش برائے پاسِ خاطرِ پسر درست کردہ میداد و لہٰذا آنہم در عالمِ خردی زیاد از ذہنش معلوم می شد۔ چوں در آں ایام فقیر تازہ وارد ایں شہر بود مشارالیہ بعد ملاقات چند بسیار محظوظ شدہ برائے از دیاد بنائے خلت و داد آں عزیز را پیش من فرستاد و آموختہ کرد کہ ایشاں در ایں فن نظیر ندارند، اکنوں کہ فرصت وقت است نامی توانی چیزے از ایشاں بیاموز۔ سوی الیہ انتیاد امرِ والد ماجد را واجب شمردہ بہ رہنمونی شوق روز افزوں اکثر حاضری باشد و مشورہ بشعر از من می گرفت۔ بندہ مناسب طبعش شعر در یافتہ درہماں ایام گفتہ بودم کہ اگر زمانہ فرصت خواہد داد خوب خواہد گفت۔''19

اس ابتدائی مشق کے زمانے میں میر خلیق کی غزل گوئی کا انداز ذیل کے شعروں سے ظاہر ہے۔

اشک جو چشم خوں فشاں سے گرا تھا ستارہ کہ آسماں سے گرا

آتش گل پہ جل، کباب ہُوا　　رات بلبل جو آشیاں سے گرا
شیشۂ دل تو چور ہوجاتا　　کوئی پتھر نہ آسماں سے گرا
ہنس دیا یار نے جو رات خلیق　　کھا کے ٹھوکر اس آستاں سے گرا
نزع میں گرمری بالیں پہ تو آیا ہوتا　　اس طرح اشک مَیں آنکھوں میں نہ لایا ہوتا
میرے خورشید نہ ہوتا یہ مرا روزسیاہ　　تو نے گرزلف میں مکھڑا نہ چھپایا ہوتا
ناصحا چاک گریباں کے سِلانے کا حصول　　چاک آنکھوں کا مری تو نے سِلایا ہوتا

پھول پڑتا نہ خلیق آتش گل سے اس پر
آشیاں ہم نے نمک اونچا جو بنایا ہوتا

گر بُرا مانے نہ، تو کہہ دوں کہ کیا تجھ میں نہیں　　اور سب باتیں ہیں لیکن اک وفا تجھ میں نہیں
بے مروّت ہو تو کیا جانے تو ظالم کیا کرے　　اِس مُروّت پر تو پاسِ آشنا تجھ میں نہیں

سیدھے سادے خیالات ہیں جن کو مقامی بول چال میں نظم کر دیا گیا ہے ان میں نہ خیال آرائی کے کرشمے ہیں اور نہ فکر کی دقتیں۔ پہلے مطلع میں چشمِ خوں فشاں سے اشک کے گرنے کا بیان کیا گیا ہے جو عجیب ہے اس سے تو خون ٹپکنا چاہیے تھا۔ اس کے بعد کے شعروں میں پہلے مصرع کے آخر میں ہُوا اور ہو جاتا لائے ہیں اسی طرح سلوانا کے معنی میں سلانا نظم کیا ہے یہ پورب کی بول چال ہے۔ خلیق کے گھرانے کا تعلق دہلی سے تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان پر پورب کے عوام کی بول چال جاری ہوگئی تھی۔ سعادت خاں ناصر نے ان کے حال میں لکھا ہے:

> ''شاعرِ نامور، سخنورلئیق سید برگزیدہ، میر مستحسن خلیق خلف میر حسن مغفور۔ والد بزرگوار ان کے اول میر تقی میر کی خدمت میں ان کو لے گیے تھے میر صاحب نے کہا اپنی ہی اولاد کی تربیت نہیں ہوتی۔ غیر کی اصلاح کا کسے دماغ ہے۔ جب یہ سُنا تو ان کو میاں مصحفی کو تفویض کیا۔ چندے غزل کی اصلاح میاں صاحب سے لی پھر ریختہ کو بالائے طاق رکھ کر مصروف مرثیہ گوئی ہُوا اور خوب نام پیدا کیا خدا ہمیں بھی وہی توفیق عطا کرے۔ اگرچہ مرثیہ گوئی سہل اور غزل گوئی دشوار لیکن حاصلِ دنیا و دین اس میں ہے اب سہل اور دشوار کو تمیز کیا چاہیے ایک دن وہ شاعرِ ایمۂ ہدا شیخ ناسخ کی صحبت میں

گیا اور حسب استدعا ایک بند مرثیہ کا پڑھا کہ اس میں گرہ یہ تھی:

ع: لیلاف پڑھی اور اسے دودھ پلایا۔

شیخ نے کہا: آپ نے آیۂ کلام اللہ کو غلط باندھا

میر صاحب نے کہا: بہ ضرورت شاعری کے وہ نہ آسکا۔

شیخ نے کہا: کیا دشوار ہے۔ یوں کہیے

ع: پڑھ پڑھ کے لیلاف اسے دودھ پلایا۔"20

محمد حسین آزاد نے بھی اس واقعہ کو کسی قدر فرق کے ساتھ، غالباً کسی اور ماخذ سے نقل کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ:

"میر خلیق محاورے کے اس قدر پابند تھے کہ ان کے محضرِ کمال پر بجائے مہر کے بعض لوگوں نے کم علمی کا داغ لگایا ہے۔"21

جو بھی ہو میر خلیق ایک معزز مسلم گھرانے کے چشم و چراغ تھے ان کے بارے میں یہ ماننے کے لیے دل تیار نہیں ہوتا کہ وہ:

(الف) لایلاف سے بھی ناواقف تھے اور

(ب) آیہ کلام اللہ کو غلط نظم کر دینے کو جائز رکھتے تھے۔

صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ سپاہی پیشہ تھے اور اس پیشہ کے اثرات اور تقاضے مشہور و معروف ہیں۔ وہ اسی طبقے کے ساتھ بسر کرتے تھے اسی کی زبان بولتے تھے۔ اور ان کا کلام اسی کے روزمرہ میں ڈھلا ہوا ہوتا تھا۔ واقعات و روایات کی تلاش اور زبان و بیان کے مسائل کی تحقیق کا اس طبقے کے مزاج سے مناسبت نہیں ہوتی ہے سپاہی پیشہ ہونے سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ مرثیوں میں رزم کا بیان جاندار ہو گیا۔

میر خُلق

جیسا کہ مذکور ہوا، میر احسن خلق میر محمد مستحسن خلیق کے بڑے بھائی تھے اور وہ بھی اسی طرح شعر کہتے تھے۔ قدرت اللہ قاسم نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"خلق تخلص میر احسن، مبین پور میر غلام حسن حسن..... وے مانند تخلص خود سراپا خُلق

واقع شدہ۔ حیا وحلم بدرجۂ اعلیٰ دارد۔ طبعش رنگین وفکرش معانی آفریں است۔ مشق سخن از والد ماجد خود نمودہ واز اں رو کمپیچے در شعر خود حاصل فرمودہ۔"22

اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی کا کہنا ہے کہ:

"جوانیست خوش ظاہر وباحلم وحیا بہ مقتضائے موزونی طبع کہ موروثی است، کم کم خیال شعری کند واز نظر پدر بزرگوار خودی گزراند۔ عمرش تا امروز نوزدہ سالہ است۔"23

اس نوعمری میں ان کے کلام کا انداز ان شعروں سے ظاہر ہے۔

وہ ہلال ابرو نکل کر بام سے جاتا رہا　　اک جھلک دکھلا کے مجھ کو شام سے جاتا رہا
عجب عالم میں بیہوشی کے وہ مجھ کو نظر آیا　　کہ اتنا بھی نہ آیا ہوش جو پوچھوں کدھر آیا
گلی میں اس کی میں کس کس توقع پر گیا لیکن　　نہ دیکھا جا کے وہاں اس کو تو آہ سرد بھر آیا
اک بار اس کے کوچہ میں جانا ضرور ہے　　یہ حال اپنا اس کو دکھانا ضرور ہے

نواب شیفتہ نے ان کا ذکر کیا تو ہے لیکن نہ کوئی رائے دی ہے اور نہ کچھ حال ہی لکھا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"خلق تخلص الموسوم بہ میر احسن بن میر حسن صاحب مثنوی سحر البیان کہ شہرہ بہ بدر منیر است، کسب سخن از پدرش کردہ اور است۔

بیقراری میں کٹی رات تو یہاں اپنے تئیں　　چین سے زلف میں دل کیونکہ رہا ہووے گا
دل لگاتے تو لگایا یہ نہ تھا کچھ معلوم　　جی پہ کیا گذرے گی اور جان پہ کیا ہووے گا"24

سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں بھی ان کے دو شعر ملتے ہیں۔

آئے ہیں عدم سے چھٹ کے روتے ہیں پڑے　　دو دن کی یہ زیست ہے سو کھوتے ہیں پڑے
گل کے آنے کی خبر بھی صبا لاتی نہیں　　موسم گل شاید اس ایام سے جاتا رہا

لالا سری رام نے میر خلق کو صاحب دیوان بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ:

"1803 کے بعد سو برس کی عمر میں وفات پائی۔"25

ان کی وفات کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہے۔ ان کا دیوان نایاب ہے البتہ تعجب اس پر ہے کہ اتنی لمبی عمر کے باوجود ان کو کما حقہ شہرت نصیب نہیں ہو سکی۔ ابن طوفاں، سحر، محسن او رنادر وغیرہ کے

تذکروں میں ان کا نام بھی نہیں آیا ہے۔

میر خلق کا جو کلام دستیاب ہے اس میں ایک غزل کی ردیف تین کلمات پر مشتمل ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی قوتِ مشقی اور قدرتِ کلام کے اظہار کے لیے بھی بعض غزلیں کہی تھیں۔ ان کی شاعری کی بنیاد بطور مجموعی محاورہ بندی پر معلوم ہوتی ہے اور اس کے لیے کتب لغات کی ورق گردانی کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ مضامین بھی ایسے ہیں جن کے لیے غور و فکر اور مطالعہ کی کچھ احتیاج نہیں ہے۔ سامنے کی باتیں ہیں جن کو سیدھی سادی بول چال کی زبان میں نظم کر دیا گیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ شیفتہ اور خویشگی وغیرہ نے ان کے کلام کے بارے میں رائے ظاہر نہیں کی ہے۔

میر انیس

ببر علی نام تھا، میر محمد مستحسن خلیق کے بیٹے تھے۔ یہ بھی اپنے بزرگوں کے طور پر بول چال کی زبان میں شعر کہتے تھے۔ سعادت خاں ناصر نے ان کے حال میں لکھا ہے کہ:

> ''جب لکھنو میں تشریف لائے شوق مرثیہ گوئی کا ہوا۔ وہ سب غزلیں یک قلم دھوڈالیں۔ نیا سنسیا کیں۔ چونکہ غزل میر (انیس) صاحب کی شہر لکھنو میں صفت عنقا نایاب ہیں، بہت تلاش سے ایک غزل دستیاب ہوئی وہی واسطے ملاحظۂ ناظرین کے لکھی جاتی ہے۔''26

سعادت خاں ناصر کے اس بیان میں مبالغہ ہے۔ انیس کی غزلیں لکھنو میں اتنی نایاب نہیں تھیں۔ خود ناصر نے بھی ان کی ایک نہیں، تین غزلوں کے اشعار نقل کیے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

شہید عشق ہوئے قیس نامور کی طرح　　جہاں میں عیب بھی ہم نے کیے ہنر کی طرح

خموش اے بلبلِ شوریدہ اس میں کیا ہے بس میرا　　یہ اپنی اپنی قسمت ہے چمن تیرا، قفس میرا

بنے یوں تین در دریا کے اندر　　کہ ششدر ہوگئی سدِّ سکندر

آخری شعر میں ''در'' کی مسلسل تکرار شاعر کی نومشقی پر دلالت کرتی ہے۔ صنائع لفظی و معنوی کا یہ شوق عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا اور بالآخر یہی انیس کے فن کا امتیازی وصف بن گیا۔

کلب حسین خاں نادر نے انیس کی ایک غزل کی تخمیس کی تھی۔ اس کا مطلع اور مقطع درج

ذیل ہے۔

وجد ہو بلبل تصویر کو جس کی بو سے　　اس سے گل رنگ کا دعویٰ کرے پھر کس رو سے
شوخی چشم کا تو کس کی ہے دیوانہ انیس　　آنکھیں ملتا ہے جو یوں نقش سم آہو سے

یہ بھی میر انیس کے ابتدائی زمانے کا کلام ہے۔ اس میں مرکب ترکیبیں بھی موجود ہیں اور لفظی و معنوی ہر قسم کی صنعتوں کا استعمال بھی کیا گیا ہے البتہ طویل اور مشکل ردیفیں انیس کی غزلوں میں غالباً کام میں نہیں لائی گئی ہیں۔

میر انیس نے اتنی مدت تک غزلیں کہی تھیں کہ نومشقوں کی نگاہوں میں انھیں استادی کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں بھی ان کے ایک شاگرد کا حال لکھا ہے:

> ''اسد الدولہ مرزا محمد ذکی خان بہادر عرف نواب بہادر تخلص ذکی خلف مرزا حیدر۔ نواب موصوف پہلے شاگرد میر ببر علی انیس کے تھے۔ بعد اس کے سرفراز علی قادر کے ہوئے۔''27

یہ ذکی نواب محمد تقی خاں ترقی کے پوتے تھے۔ ان کا انیس کی شاگردی اختیار کر لینا قابلِ توجہ واقعہ ہے۔ یہ توسّل بھی بعد کے زمانے میں میر انیس کی ترقی اور شہرت کا سبب ثابت ہوا ہوگا۔

محسن نے بھی میر انیس کے ایک غزل گو شاگرد کا احوال لکھا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

> ''عابد کمیدانِ پلٹن ذوالفقار حیدری میر عابد علی عابد ولد میر مہدی، باشندۂ لکھنو، شیخ امان علی سحران کو کہتے ہیں کہ یہ میرے شاگرد ہیں اور میر انیس مرثیہ گو فرماتے ہیں کہ مجھ سے اصلاح لی ہے۔ مولف سے ملاقات نہیں کہ حال معلوم ہوتا۔''28

یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ بعض اور بھی نومشق غزل گو میر انیس کے شاگرد رہے ہوں گے۔

میر خلیق ان کے بھائی اور اخلاف میں سے بھی بعض نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے تھی۔ کچھ شک نہیں کہ ان میں سے کچھ کو اچھے اور معتبر استادوں سے فیضیاب ہونے کا موقع بھی حاصل ہوا تھا، بعض کو اچھے سرپرست بھی ملے تھے اور خود ان حضرات کی صلاحیتوں میں بھی کمی نہیں تھی لیکن اس گھرانے کے شاید کسی بھی فرد کو اس فن دشوار یعنی غزل گوئی میں اعتبار و امتیاز تو کجا، قابلِ ذکر حیثیت بھی حاصل نہیں ہو سکی۔ یہی نہیں بلکہ ان میں سے شاید کوئی اس کا خواہاں بھی نہیں تھا۔

نامی

فیض آباد کو نواب شجاع الدولہ کے وقت میں شعر و ادب کے ایک مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس شہر کی شہرت اور کشش بعد تک بھی برقرار رہی تھی اور باہر سے بھی کوئی کوئی شاعر آجاتا تھا۔ میر محمد خاں سرور کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کے رئیسوں اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کے محاصوں میں نامی تخلص کے ایک شاعر تھے جو فیض آباد میں آئے تھے لکھا ہے کہ:

"نامی تخلص مبارز الدولہ میرزا حسام الدین حیدر خان بہادر از اقربائے نواب وزیر الممالک شجاع الدولہ مغفور۔ جوان قابل و موزب و وجیہ و عاقل و دوست آشنا در عالم اخلاص و دوستی بسیار گرم اختلاط۔ غرض کہ ذات مودب آیاتش مملو از اوصاف حمیدہ است۔ شعر برجستہ از طبع وقادش سر بر می زند و حلاوت بخشِ سامعاں می گردد و اصلاح شعر از میر مستحسن خلیق کہ خلف میر حسن مصنف مثنوی بینظیر است گرفتہ۔ از چندے بہ فیض آباد وارد و بود باز معاودت بہ دار الخلافہ نمودہ۔"29

ظاہراً نامی جس زمانے میں فیض آباد پہنچے تھے بہو بیگم زندہ تھیں اور میر خلیق بھی وہیں مقیم رہ کر غزل گوئی میں مصروف تھے۔ نوعمر نامی نے وہاں اپنے کلام پر میر صاحب سے اصلاح بھی لی۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے بھی نامی کے حالات کسی قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس کا اختصار اس طرح ہے:

"میر حسام الدین حیدر موسوی خلف مرزا محمد غیاث کہ یکے از صاحبزادہ ہائے مشہورۂ ایام دولتِ نواب ذوالفقار الدولہ نجف خان بہادر است۔ دے جوانیست سخن سنج، بذلہ گو بہ غایت نیک طینت۔ اصلش از نجف اشرف و لبسش خیلے باعظمت و شرف۔ پدر والا قدرش در انشا پردازی ید طولی دارد۔ این میر حسام الدین حیدر نامی انچہ از اشعار آبدار خود بایں ہیچ مدان سراپا نقصان فرستادہ۔ ہر یکے از آں لولوایست لاء لاء و گوہریست بے بہا۔"30

نامی نے کچھ مدت بعد شعر گوئی ترک کر دی تھی لیکن خلیق کے شاگرد کے طور پر وہ دہلی تک میں مشہور ہو گئے تھے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بھی اپنے تذکرے میں اس بات کا ذکر کیا ہے:

"نامی تخلص مبارز الدولہ نواب مرزا حسام الدین حیدر خان بہادر، سلسلہ قرابت ایشاں

بادالی لکھنوی پیوندد۔ از امرائے جلیل الشان است۔ صاحب فطرت سلیم وفکرت
مستقیم، رضی الافعال، شریف الخصال، عدیلش معدوم ونظیرش نایاب از احبائے والدِ
بزرگوار ایں بہ بیچ درحساب است۔ استفادۂ سخن از خدمت میر مستحسن خلیق کردہ۔
اکنوں بہ نظم اشعار نمی پرداز، لفتار نغمے بہ شنیدن باقی ست۔"31

نامی کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

تڑپھنا ہمصفیر و اب نہ دیکھو زیردام اپنا　　مبارک ہو تمھیں سیرِ چمن آخر ہے کام اپنا
بہت رویا کیے مجلس میں اہلِ درد سُن سن کر　　پڑھا تھا کچھ حسام الدین حیدر نے کلام اپنا
کام اس کو نہیں کچھ رخِ نیکو سے کسی کے　　وابستہ جو ہے حلقۂ گیسو سے کسی کے
دل دھڑکے ہے منہ فق ہے، لٹیں بکھری ہیں یکسر　　تم آج نکل بھاگے ہو قابو سے کسی کے

حسام الدین حیدر نامی نے اپنے بعض ہم عصروں کے طور پر غزلوں میں کبھی کبھی قطعے بھی شامل کیے ہیں مثال کے طور پر ایک یہ ہے۔

آواز دلخراش سے اک عندلیبِ زار　　کل کہہ رہی تھی اے فلکِ بے مدار حیف
اب کا برس بھی کنجِ قفس میں گزر گیا　　افسوس گُل، دریغ چمن، نوبہار حیف
ناگہ بہ گوشِ ہوش مرا دل یہ سُن صدا　　بولا بہ حالِ زار وبجانِ فگار حیف
میں نے عبث امید حصولِ وصال پر　　برباد کی یہ زندگیِ مستعار حیف

پھر آپ ہی آپ سوچ کے کچھ بند ہوگیا
تصویر کی کلی کی طرح سے ہزار حیف

حسام الدین حیدر خاں نامی کا کچھ ذکر الٰہی بخش خاں معروف کے حالات میں بھی آچکا ہے۔ ان کے کلام میں سادگی کا وصف نمایاں ہے۔ اکثر شعروں میں دردآمیز مضامین باندھے ہیں۔ وہ زمانہ تھا جب زبان وبیان کے ضابطے اور معیار مقرر نہیں ہوئے تھے۔ شرفا کی بول چال ہی سند تھی اور نامی کے کلام میں بھی وہی صورت ہے۔ بعد کے چلن کے مطابق نامی کے کلام میں متروک الفاظ بھی موجود ہیں۔

اوپر جو کچھ مذکور ہوا اس سے ظاہر ہے کہ فیض آباد میں عموماً غزل ہی کی صنف رائج تھی۔ اس

شہر میں بڑے مقتدر امرا نہیں رہ گئے تھے اس لیے قصیدہ گوئی کا چلن بھی نہیں رہ گیا تھا۔ ممکن ہے بعض شاعروں نے کچھ مدحیہ کلام لکھا ہو لیکن اسے شہرت حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ مرثیے کا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

بہو بیگم صاحبہ کی وفات کے بعد حالات میں بگاڑ پیدا ہوا۔ فیض آباد کے شاعروں کو بھی وطن چھوڑ کر معاش کی تلاش میں نکلنا پڑا۔ میر علی اوسط رشک کے احوال میں سعادت خاں ناصر نے جو لکھا ہے وہ قابل توجہ ہے:

> ''اس نقل کا ان (میر علی اوسط رشک) کی زبانی بیان کہ آوان میں مرزا محمد تقی خاں ترقی کے دولت خانے میں صحبت مشاعرہ مقرر اور روز مقررہ وہاں از دحام اہل فضل و ہنر ہوتا تھا۔ چار و ناچار میر مستحسن خلیق کو کہ فیض آباد میں ان سے کوئی بہتر نہ تھا غزل دکھلائی اور ہنرمندوں کی زبان سے واہ واہ پائی۔ چندے زمانہ اسی طور سے گذرا۔ 1231ھ (1815) میں کہ جناب عالیہ نے انتقال کیا اور سررشتہ روزگار کا برہم ہوا عزم بالجزم سکونت لکھنو کا ٹھہرا۔''32

یعنی بہو بیگم صاحبہ کے بعد فیض آباد کی علمی اور شعری محفلیں اجڑنے لگی تھیں۔ میر خلیق کچھ مدت تک وہاں کسی نہ کسی طرح مقیم رہے لیکن کب تک رہتے۔ آخر انھیں بھی نکلنا ہی پڑا۔

رند

نواب سید محمد خاں رند فیض آباد کے معززین میں سے تھے۔ لالا سری رام نے ان کے ذکر میں لکھا ہے:

> ''رند نواب سید محمد خاں خلف الرشید نواب سراج الدولہ غیاث محمد خاں نیشاپوری جو نواب سعادت خاں برہان الملک صوبہ دار اودھ کے حقیقی بھانجے تھے، بہ عہد آصف الدولہ بہادر 11 ربیع الاول 1212ھ (ستمبر 1797) کو جمعہ کے دن بہ مقام فیض آباد پیدا ہوئے اور زیر نگرانی جناب امۃ الزہرا عرف بہو بیگم بہ ناز و نعمت پرورش پائی جب تک فیض آباد میں مقیم رہے میر مستحسن خلیق سے اصلاح لیا کرتے تھے اور اس زمانے میں وفا تخلص کرتے تھے ایک دیوان بھی مرتب کر لیا تھا۔''33

لالا سری رام نے رند کے جس دیوان کا ذکر کیا ہے اس کا حال تو معلوم نہیں البتہ ان کا جو دیوان گلدستۂ عشق کے نام سے چھپا ہے اس میں رند نے اپنے حالات میں تحریر کیا ہے کہ:

''میر مستحسن خلیق.....بعد چندے میر موصوف روانہ فرخ آباد شدند در اقم آثم بہ تاریخ ہفتم رجب 1240ھ (فروری 1825) از فیض آباد وارد دار الخلافۃ لکھنؤ گردید۔''34

میر خلیق فرخ آباد کیوں گئے فی الوقت اس بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں ہے البتہ فیض آباد سے وہاں جانے والوں میں میر رشک کے بعض اعزا بھی تھے۔ شاید وہاں قرابت کا کوئی سلسلہ ہوگا یا ممکن ہے معاش کے لیے وہاں کوئی بہتر صورت معلوم ہوئی ہو۔

فیض آباد کے اس ماحول میں صرف دوسرے تیسرے درجے کے شاعر رہ گئے تھے اور اب انھیں کے واسطے سے اس شہر کا نام لیا جاتا تھا شیفتہ کے تذکرے میں ایسے بعض شاعروں کا حال مندرج ہے مثلاً:

''واقف تخلص، درویشے بود در فیض آباد فی الواقع اشعار دلچسپ دارد۔ اوراست ؎

صبح پر وصلِ یار کی ٹھہری ہائے پھر انتظار کی ٹھہری
خوبرو ہو کے باوفا ہووے میں نہ مانوں اگر خدا ہووے
عشق میں کیا فضل و ہنر چاہیے آہ میں تھوڑا سا اثر چاہیے
سرد ہے بازار خوباں گرم بازاری نہیں کتنے یوسف دیکھتا ہوں، پر خریداری نہیں35''

اسی سلسلے میں ایک اور شاعر کا تعارف اسی تذکرے سے نقل کیا جاتا ہے:

''والہ تخلص از ہندوانِ فیض آباد است۔ بہ دہلی ہم آمدہ۔ اوراست ؎

اعجازِ لب اس کا دم عیسیٰ سے نہیں کم وہ پنجۂ سیمیں یدِ بیضا سے نہیں کم
معدوم کو کیونکر کوئی ثابت کرے والہ مضموں کمرِ یار کا عنقا سے نہیں کم36''

اس مذکور سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شعر و شاعری کا شوق فیض آباد کے عوام میں بھی گھر کیے ہوئے تھا۔ باقاعدہ سرپرستی نہ ہونے کے باوجود وہاں کے عوام بلکہ عامیوں نے ہی اس شہر میں شعر و ادب کی شمع کو روشن رکھا تھا۔ معیار بلند نہ سہی، فیض آباد کی شعری روایت کسی نہ کسی طور پر زندہ اور باقی تھی۔

شاعرات

فیض آباد میں غالباً بہو بیگم صاحبہ کی سرپرستی سے حوصلہ پا کر بعض خواتین بھی شعر کہنے لگی تھیں۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے تذکرے میں شاعرات کا حال اس تمہید کے ساتھ قلمبند کیا ہے:

''پوشیدہ مباد کہ اگر چہ تذکرہ تمام شد لیکن خاتمہ اش مشتمل بر اشعار چند زناں است داخل تذکرہ برائے آں نہ شدند کہ از تخلص بعضے ازاں آگاہی نہ داشتم۔'' 1

وہ زمانہ تھا جب معاشرے میں پردہ کا رواج زیادہ تھا خواتین اپنے کلام میں بھی اس کا خیال رکھتی تھیں اور معمولاً تذکیر کے صیغے استعمال کرتی تھیں تاکہ خاص و عام کے سامنے ان کی شخصیت بے نقاب نہ ہو جائے۔ اسی محتاط روش کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض وقت یہ بھی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کلام کسی شاعرہ کا ہے۔ اتنا ہی نہیں تخلص کے بارے میں بھی کبھی کبھی اشتباہ کی صورت پیدا ہو جاتی تھی اور یہ متعین کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ تخلص کس شاعرہ کا ہے۔ اقتباس بالا میں مصحفی نے اِسی دشواری کی طرف اشارہ کیا ہے۔

نازک

فیض آباد کے تعلق سے شاعرات میں سب سے اہم تخلص نازک کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے

بارے میں شیخ مصحفی نے لکھا ہے:

"نازک تخلص زینت نام در فیض آباد از میر مستحسن خلیق معلوم شدہ مشاز الیہ می گوید کہ ہر گاہ من ہمراہ لشکر رفتم بہ سبب الفتے کہ با من داشت ایں غزل نوشتہ فرستادہ بود۔ 2

کوچہ میں کوئی سسکے کوئی در پہ مرے ہے — انصاف بھی کچھ ہے، تو یہ کیا ظلم کرے ہے
موجود ہے ہر آن جو نزدیک ہمارے — وہ وہم و گماں سے بھی حقیقت میں پرے ہے
ہے نالہ وزاری کا مرے شور فلک تک — پر وہ بُتِ مغرور کوئی کان دھرے ہے
یاد آتی ہے ان آنکھوں میں آمد وہ نشہ کی — ساقی مے گلرنگ سے جب جام بھرے ہے
غش میں مجھے کل دیکھ کے وہ ڈر کے یہ بولا — بس ہوش میں آ کیوں مجھے بدنام کرے ہے
پیغامِ اجل چاہ ہے اس بت کی ولیکن — کب عاشق جاں باختہ مرنے سے ڈرے ہے
جاتے تمھیں تک دیکھا تو آنکھیں نہ نکالو — منظور ہمیں تو نظرے خوش گذرے ہے
محفل میں مجھے دیکھ کے کہنے لگا اپنی — جادے یہ بلا گھر سے مرے کوئی ارے ہے
اٹھا میں تو بولا کہ میں ہوں غیر کو کہتا — جل جل کے تو کچھ اپنی ہی غیرت میں مرے ہے

نازک سفرِ دور کو گویا وہ سدھارا
گرم طلب شوق کے نزدیک درے ہے

اپنی شخصیت ہی نہیں اپنے مدّعا کو بھی اس شاعرہ نے پوری طرح مستور رکھا ہے۔ مطلع سے آخری شعر تک سارے مطالب غزل کی روایت کے مطابق ہیں اور اگر خود خلیق نے حقیقت حال کا بیان نہ کر دیا ہوتا تو کسی کو اس کے پس منظر کا گماں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ شرم و حیا، غیرت و خودداری کی اس کیفیت کی داد صرف وہی دے سکتا ہے جو تمدّن و معاشرت کے اس اعلیٰ درجے کو پہنچ چکا ہے۔

ہر انسانی جماعت کے مخصوص تہذیبی آداب ہوتے ہیں اور یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ: کُلُّ حِزْبٍ بِمَالَدَیْهِمْ فَرِحُوْن بے شک بعض اقوام میں عورت اپنے محبوب مرد کے ساتھ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہے بلکہ کئی قدم آگے بھی جاتی ہے لیکن اس بے حجابی کا اردو کے معاشرے سے بھی تقاضا کرنا کیا ضروری ہے؟ افسوس ہے کہ اس شاعرہ کے بارے میں مزید کوئی معلومات حاصل نہیں

ہو سکی ہیں۔

دولھن بیگم:

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے دولھن بیگم کا ذکر تو کیا ہے لیکن ان کے بارے میں انھوں نے یہ لکھا ہے کہ:

''عائش بسانِ درویش در نقاب است۔''3

البتہ قطب الدین باطن نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''دولھن بیگم المعروف بہ نواب بہو، دختر نواب انتظام الدولہ اور زوجہ نواب آصف الدولہ والیِ اودھ۔''4

شیخ تصدق حسین نے دولھن بیگم کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

''نواب آصف الدولہ کی بیوی نواب شمس النسا بیگم نواب انتظام الدولہ خان خاناں کی بیٹی اور اعتماد الدولہ نواب قمر الدین خان وزیر اعظم (محمد شاہ بادشاہ) دہلی کی پوتی تھیں۔ 1181ھ (1767) کو نسبت قرار پائی اور 1183ھ کو شادی تزک واحتشام سے فیض آباد میں ہوئی۔ دولھن کو سسرال سے نواب بہو یا بقولے دولھن بیگم صاحبہ خطاب عطا ہوا۔ نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں وہ نواب سے رنجیدہ ہو کر الٰہ آباد چلی گئی تھیں۔ وہیں رحلت کی اور مدفون ہوئیں۔ غازی الدین حیدر نے اپنے وقت میں لاش کو وہاں سے منگا کر آصف الدولہ کی قبر کی بغل میں آصفی امام باڑہ میں دفن کرا دیا..... شمس النسا بیگم کو شعر وسخن سے بھی ذوق تھا۔ تخلص معلوم نہیں۔ صاحب دیوان بھی تھیں۔''5

حکیم فصیح الدین رنج نے ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''دلھن تخلص، دولھن بیگم نام، معروف بہ نواب بیگم و نواب بہو صبیہ انتظام الدولہ، محل نواب آصف الدولہ، سیرت اور صورت کے اوصاف کے سوا عروض میں دستگاہ کامل رکھتی تھی۔''6

درگا پرشاد نادر پر تعجب ہے کہ انھوں نے اپنے تذکرے میں یہ لکھ دیا ہے کہ:

''دولھن تخلص.....سراپا سخن کی تیاری کے وقت فیض آباد میں رونق افروز تھیں۔''ج

شیخ تصدق حسین نے بنی نرائن جہاں کے تذکرے آصف الدولہ کی ایک غزل اور اس کے جواب میں لکھی گئی دولھن کی غزل بھی نقل کی ہے۔ یہاں دولھن کی غزل کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

خوشی دل میں ہم اپنے کم دیکھتے ہیں　　اگر دیکھتے ہیں تو غم دیکھتے ہیں
تو آئے نہ آئے یہاں ہم تو ہر شب　　پڑے راہ تا صبح دم دیکھتے ہیں
کرم سے ترے شاد و خرم ہیں یہ سب　　مگر ایک ہم ہیں کہ غم دیکھتے ہیں
کہا ہے جو تم نے یہ اپنی غزل میں　　تماشا خدائی کا ہم دیکھتے ہیں
وہی دیکھتا ہے جو دیکھے ہے سب کچھ　　نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

دولھن کے چند متفرق اشعار یہ ہیں۔

جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں　　مثال لالہ کے دل داغدار رکھتے ہیں
بیاں میں کس سے کروں جا کے اب گلہ دل کا　　یہ دل کا دل ہی میں ہوویگا فیصلہ دل کا
بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا　　تری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا
اتنے کم ظرف نہیں ہیں جو بہکتے جاویں　　گل کی مانند جدھر جائیں مہکتے جاویں

یہ آخری مقطع خاص طور سے توجہ کے قابل ہے۔ دولھن بیگم ہوں یا دوسری شاعرات، جس معاشرے سے ان کا تعلق تھا اس میں پردہ اور حجاب کا پورا پورا اہتمام ہوتا تھا۔ خواتین تیز خوشبو کا بھی استعمال نہیں کرتی تھیں۔ جہاں عفت و ناموس کی محافظت کا اس حد تک چلن ہو وہاں مَردوں سے لگ لپٹ کر عشقیہ جذبات کے اظہار کا رواج کیوں کر ہو سکتا تھا؟

شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے تذکرے میں اور بھی چند شاعرات کے تخلص اور ان کا کلام درج کیا ہے لیکن ان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے اس لیے یہاں ان کا ذکر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے البتہ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس زمانے میں فیض آباد میں اور بھی بعض شاعرات رہی ہوں گی۔

مرثیہ

نواب آصف الدولہ کے عہد میں لکھنو میں امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کے دو بیٹے نامور ہوئے یعنی:

نواب اکبر علی خان اور نواب حسین علی خاں

ثانی الذکر شاعر بھی تھے اور شاعر نواز بھی۔ اثر تخلص کرتے تھے اور شیخ امام بخش ناسخ کے شروع زمانے کے ممتاز شاگردوں میں سے تھے۔ پہلے نے بھی شاعر نوازی کے لیے نام پایا تھا چنانچہ کئی شاعر اُن کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ چنانچہ مظہر علی خاں ولا اور غلام حسین مسرور وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل الذکر نے ایک نامۂ منظوم مثنوی کی ہیئت میں لکھا تھا اور مسرور نے ایک مذہبی مثنوی روضۃ الصالحین کے نام سے نظم کی تھی۔

اپنی ساری شان و شکوہ کے باوجود نواب اکبر علی اور نواب حسین علی اپنے والد ماجد کے درجے کو نہیں پہنچ سکے تھے البتہ اور باتوں کے علاوہ یہ دونوں شیعہ گری کے لیے بھی مشہور تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ نواب اکبر علی خاں بہو بیگم صاحبہ کی وفات کے بعد بھی فیض آباد میں رہ رہے تھے اور اپنے طور پر شاعروں اور مذہبی عالموں کی سرپرستی کرتے رہے تھے۔

فیض آباد میں اکبر علی خاں کی سرپرستی کے باوجود صنف مرثیہ کو بہت زیادہ فروغ حاصل نہیں

ہو سکا تھا۔ سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں انور تخلص کے ایک شاعر کے بارے میں لکھا ہے:

''سخنور بہتر علی مرزا، مرثیہ خوان، تخلص انور، ولد مرزا اکبر علی مرثیہ خواں، ساکن فیض آباد، وارد لکھنو، شاگرد رشک۔'' 1

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ فیض آباد میں اس زمانے میں مرثیہ خوانی کا چلن ہو چکا تھا اور بعض گھرانوں نے اس فن میں اختصاص بھی حاصل کر لیا تھا چنانچہ مرزا اکبر علی کے بعد ان کے بیٹے علی مرزا انور نے بھی مرثیہ خواں کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی تھی۔

ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ بہو بیگم صاحبہ کی سرکار میں بھی بعض ایسے لوگ ملازم تھے جو مرثیہ گو کی حیثیت سے معروف ہو چکے تھے چنانچہ سید محسن علی موسوی نے میر رشک کے بھتیجے تنویر کے حال میں لکھا ہے:

''میر کاظم حسین تنویر ولد میر حسین داروغۂ سرکار بہو بیگم صاحبہ والدۂ نواب آصف الدولہ بن میر اکبر علی مقبل مرثیہ گو، باشندۂ فیض آباد، مقیم لکھنو، شاگرد میر علی اوسط رشک۔'' 2

علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں ایک سے زائد ایسی بیاضیں موجود ہیں جن میں مقبل کے مرثیے درج ہیں۔

عبدالغفور خاں نساخ نے بھی اپنے تذکرے میں فیض آباد کے ایک مرثیہ گو کا ذکر کیا ہے، اس طرح:

''صبر تخلص میر محمد علی مرثیہ گو فیض آباد۔'' 3

لیکن اس کا کوئی مرثیہ دستیاب نہیں ہو سکا ہے۔

میر احسان مخلوق نے بھی مرثیہ اور سلام وغیرہ اصناف میں طبع آزمائی کی تھی۔ ان کا ایک سلام آگے آئے گا۔

نواب اکبر علی خاں وغیرہ کی سرپرستی میں جو شعری سرمایہ وجود میں آ رہا تھا، اس کا معیار کچھ بلند نہیں تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اس سے مقصود اصلی ثواب کا حصول تھا۔ زبان اور بیان وغیرہ کے مسائل و مباحث کی محض ضمنی حیثیت رہ گئی تھی۔ اس زمانے کے مرثیے مجلسوں میں پڑھی جانے والی وقتی چیزیں تھیں چنانچہ ان میں سے بیشتر سلام اور مرثیے وغیرہ امتدادِ زمانہ سے ضائع ہو گئے ہیں۔

مثنوی

نواب آصف الدولہ کے فیض آباد سے لکھنو میں منتقل ہو جانے کے بعد بھی اس شہر میں چھوٹی بڑی، مذہبی اور عشقیہ ایک دو مثنویاں لکھی گئی تھیں لیکن یہ سلسلہ زیادہ مدت تک جاری نہیں رہ سکا، البتہ اہلِ فیض آباد اپنے بزرگوں کی تصنیفوں کو سینے سے لگائے رہے اور اس زمانے میں ہر قسم کی بعض مثنویوں کی نقلیں تیار کی گئیں مثال کے طور پر میر غلام حسن کی مشہور مثنوی سحر البیان کے اس وقت کے کئی قلمی نسخوں کا تعارف مشفق خواجہ نے کرایا ہے۔[1] اسی طرح ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے کتب خانے میں دو مذہبی مثنویوں کے مخطوطے محفوظ ہیں۔ ان کے ترقیمے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

الف۔ ''روضۃ الصالحین از غلام حسن سرور..... ایں کتاب نواب میر مراد علی خان بہادر..... اگر کسے برایں کتاب نظر بد کند در قیامت کور باشد۔ ایں کتاب از دست حضرت دلاور علی صاحب (تمرّائی) قبلہ نوشتہ شد..... برائے من نوشتہ دادند۔''[2]

ایک دوسرے اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قلمی نسخہ کی کتابت شعبان 1252ھ (1836-37) میں مکمل ہوئی تھی۔

ب۔ اسی کاتب نے ایک اور مذہبی مثنوی کی بھی نقل تیار کی تھی چنانچہ اس کے خاتمہ کا

اندراج اس طرح ہے:

''اصول دین از فاضل خاں سُرور.....تمت ہذا الکتاب بہ دست احقر بن عباداللہ الصمد عبدالضعیف محیف شیخ دلاور علی بتاریخ سیوم شہر ربیع الثانی 1252ھ (1836)

تحریر یافت۔''[3]

اس قسم کے قلمی نسخوں سے یہ حقیقت بخوبی سامنے آجاتی ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں بھی صنف مثنوی کے ساتھ اہلِ فیض آباد کی دلچسپی قائم تھی۔ البتہ تصنیفی کاموں کے لیے اس وقت کا ماحول زیادہ سازگار نہیں تھا چنانچہ طویل نظمیں بہ گمانِ غالب کم تر لکھی گئی تھیں۔

بہو بیگم صاحبہ کی وفات کے بعد فیض آباد میں زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں انتشار کی صورت پیدا ہوگئی تھی چنانچہ اس زمانے کی اس شہر کی شاعری کو بھی غالباً ''سبزۂ خودرو'' کی قبیل سے خیال کرنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس میں رنگینی، جدّت، نازک خیالی اور نکتہ آفرینی وغیرہ کی صورت کم سے کم ہوتی تھی۔ بیشتر شاعر غزل کہتے تھے اور اسی پر فخر کرتے تھے۔ بعض نے طویل نظمیں یادگار چھوڑی ہیں لیکن ان کے مطالب عموماً طبع زاد نہیں ہیں۔ زیادہ تر نظمیں ترجمہ کی گئی ہیں۔ ایک قابلِ توجہ حقیقت یہ ہے کہ ہر قسم کے ادبار کے باوجود اس شہر کے عوام اور بعض عامی بھی فارسی زبان سے کم وبیش واقف تھے اور اردو میں شعر گوئی کا تھوڑا بہت مذاق بھی رکھتے تھے۔ ہندو بھی اس معاملے میں مستثنیٰ نہیں تھے۔

سعادت خاں ناصر نے ایک ہندو شاعر کا ذکر کیا ہے جس کا تخلص عازم تھا۔ اس زمانے کی روش کے مطابق وہ بھی غزل کہتا تھا۔ اس کی ایک غزل کا مقطع یہ ہے۔

کر قتل مجھ کو بول اٹھایوں پکار کے کیا خوش ہُوا ہے دل مرا عازم کو مار کے

پہلے مصرع میں کر بجائے کر کے، نظم کیا ہے اور یہ صورت اُس زمانے میں عام تھی۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس شاعر کے کلام میں صنعتوں کا استعمال ہوا ہے۔ دوسرے مصرعے میں لفظ 'مار' کے معنی بعید یعنی سانپ کی طرف بھی خیال جاتا ہے اور یہ صورت ایہام کی ہے۔ اسی طرح مرا کے ساتھ مار کا نظم کرنا اور بول اور پکار کو یکجا کرنا وغیرہ کا بھی معاملہ ہے۔

سعادت خاں ناصر نے اس عازم کے بارے میں لکھا ہے:

''عازم، قوم کایستھ، ساکن فیض آباد۔ مولف اس سے آگہی رکھتا ہے۔ کتاب بہار دانش کو اس نے ہندی میں نظم کیا تھا اور ان شعروں پر کہ حاکم کی حکایت میں ہیں ناز کرتا تھا۔

کسی نے جو یہ بات اس سے کہی ۔۔۔ تری شمع رو رات کو جل گئی
پگھلنے لگا سر کو پروانہ وار ۔۔۔ ہُوا مثلِ شعلہ بہت بے قرار [4]''

موقع اور محل کی مناسبت سے صنعتوں اور تشبیہوں وغیرہ کا نظم کر دینا ہی وہ وصف معلوم ہوتا ہے جس پر یہ شخص ناز کرتا رہا ہے۔ اس کی پوری مثنوی کا کہیں سراغ نہیں مل سکا اس لیے اس کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا ممکن نہیں ہے۔

بارہ ماسہ

پروفیسر گیان چین نے لکھا ہے کہ:

''اردو میں بارہ ماسے کو فروغ نہ ہو سکا کیونکہ یہاں عشق کی ابتدا عورت کی جانب سے نہیں ہوتی۔''[1]

اس ایک جملے میں دلیل اور مدلول دونوں غلط ہیں۔ اردو میں بارہ ماسے کی روایت نہایت قدیم، مسلسل اور غیر منقطع ہے۔ ابتدا میں یہ طویل مثنوی کے جز کی حیثیت رکھتا تھا چنانچہ مولانا داؤد کی چندائن اور میاں سادھن کی بیناست میں بارہ ماسہ موجود ہے۔ بعد میں شاعروں نے مکمل اور مستقل نظم کے طور پر بھی بارہ ماسہ لکھنے شروع کر دیے۔ افضل اور مقصود کی نظمیں اس کی مثال ہیں۔ اکرم رہتگی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور تیرہ ماسہ بھی لکھ ڈالا۔

یہ خیال محض غلط ہے کہ بارہ ماسہ میں عورت (عاشق) اپنے محبوب مرد سے اظہارِ عشق کرتی ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عورت (محبوب) سال کے بارہ مہینوں میں اپنے عاشق (مرد) کی جدائی یا غیر موجودگی میں اپنے اوپر گذرنے والی مختلف النوع پریشانیوں اور تکلیفوں کا بیان کرتی ہے۔ یہ بیان وہ کسی پیغامبر (پرند مثلاً کوا اور انسان مثلاً مسافر) سے کرتی ہے اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ وہ اس عاشق (مرد) کے پاس جا کر محبوب (عورت) اور اس کے گھر وغیرہ کی یاد دلا دے تا کہ

وہ واپس آجائے۔عورت کے اِس بیان کو اظہارِ عشق کہنا بیجا ہے۔

عشق کے بارے میں فارسی والوں کا کہنا یہ ہے کہ ع: عشق اول در دلِ معشوق پیدا می شود اور اردو والوں کا بھی دعویٰ یہی ہے کہ ؎

بن جلے شمع کے پروانہ نہیں جل سکتا کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نہ کرے

معلوم نہیں کہ گیان چند صاحب نے یہ بات کہاں سے سن لی کہ یہاں (اردو میں) عشق کی ابتدا عورت کی جانب سے نہیں ہوتی۔عشق ایک جذبہ ہے اور اظہارِ عشق ایک عمل ہے۔عشق کی خوبی یہ ہے کہ اس کا اظہار نہ ہو چنانچہ شیخ محمد ابراہیم ذوق نے کہا ہے ؎

پروانہ بھی تھا گرمِ تپش پر کھلا نہ راز بلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غل ہوا

فارسی اور اردو دونوں میں عورت کی جانب سے جذبات کے اظہار کو پسندیدہ نہیں مانا جاتا۔ کسی جماعت کی عورتیں اگر ایسا کرتی ہیں تو یہ ان کا فعل ہے۔فارسی اور اردو والوں میں پردہ اور حیا کے ساتھ عفت و ناموس کی حفاظت پر ہمیشہ زور دیا گیا ہے۔

ہر زمانے کے اپنے معاملات ہوتے ہیں اور ہر طبقے کا اپنا طرزِ فکر ہوتا ہے۔ایک زمانے میں نظیر اکبر آبادی کے کلام کی کما حقہ قدر نہیں کی گئی۔پھر اسے ''حقیقی ہندستانی شاعر''[2] کہا گیا۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ جب نظیر تو کیا اس کی زبان کو بھی دیس نکالا دینے کی کوشش کی گئی۔غالب کے لیے بھی ایک زمانے میں بہت کچھ کہا گیا۔پھر وہ ''غالب'' ہو گیا۔یہ معاملات نہ محض اتفاقی ہیں اور نہ استثنائی۔نشیب و فراز زمانے میں آتے ہی رہتے ہیں اس لیے کوئی حکم لگاتے وقت احتیاط سے کام لینا ضروری ہے۔

فیض آباد میں ایک غریب شاعر پیشہ کے اعتبار سے ''سقا'' تھا۔کہتے ہیں کہ بے علم بھی تھا۔ ایسے شخص کو صاحبانِ علم و فضل اور اہلِ اقتدار و ثروت بھلا کیا منہ لگاتے۔خود اس کا بھی منہ کہاں تھا کہ وہ اہلِ دول اور شرفا کی باوقار شعری محفلوں میں شرکت کا خیال بھی کرتا۔ہاں یہ ضرور ہوا ہوگا کہ وہ دور دور رہ کر کچھ کچھ دیکھ اور سن لیتا ہوگا۔

غریبی کے باوجود خدائے رحمٰن نے اسے موزوں طبیعت عطا کی تھی اور وہ طویل مربوط نظم لکھ لینے پر بھی قادر تھا۔وہ فارسی کے باکمال استادوں کے نام سے واقف تھا اور زبان کی بعض

ضرب الامثال بھی اس کی زبان پر جاری تھیں۔ اپنے پیشے کے تعلق سے اسے امرا اور شرفا کے گھروں کے اندر تک جانا پڑتا تھا شرافت کے تمام آداب سے وہ واقف تھا اور علم صحبت سے بخوبی بہرہ مند بھی تھا۔ وہ اپنے شوق سے کچھ کچھ کہہ لیتا تھا اور اپنے برابر والوں (طبقۂ اجلاف) کو سُنا کر خود اپنا اور اپنے دوستوں کا دل خوش کر لیتا تھا۔

اپنی ساری بے بضاعتی اور بے مائگی کے باوجود رفتہ رفتہ اس نے خوب نام پیدا کر لیا۔ اس کی شہرت دہلی تک پہنچ گئی اور جو بھی ہو اس کے کلام نے ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ اردو شاعروں کا اس زمانے کا شاید ہی کوئی تذکرہ ایسا ہوگا جو اس کے ذکر سے خالی ہو۔ یہ ایسی بات نہیں ہے جس سے سرسری گزر جایا جا سکے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی اس زمانے کے مسلّم الثبوت استاد تھے۔ انھوں نے اپنے تذکرے میں اس غریب شاعر کا ذکر اِس طرح کیا ہے:

''مقصود سقّا شاعر بازاریست۔ باوصف بے علمی بجائیکہ طبعش موزوں ورواں است۔ ہیچ صفحے ندارد دگاہے درمجلسِ شعرا قدم نہ می گذارد۔ اطفال اجلاف بہ حلقۂ شاگردیش درآمدہ کلام واہیش را در ہنگامہ ہا وسیلہ ہا می خوانند، خصوصاً درایام ہولی۔ دوشعرش برمثالے کہ جفت لعل از سنگریزہ ہا برآید، بہ نظر ایں مبتدر سید آں لیست۔

عشق کیا جانے کدھر تھا مجھے معلوم نہ تھا　　عشق کا دل ہی میں گھر تھا مجھے معلوم نہ تھا

بوسہ لینے سے خفا ہوتے ہو کیوں مشفق من　　بوسہ وہ چیز ہے دونوں کو مزا ملتا ہے'' 3

ان دونوں شعروں کی زبان صاف ستھری اور بامحاورہ ہے۔ بیان میں بھی شائستگی کا وصف موجود ہے۔ دونوں شعروں میں ضرب المثل بن جانے کی لیاقت بھی موجود ہے۔

میلوں ٹھیلوں اور ہولی وغیرہ تہواروں کے معاملات کو ان کی اصل ہنگامی صورت میں نظم کر کے یہ شخص ہندوستان کی اکثریت کی روایتوں عملوں اور افکار کو تحریری صورت میں محفوظ کر دینے کا کام کر رہا تھا اور یہ وہ کام تھا جس کی طرف دوسروں کو توجہ نہیں ہو سکی تھی۔ مقصود نے ''اطفالِ اجلاف'' میں سے جن کو اپنے کام میں شریک کیا تھا ان کے نام اور کام کا مذکور نہیں مل سکا۔ وہ زمانہ غزل گوئی کا تھا مقصود نے بھی خود کو روشناس کرانے کے لیے غزلیں کہی تھیں۔ ظاہراً اس کے شاگردوں نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔ مقصود کا کلام بے شک بہت اعلیٰ معیار کا نہیں تھا لیکن وہ ایسا بھی نہیں تھا کہ

اسے یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرے میں اس شاعر کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''مقصود تخلص از سوقیانِ لکھنو است خراقاتش نہ سزائے است کہ دریں اوراق مذکور گردد لہذا چوں نوشتہ اند نوشتہ شد۔''4

یعنی نواب صاحب لکھنا نہیں چاہتے لیکن ناچار لکھنا پڑ رہا ہے۔ قطب الدین باطن نے اس پر اس طرح تبصرہ کیا ہے:

''جو شخص ان کے نزدیک کمال ناقص ہے پھر اس کا ذکر لکھنا اور اس کے ضمن میں موی الیہ کو بُرا بھلا کہنا محض بیجا بلکہ عقل سلیم تو ہرگز قبول نہ کرے..... دریا کی خس و خاشاک سے گوہر کی دست ناپاک سے آبرو نہیں جاتی۔''5

باطن سے بھی پہلے حکیم قدرت اللہ قاسم ایسے تذکرہ نویس ہیں جنھوں نے ہمدردی کے ساتھ مقصود کے کلام پر نظر کی ہے اور اس کی حوصلہ مندی کا صاف لفظوں میں ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مقصود تخلص سقائے است در بلدۂ لکھنو، شیریں کلام محمد مقصود نام، وے بادنیے کہ عامی است بنا بر مناسبت طبع در جرگۂ اطفالِ عامیاں علمِ استادی برافراختہ، کوسِ سلطان الشعرائی نواختہ۔''6

مقصود جیسا کہ مصحفی اور سعادت خاں ناصر کی تحریروں سے ظاہر ہے فیض آباد کا رہنے والا تھا۔ دہلوی تذکرہ نویسوں نے غلطی سے اسے لکھنو کا لکھ دیا ہے فیض آباد میں اس غریب کو خطاب دینے والا کون تھا۔ اسے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا اس لیے اس نے خود اپنے آپ کو ''سلطان الشعرا'' بنالیا تھا اور خود کو اس درجے تک پہنچالیا تھا کہ وہ اپنے حلقے میں استاد تسلیم کیا جاتا تھا۔

مقصود کا تقریباً سارا ہی کلام ضائع ہو گیا ہے۔ کئی سال ہوئے محبی مہر الٰہی صاحب نے راقم کو ایک قلمی بیاض عنایت کی تھی جس میں اس کی ایک طویل نظم ''بارہ ماسہ'' مندرج ہے۔ نظم پر کاتب نے کوئی عنوان قائم نہیں کیا ہے۔ عنوان کی جگہ بس اتنا لکھا ہے ''ہواللہ''

اور نظم ان شعروں سے شروع کی ہے۔

نئے مضمون کا دل جتلا ہے سخن میرا عجائب چٹکلا ہے

کہا مقصود نے میں نہیں حضوری　　نہیں میں انوری ہوں، نے ظہوری
نہیں جامی نہ ہی میں ہوں نظامی　　نہیں لائی، نہ ہی میں ہوں حسامی
نہ خاقانی، نہ عُرفی نے ہلالی　　نہ صائب ہوں، نہ طغرائے ذولالی
نہ سعدی ہوں، نہ میں حافظ دیوانا　　نہ شوکت ہوں نہ فطرت ہوں نہ دانا
نہ خسرو ہوں، نہ میں ناصر علی ہوں　　نہ ذوقی ہوں، نہ میں ہمدِ ولی ہوں
کہاں میں اور کہاں وہ شیرِ بیباک
چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

اس منکسرانہ تمہید پر نظر کریں تو پہلا تاثر ذہن پر جو مرتب ہوتا ہے یہ ہے کہ اس شاعر پر بے علمی کا الزام بہ گمان غالب غلط ہے۔ وہ نہ صرف موزوں طبع ہے نہ صرف فارسی کے متعدد اساتذہ سے واقف ہے۔ بلکہ اس کی زبان پر فارسی کی بعض ضرب الامثال بھی جاری ہیں چنانچہ آخری شعر میں بھی ہے۔ وہ اپنے کلام میں فارسی کی ترکیبیں بے تکلف اور برمحل صَرف کرتا ہے۔

مقصود سے اس کے کسی دوست نے بارہ ماسہ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ اس نے ازراہِ انکساری انکار کیا۔ اس دوست نے سارے دوستوں کو جمع کرلیا اور سب نے اس سے اسی خواہش کا اظہار کیا۔

کہا ہر چند میں، اس نے نہ مانا　　نہ مانا ایک سے، تھا یک سیانا
مرے خواہاں ہوئے وہ یار سب مل　　فکر پیدا ہوئی اس وقت دردل

شاعر نے 'فکر' ساکن الاوسط کو فکر بہ فتحۂ ثانی بروزن ہِند نظم کیا ہے۔ تلفظ میں اس قسم کے تصرفات کی مثالیں کسی قدر بعد میں بعض معروف غزل گویوں کے یہاں بھی مل سکتی ہیں مثلاً غالب کا مطلع۔

اک روز کا رونا ہوتو روکر صبر آئے　　ہر روز کے رونے کو کہاں سے جگر آئے

بالآخر مقصود نے اپنے دوستوں کی بات مان لی اور نظم کی ابتدا اس طرح کی۔

کہا میں نے بسم اللہ سنیے　　سخن کہتا ہوں خاطر خواہ سنیے
اِدھر تھا میں، اُدھر ناگاہ بھولا　　میں اس پارہ کو لے کے راہ بھولا
سنو یارو سناتا ہوں کہانی
غم پیو سے ہے یک برہن دوانی

اسی آخری شعر کی روشنی میں راقم نے اس بارہ ماسہ کا نام ''برہن کی کہانی'' مقرر کیا ہے۔ اس نظم کی زبان پر غور کریں تو وہ صاف صاف پورب کے علاقے کے عوام کی بولی ہے۔ وہی لفظوں کا تلفظ ہے، وہی لب ولہجہ اور وہی محاورہ ہے مثلاً۔

نگر کا لوگ باآرام سوئے　　یہ کہہ کر برہنی راتوں کو روئے
دئی نے عشق یہ کیسا بنایا　　کہ جس کے درد کا درماں نہ پایا

اس بارہ ماسے میں جس مصرع سے پہلے مہینے کی کیفیت کا بیان شروع ہوتا ہے اس کے اوپر کاتب نے سرخ روشنائی سے خط کھینچ دیا ہے۔ اس کے بعد ہر مہینہ سے متعلق پہلے شعر کو سرخ روشنائی سے لکھنے کا التزام کیا ہے۔ چنانچہ بارہوں مہینوں کے ابتدائی شعر یہ ہیں۔

لگا آساڑھ سکھیو ماس پہلا　　پیا پردیس، جی جاتا ہے دہلا
چڑھا ساون لگی اُڑنے پھنیری　　نہ آئے کنتھ اجھوں اے سکھی ری
محبوب ابھی تک
لگا یہ ماس اب بھادوں کا بھاری　　گھٹا چھوں اور جھک آئی ہیں کاری
چاروں طرف　　کالی
سکھی افسوس اب یہ کُوار آیا　　پیا اجھوں نہ گھر کے دوار آیا
ابھی تک　　دروازہ
لگا کاتک پہل رُت سردی آئی　　بناویں لوگ سب توشک رضائی
سکھی ری آج لاگا ماس اگہن　　بَہُر آئے نہ بالم میرے آنگن
مہینہ　　واپس
لگا یہ پوس دکھ دینے گھنیرا　　کیا اجھوں نہ بالم آئے پھیرا
شدید　　آکر
لگا اب ماگھ تل تل زور باڑھا　　ہُوا اب دن بہ دن دکھ مجھ کو گاڑھا
تھوڑا تھوڑا　　بڑھا
لگا پھاگن، مچی ہولی درعالم　　ہزار افسوس، ہے پردیس بالم

لگا اب چیت، جی پی میں بسنت ہے پیا میں جی، پیا جی میں بسنت ہے
محبوب دل بستا ہے

لگا بیساکھ بالم گھر نہ آئے قدم بالم کے پھر در پر نہ آئے
آقا

لگا اب جیٹھ دھرتی کو تپانے تپش اپنی سب عالم کو دکھانے
جلانے

برہ (فراق) کے یہ بارہ مہینے کسی نہ کسی طور پر گذر گئے۔ برہنی کا حال تباہ ہوگیا تو پیا اچانک گھر آگیا اور اس طرح جو خوشی حاصل ہوئی اس کے بیان پر اس نظم کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ آخری چند شعر یہ ہیں۔

ہوئی میں سوکھ کر غم سے چھوہارا کریجا میں نہیں پی بن سہارا
کلیجہ محبوب بغیر

اترتے جیٹھ درشن پی کا پایا دہی اور بھاتھ کاگا کو کھلایا
دیدار چاول کوا

بھوانی کالکا کو پوج آئی بدھائی پیو کے آنے کی بجائی
مبارکباد

ہوئی برہن کے دل کو شاد مانی
تو کر مقصود اب آخر کہانی

تمام شد

پورب دیس کے لوگوں کے شگونوں، عورتوں کے ریت رواجوں، ہندوؤں کی دیوی، دیوتاؤں کی پوجاؤں وغیرہ کا شاعر نے برمحل بیان کیا ہے۔ ہر مہینہ کی موسمی کیفیات کے ساتھ رہائش و آسائش، پوشش اور آرائش میں ہونے والی بتدریج تبدیلیوں کا تذکرہ شاعر کی خوبیِ مشاہدہ اور قوتِ امتیاز کا مظہر ہے۔ جملۂ معترضہ کے طور پر یہاں ایک دلچسپ نکتے کی طرف اشارہ کر دینا بھی مناسب ہے۔ فیض آباد کا قدیمی نام بنگلہ ہے اور بنگلے سے مراد:

''مکان مربع کہ از سفالہ خواہ از کاہ پوشند۔''7

اور مقصود نے اپنی اس نظم میں طرح طرح سے اس کا ذکر کیا ہے۔ ایک شعر یہ ہے۔

پیا بن چھاؤں گھر کی کو بناوے کون اب راوٹی بنگلا چھواوے

کون بالاخانہ

اردو شاعری کی پہلی دستیاب تصنیف چندائن سے بارہ ماسے کی روایت کے تسلسل کو قائم رکھنے والوں میں مقصود کا نام بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس شخص کی یہ نظم اس سلسلے کی ایک کامیاب کڑی ہے۔

ریختی

بہو بیگم صاحبہ کی وفات کے بعد فیض آباد میں شعر و سخن کی فضا میں نمایاں تبدیلی ہو گئی تھی۔ عوامی شاعری کے فروغ کے ساتھ ساتھ یہاں خواتین کی زبان میں ان کے معمولات اور معاملات کے بیان کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اصطلاح میں اسے ''ریختی'' کہتے تھے۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے ایک شاگرد جس کا تخلص مخلوق تھا، کے تعارف میں لکھا ہے:

''سید احسان حسن مخلوق تخلص خلف میر حسن مرحوم، جوانِ شائستہ و باصلاحیت است۔ چوں بہ حکم موزونیِ طبع کہ ارثِ خاندانِ اوست، از ایام ابتدائے شباب چیزے فکر کردہ۔ کلام خود را بہ برادر کلانِ خود نمودہ و معہذا فکرِ مرثیہ و سلام ہم کردہ میکند، از چند سال کہ از فیض آباد بہ لکھنؤ رسیدہ رجوع مشورہ گاہ گاہے بہ فقیر ہم آوردہ تا امروز عمرش سی سالہ خواہد بود و مادرائے شاعری در فنِ افسانہ گوئی ہم رونقِ تمام پیدا کردہ۔''[1]

سعادت خاں ناصر اگرچہ بعد کا تذکرہ نویس ہے بظاہر اس نے ان کے جو حالات لکھے ہیں وہ پہلے کے ہیں اس نے مصحفی سے تلمذ کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا ہے۔ اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

''شاعرِ شیریں بیاں سید احسان علی تخلص مخلوق پسر میر حسن مرحوم ریختی گوئی اور کہانی کے کہنے میں مشہور اور معروف اور اصلاح سخن کی برادر بزرگ پر موقوف۔''[2]

اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے کہ مصحفی سے تلمذ اختیار کر لینے کے بعد مخلوق نے غزل کے بجائے ریختی کہنی شروع کر دی تھی۔ ظاہراً انھوں نے ریختی گوئی فیض آباد میں قیام کے زمانے میں ہی شروع کر دی تھی۔ لکھنو پہنچ کر مصحفی کے شاگرد کی حیثیت سے وہ بہ گمانِ غالب غزلیں کہنے لگے تھے۔ ناصر نے ریختی کے ان کے جو شعر نقل کیے ہیں ان میں سے کچھ یہ ہیں ۔

اب دوا دیکھیو ہوویگا بڑا شر پیدا　　لو زناخی نے کیا اور نیا گھر پیدا
کچھ زناخی مجھے ملال ہوا　　کیا ترے دشمنوں کا حال ہوا
مَردوں کو ترس رنڈیوں پر کیوں نہیں ہوتا　　میں مرگئی کمبخت کتر کیوں نہیں ہوتا
ٹھونکے گا کہاں تک اسے، گھڑیال نہیں ہے　　بجتے ہیں ارے تین پہر کیوں نہیں ہوتا

میاں مخلوق نے ریختی کو بھی حصول ثواب کا ذریعہ بنالیا تھا چنانچہ ناصر کے تذکرے میں ان کا ایک سلام اس طرح منقول ہے:

''سلام در زبان ریختی۔ میاں مخلوق صاحب''

مجریٰ ہوتی جو میں حضرت شبیر کے ساتھ　　دیکھتے کرتی جو میں فرقۂ بے پیر کے ساتھ
پہلے تو حرملہ کی ناک میں میں دیتی تیر　　ناک چھدواتی موے کی میں اسی تیر کے ساتھ
زہر دلوا کے بُوا جس نے حَسَن کو مارا　　میں بھی دیتی اُسے ہیرے کی کنی کھیر کے ساتھ
حاکم شام کی جورو کو خصم کرواتی
.....لڑتی عمرِ سعد کی ہمشیر کے ساتھ

آسی نے اپنے تذکرے میں ان کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ:

''تذکرہ خوش معرکہ میں جو پٹنہ لائبریری میں محفوظ اور موجود ہے ان کا نام میر احسان علی ہے اور لکھا ہے کہ مخلوق نواب تقی خاں ترقی کے یہاں قصہ گوئی کی خدمت پر مامور تھے۔''3

اتنی بات صحیح ہے کہ مصحفی نے جوان کے استاد تھے ان کا نام احسان حسن لکھا ہے اور وہی لائق ترجیح ہے۔ مخلوق کی قصہ گوئی کا مذکور تذکروں میں آیا ہے لیکن اس بارے میں تفصیلات کا علم نہیں ہے۔

نثر

وہ زمانہ تھا جب شمالی ہند میں ہر طرف شعروشاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ نثر نویسی کو دوسرے درجے کا کام خیال کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل فیض آباد میں سے جن بعض لوگوں نے نثر لکھی تھی تذکرہ نویسوں نے ان کا حال محض ضمناً لکھ دیا ہے۔ مولوی کریم الدین پانی پتی کے تذکرے میں احمد علی نامی ایک شخص کا حال اس طرح مندرج ہے:

''احمد علی، ساکن فیض آباد، ایک قصہ گل وصنوبر کا بہ حکم بادشاہ اودھ مرحوم نظم کیا ہے.....

اس احمد کی دو کتابیں نثر اردو میں اور بھی ہیں:

اول مور پنکھی دوسری رشک پری

یہ کتاب 1241ھ (1827-28) میں فیض آباد میں تیار ہوئی'' 1

ڈاکٹر اسپرنگر نے بھی اس شاعر کی تصنیفوں کا ذکر کیا ہے، اس طرح:

''سید احمد علی احمد، ساکن سرادہ، نہایت تعلیم یافتہ، ہوشیار شخص تھے۔ گل ودمن اور زلیخا کا ترجمہ ریختہ کی نظم میں کیا..... غالباً یہ وہی ہیں جنھوں نے گل وصنوبر اور دو ہندوستانی کتابیں مور پنکھی اور رشک پری لکھی ہیں جن کا ذکر گارساں دی تیسی نے کیا ہے۔ یہ دونوں نظمیں 1241ھ میں لکھی گئی تھیں۔'' 2

احمد سرادی کی مثنوی نل ودمن کو جو 1240ھ (1824-25) کی تصنیف ہے ڈاکٹر سید عبداللہ نے مرتب کر کے شائع کر دیا تھا اور اس طرح احمد سرادی کا شمار اردو کے معروف مثنوی لکھنے والوں میں ہو گیا تھا۔ ان کی باقی تصانیف ہنوز غیر معروف ہیں۔ اگر چہ اسپرنگر نے مور پنکھی اور رشک پری کو نظم کہا ہے، مولوی کریم الدین کا بیان قابلِ ترجیح ہے لیکن جب تک یہ تحریریں دستیاب نہ ہو جائیں ان کے بارے میں کوئی حکم لگانا مناسب نہیں ہے۔

حواشی

(الف)غزل

1۔بیگمات شاہان اودھ ص21
2۔تواریخ نادرالعصر ص61
3۔تاریخ آصفی ص36
4۔گذشتہ لکھنو ص20
5۔بیگمات شاہان اودھ ص22،25
6۔ایضاً ص25
7۔ریاض الفصحا ص34
8۔سراپا سخن ص88
9۔مجموعہ نغز حصہ 1 ص138
10۔ریاض الفصحا ص54
11۔سراپا سخن ص215
12۔تذکرہ ہندی ص117
13۔ریاض الفصحا ص42تا43
14۔ابن طوفاں ص5
15۔ریاض الفصحا ص4
16۔ایضاً ص353
17۔تذکرہ ہندی ص100
20۔خوش معرکہ ج1 ص90تا91
21۔آب حیات ص371
22۔مجموعہ نغز حصہ 1 ص236
23۔تذکرہ ہندی ص89
24۔گلشن بے خار ص66
25۔سخانہ جاوید ج3 ص30
26۔خوش معرکہ ج1 ص47
27۔خوش معرکہ ج1 ص399
28۔سراپا سخن ص259
29۔تذکرہ سرور ص771
30۔مجموعہ نغز حصہ 2 ص259
31۔گلشن بے خار ص221
32۔خوش معرکہ ج2 ص309تا310
33۔سخانہ ج3 ص518
34۔گلدستہ عشق ص168
35۔گلشن بے خار ص234
36۔گلشن بے خار ص234

18۔مجموعہ نغز حصہ 1 ص236

19۔تذکرہ ہندی ص100

(ب)شاعرات

1۔تذکرۂ ہندی ص279

2۔ایضاً ص280تا281

3۔گلشن بے خار ص73

4۔گلستان بے خزاں ص85

5۔بیگمات اودھ ص39تا47

6۔بہارستان ناز ص141

7۔چمن انداز ص91

(ج) مرثیہ

1۔خوش معرکہ زیبا جلد2 ص363

2۔سراپا سخن ص60

3۔سخن شعرا ص278

(د)مثنوی

1۔جائزۂ مخطوطات اردو ص815تا828

2۔تذکرۂ مخطوطات ادارۂ ادبیات جلد3 ص142تا144

3۔ایضاً جلد3 ص144تا146

4۔خوش معرکہ زیبا جلد2 ص544تا545

(ہ)بارہ ماسہ

1۔شمالی ہند میں اردو مثنوی ص158

2۔تاریخ ادب اردو حصہ نظم ص292

3۔تذکرۂ ہندی ص229

4۔گلشن بے خار ص187

5۔گلستانِ بے خزاں ص230

6۔مجموعۂ نغز حصہ 2 ص209

7۔نفس اللغہ ص73

(و)ریختی

1-ریاض الفصحا ص307

2-خوش معرکہ زیبا جلد 1 ص:401

3-خندۂ گل ص:395

(ز)نثر

1۔طبقات شعرائے ہند ص285

2۔یادگار شعرا ص20

(2) کانپور

الف کانپور کی آبادی 53

(ب) شاعری (غزل)

1- مہر-امین الدولہ 66

2- ناسخ-شیخ امام بخش 74

3- سید-نظام الدولہ 78

4- رشکؔ-میر علی اوسط 81

(ج) مثنوی 85

1- خرم-مولوی خرم علی 85

2- رشک-میری علی اوسط 86

(د) ہزل وریختی 87

1- رشک میر علی اوسط 87

2- لاعلم ——— 88

3- فرد-مولوی وحید الدین خاں 88

(ہ)داستان 91

1- سرور-مرزا رجب علی بیگ 91

2- یوسف-نواب امجد علی خاں 94

(و)مذہبی نثر 95

1- مولوی خرم علی 95

2- کشفی مولوی سلامت اللہ 100

3- عباس علی فاروقی 101

(ز)مطبعے 104

حواشی 105

کانپور کی آبادی

غلام قادر روہیلہ کے فتنے کے بعد جب شاہ عالم ثانی بادشاہ نے اپنی بیچارگی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ

آصف الدولہ وانگریز کہ دستور من اند چہ عجب گر بنمایند مددگاریٔ ما

تو عملاً حضرت دہلی تک انگریزوں کا عمل دخل شروع ہوگیا تھا، پھر 1803 میں سندھیا نے گنگا اور جمنا کے درمیان کا ملک انگریزوں کے حوالے کردیا تو گویا دہلی تک میں ان کی عملداری قائم ہوگئی تھی، چند سال کے اندر ہی باجی راؤ پیشوا نے سرکاری خزانے سے آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ پنشن منظور کر کے بٹھور کا علاقہ انگریزوں کی تحویل میں دے دیا، یہ مقام ہندوؤں کے لیے بڑی مذہبی حیثیت رکھتا تھا، پھر گنگا کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے سیاسی اور تجارتی نقطۂ نظر سے بھی اسے اہمیت حاصل تھی، میر رشک نے اس کے محل وقوع کا بیان اس طرح کیا ہے۔

گھاٹ ہے گنگا کے گھاٹوں میں بٹھور جانب مغرب، قریب کانپور

''بٹھور نام معبد ہنود بود کنار گنگ جانب مغرب متصل کانپور''۔1

بٹھور پر قبضہ حاصل ہو جانے کے بعد تو انگریزوں کے لیے ایک بڑی چھاؤنی قائم کر لینے کی صورت پیدا ہوگئی تھی اور کانپور ان کے بڑے کنپو (کیمپ) کی حیثیت سے معروف ہوگیا تھا۔

کانپور کی اس علاقے میں مرکزی حیثیت تھی۔ یہاں رہ کر وہ ممالک آگرہ واودھ میں ہر طرف بخوبی نظر رکھ سکتے تھے۔ اسی مرکز سے فائدہ اٹھا کر جلدی ہی غازی الدین حیدر کو بادشاہت کا خطاب دے کر انگریزوں نے عملاً ملک اودھ پر بھی قبضہ کر لیا تھا:

شروع زمانے میں کانپور کے کئی نام سامنے آتے ہیں، اس طرح:

کمپ، کنپو، کنپور، کانہہ پور، اور کانپور

دلچسپ بات یہ ہے کہ آج بھی کانپور کے ریلوے اسٹیشن پر پورب سے آنے والے مسافروں سے پوچھو تو کہیں گے: ''یہ کانہے پور ہے''۔2

معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں کانپور کی اصلی آبادی اُس طرف تھی جہاں اب جاج مئو ہے چنانچہ ریلوے اسٹیشن کا رخ اب بھی اسی طرف ہے، دوسری طرف جہاں اب کانپور آباد ہے غالباً اس زمانے میں توجہ نہیں تھی۔ خود انگریزوں نے اپنی فوجی چھاؤنیاں شہری آبادی سے دور جو ہی وغیرہ کے علاقے میں رکھی تھیں، شہر کانپور پوری طرح بے رونق اور غیر آباد تھا، رجب علی بیگ سرور نے صحیح لکھا ہے کہ:

> ''ربیع الثانی کے مہینے میں کہ سن ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بارہ سو چالیس تھے، آنے کا اتفاق مجبور کو وردہ کانپور میں ہوا، بسکہ یہ بستی پوچ ولچر ہے، اشراف یہاں عنقا صفت ناپیدا ہیں، احیاناً جو ہوں گے تو گوشہ نشیں عزلت گزیں مگر چھوٹی اُمت کی بڑی کثرت دیکھی''۔3

اور:

> ''کانپور کی برسات بیہات بیہات دخل کیا، دروازہ سے باہر قدم دھرے اور پھسل نہ پڑے، گلی میں پاؤں رکھا کیچڑ کا چپکا سر پر پہنچا، دو اس فصل میں باہم نہ دیکھے مگر چلے کے پھنسے، اور جنھیں سواری کا مقدور نہیں، دخل کیا کہ وہ جائیں کہیں، ان کے حق میں برسات حوالات، گھر جیل خانہ، نہ کہیں جانا نہ آنا، اگر خواب میں کہیں نکل گئے تو چونک پڑے، کہ پھسل گئے، اور جو بازاری کاروباری ہیں ان کا یہ نقشہ دیکھا، ہاتھ میں جوتیاں، پائنچا چڑھا، کیچڑ میں لت پت، یہاں گرے وہاں گرے، خدا خدا کر جیتے گھر

پھرے، اور جو شیخی کے مارے ننگے پاؤں نہ نکلے تو .....شعر

دیکھی یہ رسم اس نگر میں جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں "

سرور کا یہ قول بھی بالکل صحیح ہے کہ اس شہر میں چھوٹی اُمت کی بڑی کثرت دیکھی، واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو لکھنؤ سے شہر بدر کیا جاتا تھا، وہ یہاں آ کر بس جاتے تھے، ان میں زیادہ چور اُچکے ہوتے تھے، میر رشک نے ایک غزل میں کہا ہے۔

سینے سے دل چرا کے چراتے نہیں نظر یہ بُت بھی کانپور کے چوروں سے کم نہیں

وہاں جو انگریز رہتے تھے ان کے بارے میں میر رشک نے کہا ہے کہ۔

یارب یہ گورے ہیں کہ فرشتے عذاب کے بنگلے بھی کانپور کے گوروں سے کم نہیں

ایسے ماحول میں اشراف کے پاس "گوشہ نشیں عزلت گزیں" رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، سرور نے صرف ایک شخص کا نام لیا ہے اس طرح:

"بشریت عنایت مجون شفقت ارسطو فطرت بقراط حکمت حکیم سید اسد علی صاحب، شیر بیشۂ علم و کمال، تخن فہم و ظریف، خوش خصال، حال فقیر دلگیر، پر الطاف و کرم فرماتے تھے"۔5

دنیا کے بسانے والے نے کانپور کو آباد کرنے کے لیے عجیب صورت پیدا کی۔ لکھنؤ کے بادشاہ دوم نصیر الدین حیدر نواب معتمد الدولہ سے ناراض ہوئے۔ انھیں معزول کر کے قید کر دیا اور پھر بقول حکیم نجم الغنی خان:

"ریذیڈنٹ نے معتمد الدولہ سے بیس لاکھ روپے بادشاہ کو دلا کر اس بات پر رضامند کیا کہ وہ تمام نقد و جنس سمیت کانپور چلے جائیں، معتمد الدولہ اکتوبر 1831 (ربیع الثانی 1245ھ) میں کانپور میں اقامت گزیں ہوئے"۔6

معتمد الدولہ کے پوتے نواب سید علی خاں بہادر کی بیاض میں لکھا ہے:

"تاریخ ورود نواب مغفور جدّ امجد م بہ کانپور از لکھنؤ بست و ہفتم 27 ربیع الثانی 1245ھ/ 17 اکتوبر 1829 بروز جمعہ"۔

ہجری تاریخ میں کسی وجہ سے سہو ہو گیا ہے، وہ بھی 17 ہے نہ کہ 27، منشی درگا ہی لال کا بیان 5

ہے کہ وہ کانپور آ کر ''موضع جوہی کے میدان میں متصل کوٹھی صبادا کے'' مقیم ہوئے۔ 7 معتمد الدولہ کو جس جگہ ٹھہرایا گیا تھا ظاہر اجوہی کے میدان میں وہی سب سے اچھی جگہ رہی ہوگی، ہمارے اس قیاس کو اس واقعہ سے تقویت حاصل ہوتی ہے کہ ڈیڑھ برس بعد جب خود نصیر الدین حیدر بادشاہ گورنر جنرل سے ملاقات کے لیے کانپور آئے تھے تو دونوں اسی مقام پر ملے تھے۔ اس سے اندازہ کیا جانا چاہیے کہ معزول ہو جانے کے باوجود انگریزی سرکار میں معتمد الدولہ کا وقار بدستور تھا۔ اس اعزاز واحترام کے باوجود لکھنؤ کے نازک مزاج نفیس طبع رئیس زادوں کے دل ودماغ پر انگریز فوجیوں کے درمیان جو گذر گئی ہوگی اس کا قیاس کرنا بھی اب آسان نہیں ہے۔

نواب کے ساتھ جو قافلہ لکھنؤ سے آیا تھا، اس میں ان کے بیٹوں عزیزوں اور مقربوں کے علاوہ ہر درجہ کے ملازمین بھی رہے ہوں گے۔ نواب سید حیدر علی خاں بہادر فرماتے تھے کہ جس وقت نواب لکھنؤ سے روانہ ہوئے تھے ان کا اسباب چالیس چھکڑوں پر لدا ہوا تھا۔ جلا وطنی اختیار کرنے والوں میں میر علی اوسط رشک بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے جوہی میں جو دیکھا اور محسوس کیا اس کا بیان ایک مربوط غزل میں کیا ہے ؎

کب آگے جانتے تھے ہے کدھر میدان جوہی کا
نظر آتا ہے اب آٹھوں پہر میدان جوہی کا

مزا ہے جب نکلیے خیمے سے وسعت دکھاتا ہے
اِدھر میدان جوہی کا اُدھر میدان جوہی کا

مکانات وفضا لکھنؤ کا دھیان رہتا ہے
ہُوا کنج لحد سے تنگ تر میدان جوہی کا

دکھایا ہم کو وہ وحشت فزا میدان سودے نے
جہاں کہتے ہیں وحشی الحذر میدان جوہی کا

سوا اس کے تکلف کون تھا مجنوں میں اے وحشت
کہ شور جنوں اپنا ہی گھر میدان جوہی کا

وطن میں بے تکلف سیر زلف دروے جاناں تھی
ہے پیش چشم اب شام وسحر میدان جوہی کا

خیال زلف شب گوں میں پھراتی ہے پریشانی
ترا آشفتہ ہے یارات بھر میدان جوہی کا

جلے تو بھی وطن سے بے وطن جیسا کیا ہم کو
جہنم اب ہے اے بے داد گر میدان جوہی کا

نماز استغاثہ بھی نہیں خضر رہِ مسکن
دعا ہے بے اثر یا بے اثر میدان جوہی کا

یہاں اے رشک دام ودد بھی آتے ہیں تو کہتے ہیں
کہ ہے جائے غم وخوف وخطر میدان جوہی کا

وہ فوجی چھاؤنی تھی۔ وہاں نواب زادوں کے قابل رہائش عمارتوں کا کیا کام تھا۔ خیموں میں

رہنا پڑ رہا تھا۔ رات میں جنگلی جانوروں کی آوازیں پورے ماحول کو ''جائے غم وخوف وخطر'' بنائے رہتی تھی۔ دشمنوں کو کوسنے سے بھلا کیا ہوسکتا تھا۔ کئی راتیں اسی ''جہنم'' میں گزارنی پڑیں۔ اس حال میں کئی غزلیں موزوں ہوگئیں، بعض اشعار یہ ہیں ؎

ہم اگر کوسیں تو ہو جائے وطن خاک سیاہ — کیا کریں خاطر یاران وطن کرتے ہیں
جسم خاکی میں مری روح بھی کرتی ہے — قفس تنگ میں جو مرغ چمن کرتے ہیں
دیکھنے آتے ہیں میرا تن پُر داغ اے رشک — لوگ جوہی میں تماشائے چمن کرتے ہیں
اتفاقی ہے جو بچ جائے کوئی لاکھوں میں — ملک الموت ہے میدان میں سفاک نہیں
کہنے کے واسطے ہیں آب وہوا آتش وخاک — غور سے دیکھیے انسان میں تو خاک نہیں
وحشت اس جوہی کے میدان میں لائی مجھ کو — کہ جہاں گرد کدورت کے سوا خاک نہیں
طالب دیں جو ہے اے رشک اسے دنیا میں — رنج خوف وخطر وبیم وغم وباک نہیں
سراپا داغ ہوں کس کو سر سیر گلستاں ہے — یہی میدان جوہی کا ہے یا حال پریشاں ہے
خیالات چراغان وطن سے شعلہ اٹھتے ہیں — نجوم چرخ سے عاشق ترا سرو چراغاں ہے
کہاں وہ مجلسیں وہ صورتیں، وہ لوگ، وہ میلے — فقط نظارہ بزم نجوم وماہ تاباں ہے
نہ وہ ساقی، نہ وہ مطرب، نہ وہ مرغان خوش الحاں — وفور خوک وکرگس ہے ہجوم اہل نجراں ہے
وہ خوش آواز دلبر، وہ مغنی یاد آتے ہیں — یہاں ہر روز غل، ہر شب صدائے پاسباناں ہے
شب فرقت کی آمد پا کہ آغوش لحد پھیلی — قضا کی مہربانی ہے، اجل سرگرم احساں ہے

مصیبت کے مارے ان خیموں میں کب تک آفتیں پیٹتے۔ رہائش کے باقاعدہ انتظام کی فکر بھی ضروری تھی، اس سلسلے میں چند سال پہلے کا مذکور ہے کہ:

> ''دسمبر 1885 (1241ھ) میں لارڈ ایم ہرست گورنر جنرل رونق افروز کانپور ہوئے،... غازی الدین حیدر بادشاہ اودھ کے دوسری مرتبہ تشریف لائے، بادشاہ کی ملاقات کوٹھی بخشی گراؤنڈ میں ہوئی''۔8

بہ گمان غالب معتمد الدولہ بھی اپنے بادشاہ کے ساتھ آئے ہوں گے اس کوٹھی کو دیکھا ہوگا اب اسی کوٹھی کا خیال آیا ہوگا، پرانی یادیں تازہ ہوگئی ہوں گی، چنانچہ اسی کو خرید لیا۔ یہ کوٹھی محلہ گوال

ٹولی میں ایک اونچے مقام پر تھی۔ اگر چہ یہ پہلے ہی عظیم الشان اور بادشاہ کے قیام کے لائق تھی معتمد الدولہ نے اسے اپنے مزاج اور ضرورت کے مطابق درست کرالیا۔ نوابی کے تمام اسباب جمع ہو گئے تو اس میں منتقل ہو گئے اور تاحیات اسی میں رہے۔ انگریز حکام کے قیام کی وجہ سے کانپور شہر کے اس حصے میں بجلی اور واٹر ورکس کا بھی انتظام کرلیا گیا تھا اور یہ وہ نعمتیں تھیں جن کا لکھنؤ اور دلی جیسے شہروں میں اُس زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

نواب کے متعلقین اور متوسلین نے بھی بتدریج اپنی رہائش کے لیے معقول انتظامات کر لیے، آبادی ہوئی تو ضرورت کے مطابق ادارے اور کارخانے بھی قائم ہونے لگے مثلاً میر رشک کی نفس اللغہ کے چند اقتباس یہ ہیں:

''اسکول، الف مفتوح، سین مہملہ ساکن، کاف بواو معروف ولام زدہ، خانہ خواندنِ اطفال نصاریٰ بود''۔

''بجلی: حکیماں چیزے از سیماب ساختہ اند و آں چناں است کہ چند ظروف شیشہ بود و یک زنجیر طولانی دارد، کسانیکہ زنجیر را در دست گیرند بہ سبب گردش آں آلات آں چناں صدمہ بانگشتاں رسد کہ بیفتند''۔

''پانی بنانا: صاف کردن آب از حکمت عملی، بنوع کہ کرم ہا در آب نماند و آن آب ہا ضم بود و در کوٹھی انگریز کنار گنگ در کانپور ساختہ می شود و بہ قیمت گراں می آید''۔

کانپور ملک نصاریٰ تھا۔ لکھنؤ کے رئیس زادوں کو انگریزوں کی ہر چیز نئی اور انوکھی لگتی تھی، رفتہ رفتہ اس شہر میں وہی فیشن میں آگئیں، ان کے کارخانے شروع ہو گئے اور اس طرح دیکھتے دیکھتے جدید مصنوعات کا ایک نیا شہر وجود میں آگیا۔ میر رشک نے ہر ضرورت کی چند چیزوں کا بیان اس طرح کیا ہے:

''آگن بوٹ: نادِ خانی باشد کہ از صنعت انگریزاں بہ زور دود در دریا رود و برائے راندناں آں حاجت مآں حاں نہ شود''۔

''الماری: صندوقی باشد استادہ، میان آں تختہ ہا بمثلِ خانہ در عرض نصب کنند و براں کتابہا و شیشہ ہا و مانند آں دارند و در و دیوار ہم تختہ ہا در عرض نصب کنند و دو پائے در ر

روئے آں نصب کردند واسباب دراں بند سازند"۔

"باراں کوٹ: جامۂ بود از گلیم سیاہ کہ مردمان فوج انگریزی در ایام سرما بر شکال پوشند از باراں محفوظ مانند و سرمانہ خورند"۔

"بارک: مکانات ماندن فوج انگریزی را گویند کہ طولانی بود و دریچہ ہا دارد و لغتِ انگریزیست"۔

"بجرا: بروزن صحرا ناوے باشد مصنوعی انگریزاں کہ کوتاہ از جہاز باشد و سقف و مکانات دارد و مرکب امیر انست"۔

" بسکٹ: نُرمے بود کہ آرد در آب تاڑیا آب در شتِ نُرما خمیر کردہ پُزند و ایں از غذاہائے انگریز انست و لغت انگریزیست"۔

"بکس: صندوقچہ وایں لغت انگریزیست"۔

"بوچر: فروشندۂ گوشتِ گاو باشد بقصاب"۔

"پاکٹ: کیسۂ باشد کہ پیش قباد وزندو ہر چہ داشتن بود دراں دارند، لغت انگریزیست"۔

انگریزی نظام اور معمولات کی اصطلاحیں بھی اس شہر میں عام ہو رہی تھیں، چنانچہ بعض یہ ہیں:

"آیا: بزبان انگریزی دایہ و پرورندۂ اطفال آنہا باشد"۔

"اپیل: مرافعۂ دوم بود کہ نالش حکم حاکم اوّل نزد حاکم دوم بہ ناراضی فیصلۂ اوّل کُنند"۔

"اپیلانٹ: مدعی مرافعۂ ثانی باشد و ہر دو لغت انگریزی ست"۔

"بٹ ٹرای: امتحان سنگ تُراز و بود ہر سال از حکم حاکماں کہ سنگ جنس فروشاں کم و زیادہ نہ شود"۔

"بڈاون: بہ حساب انگریزاں انتہائے درازی شب و ابتدائے درازی روز بود و آں بست و پنجم ماہ دسمبر یعنی ماہ دوازدہم سال انگریزیست و آں روز جشن می کنند"۔

''بیرنگ: نامۂ باشد درڈاک انگریزی کہ ہر کس کہ روانہ کند محصول آں نہ دہد بلکہ از کسے کہ نزد آں فرستادہ است بہ دہاند وعلامتِ آں آنست کہ مہر سیاہ انگریزی بر سرنامہ می شود چناں چہ بر خط و نامہ کہ محصولش دادہ روانہ سازند مہر سرخ انگریزی می شود، وایں لغت انگریزیست''۔

''پادری: عالم قوم نصاریٰ بود وایں لغت انگریزیست''۔

سرسری طور پر یہ محض چند الفاظ میر رشک کے ''نفس اللغہ'' سے نقل کیے گئے ہیں۔ ان سے اس شہر میں انگریزی معاشرت اور تہذیب و زبان کے اثرات اور نتیجہ کے طور پر شہر کی بول چال اور مصنوعات و مصروفیات کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اس شہر کی ترقیوں کا اندازہ اس واقعہ سے بھی کیا جانا چاہیے کہ جب واجد علی شاہ کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے تو بقول کمال الدین حیدر:

''بادشاہ کانپور میں مہمان نظام الدولہ (پسر دوم معتمد الدولہ) ہوئے، بعد دو تین دن کے سامان برسات درست کر کے الہ آباد کو چلے''۔9

زندگی کی آسائشوں کے جو جدید ترین سامان شہر کانپور میں دستیاب تھے۔ لکھنؤ اور دلّی والے ان میں سے بعض سے بالکل واقف نہیں تھے۔

میر علی اوسط رشک فیض آباد کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ کے نفیس اور پُر عیش ماحول میں بھی وہ اپنے شہر کو بھلا نہیں سکے تھے، کہتے تھے ؎

ہزاروں ہم وطن اے رشک آتے ہیں زیارت کو　　برسویں دن حسین آباد فیض آباد ہوتا ہے

شیخ ناسخ کے ساتھ اپنے روابط کے ذکر میں بھی ان کا کہنا تھا ؎

فیضِ ناسخ رشک میں کیوں کر نہ ہو　　کالبد ہے خاکِ فیض آباد کا

کانپور کی عشرتیں بھی لکھنؤ کی یادوں کو یک لخت بھلا نہیں سکتی تھیں۔ لکھنؤ اور کانپور کا قرب ہی شروع شروع میں دلوں کی تسکین کا سبب بنتا رہا چنانچہ ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

کم ہے پراگ میں، نہ سوا کانپور میں　　ہے سب جگہ مزا جو ملا کانپور میں
کیوں رہنے کی ہوس نہ ہو مجھ کو کنارِ گنگ　　آتی ہے لکھنؤ کی ہوا کانپور میں
دیوار خانۂ بُتِ ترسا ہے اور میں　　ہاتھ آگیا ہے ظلِّ ہما کانپور میں

اے کارساز خانہ کنپو خراب ہو　　جو آگیا خراب ہوا کانپور میں
کچھ اور وجہِ تسمیہ کانوں نہیں سُنی　　ارباب سمع بھر گئے کیا کانپور میں
عیسیٰ کے بھی علاج کا شہرہ نہیں سُنا　　اطفال ڈاکٹر کے سوا کانپور میں
اے رشک جزغبار پریشاں نہیں ہے خاک　　مٹی ہوئی خراب، رہا کانپور میں

غریب الوطنی اور دیس نکالا کا خیال آتا تھا تو کانپور کو کوسنے لگتے تھے۔ لیکن جب ''بتِ ترسا'' کی طرف نظر جاتی تھی تو وہی کانپور دلکش ہوجاتا تھا۔ کچھ دن یہ کشمکش کی صورت رہی، پھر تو یہ حال ہوگیا کہ یہاں سے لکھنؤ جانے کو بھی دل آسانی سے آمادہ نہیں ہوسکتا تھا، ایک غزل میں صاف کہتے ہیں۔

عیش ونشاط ولطف ومسرت کی حد نہیں　　نشے میں اے شراب ہمارا سرور دیکھ
اے رشک لکھنؤ کو نہ جا اور کچھ دنوں　　ترسائے رشکِ مہر ومہِ کانپور دیکھ

ان لکھنؤ والوں کو کانپور کی یہ فضا بار بار کھینچ کر لے آتی تھی۔ چنانچہ ذیل کے شعروں میں بھی یہ مذکور ہے۔

نشۂ مُل میں یہ باتیں تھیں کہ جاوداے خدا　　راگنی جو گائی اس مطرب نے ملتانی ہوئی
آئے پھر اے رشک کنپو میں ہَوا کھانے ہم آج　　پھر ہوائے اختلاطِ طفلِ نصرانی ہوئی

نواب معتمد الدولہ کے قیام کے وقت سے کانپور کی رونقوں میں روز افزوں ترقی ہورہی تھی، شعرا نے لکھنؤ چھوڑ کر یہاں آنا شروع کردیا تھا، آغا نوازش نے تو زیادہ ہی دانشمندی اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا تھا کہتے ہیں۔

نیرنگیٔ زمانہ نوازش نہیں ہے ختم　　کچھ لکھنؤ میں دیر نہیں انقلاب کی

اور اہلِ لکھنؤ کے بارے میں انھوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔

منہ پر یہ کچھ ہیں بعدِ نوازش یہ لوگ کچھ　　شایانِ دیدِ اب کے ہے احباب کا خواص

لکھنؤ اور کانپور کا موازنہ انھوں نے اس طرح کیا ہے۔

یہ لکھنؤ ہے نوازش جو یہاں اُڑے اُڑے　　جو کانوں کاں نہ سنے یہ کانپور نہیں

کانپور صنعتی شہر کی حیثیت سے اُبھر رہا تھا۔ وہاں دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کی فرصت کسی کو نہیں تھی۔ ہر شخص کو اپنے کام سے کام تھا، اس کے برخلاف لکھنؤ میں ''بیکاری'' کا زور تھا، اور یہی وجہ ہوئی کہ نوازش اس شہر کو چھوڑ کر نکلے۔

اے نوازش لکھنؤ چھوڑے کو بھی عرصہ ہوا　　چھوڑتی تس پر نہیں ہے پنڈ بیکاری ہنوز

شہر کانپور جیسا کہ مذکور ہُوا انگریزوں کا قبضہ تھا۔ انھوں نے اس علاقے کے گاؤں نیلام کر کے روپیہ جمع کرنا شروع کر رکھا تھا، نوازش نے موقع کو غنیمت جانا اور وہاں چلے گئے۔ سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''چند روز سے بہ سبب خرید کرنے دیہات نیلام کے، کانپور میں تشریف رکھتے ہیں، گاہے گاہے لکھنؤ میں بھی آجاتے ہیں''۔10

کانپور کی رونقوں میں بلاشبہ مسلسل اضافہ ہو رہا تھا، لیکن نواب معتمد الدولہ کا دل پوری طرح بجھ چکا تھا۔ معزولی کا رنج، پھر ''دیس نکالا'' ملنے کا غم معمولی نہیں تھا، لکھنؤ کی تباہیوں کی خبروں سے بھی دل ضرور دکھتا ہوگا۔ صحت بگڑنے لگی، مشکل سے ڈھائی برس تک وہ اس حال میں زندہ رہے، آخر عالم بقا کو روانہ ہو گئے، شیخ امام ناسخ نے ''خورشید منزل'' سے تاریخ نکالی، یہ گویا نوابین اودھ کی روایت کے مطابق ان کا لقب بعد از مرگ ہوا، ان کے پوتے نواب سید علی خاں بہادر کی بیاض میں ان سانحات سے متعلق یہ اندراج ہیں:

تاریخ علالت آں مغفور 5 ذی الحجہ 1247ھ (7 مئی 1832) بروز دوشنبہ،

تاریخ وفات نواب مغفور 12 ذی الحجہ 1247ھ (14 مئی 1832) بروز دوشنبہ

مدت حیات آں مغفور در کانپہ پور 2 سال 6 ماہ 12 یوم

نواب سید علی خاں نے جو مدت حیات لکھی ہے وہ عیسوی کلنڈر کے حساب سے ہے اور اس کے مطابق تاریخ وفات 5 ذی الحجہ (نہ کہ 12 ذی الحجہ) مطابق 7 مئی معلوم ہوتی ہے اور یہی صحیح ہے، حکیم نجم الغنی خاں نے بھی لکھا ہے:

''دوشنبہ 5 ذی الحجہ 1247ھ (7 مئی 1832) کو دنیا سے انتقال کیا''۔

اور یہی شیخ ناسخ کے قطعات تاریخ میں بھی ہے۔

دلا نوآب ضیغم جنگ امروز گذشت از دار فانی ناگہاں ہائے
نوشتم سال تاریخ وفاتش دوشنبہ پنجم ذی الحجہ اے وائے

1247

دیگر

وزیر اعظم شاہ زمن رفت بیک دم می کند صد بار دل ہائے
نوشتم صوری وہم معنوی سال دوشنبہ پنجم ذی الحجہ اے وائے

1247

نواب کی جس علالت کا ذکر نواب سید علی خاں کے اندراج میں ہے اس کی کیفیت رنگین کے قطعہ سے معلوم ہوتی ہے:

معتمد الدولہ چو رفت از دنیا گشتہ زیں حادثہ بس افسردہ
ہاتف غیب بہ گفتا رنگین معتمد مردہ زدرد کردہ

1247

وارثوں نے معتمد الدولہ کی رہائشی کوٹھی کے وسطی کمرے میں جو سب سے زیادہ وسیع تھا انھیں دفن کیا۔ قبر مسطح ہے اور اسے پختہ کرادیا گیا ہے، اس پر ناسخ کا پہلا قطعہ تاریخ یعنی

ع دلا نواب ضیغم جنگ الخ

لکھا ہوا ہے اور سرہانے کے ایک گوشے پر

آغا مُرد

1247

بھی تحریر ہے۔ یہ مادۂ تاریخ سعادت خاں رنگین نے نکالا تھا۔ اس میں ''آغا'' کے الف ممدودہ کو دو الف کے برابر شمار کیا جائے گا۔

تدفین کے بعد نواب کے اخلاف نے اس کوٹھی میں رہائش کا سلسلہ ختم کر دیا۔ ایصال ثواب کے لیے اسے امام باڑہ کی اور پھر خاندانی قبرستان کی حیثیت دے دی گئی۔ چنانچہ میر رشک کے

قطعہ میں یہ مذکور ہے۔

به غم معتمد الدوله مختار الملک　　آصف عهد، سلیماں حشم، اسکندر جاه
چه نصارا وچه گبروچه مسلمان وهنود　　می نمودند فغان وقلق ونالہ وآه
آں مکاں کز پے آسائش خود ساختہ بود　　دفن گردید دراں عشرت وآسائش گاه
خانۂ ماتم شبیرؑ مقرر گردید　　مسکن ومدفن مغفور حقیقت آگاه
رشک تاریخ عزاخانہ و مدفن بنوشت　　ہم عزاخانہ و ہم مقبرہ اے واویلا

1247

بعد میں یہ عمارت ''مقبرہ'' بلکہ ''گوالٹولی کا مقبرہ'' کے نام سے مشہور ہوئی، میر رشک نے بھی ایک شعر میں کہا ہے۔

ڈھیر پھولوں کے مزار یار دلواتے ہیں یاد　　مقبرے کا صحن ہے صحن گلستاں اس برس

معتمد الدولہ کے تیسرے صاحبزادے معین الدولہ نواب باقر علی خاں نے اس کو آصف الدولہ کے امام باڑہ کے طرز پر بنوانا چاہا تھا۔ اپنی زندگی میں صرف ایک مینار بنوا سکے۔ پھر ان کے صاحبزادے نواب سید علی خاں نے اس منصوبے کی تکمیل کی فکر کی، لیکن حادثات زمانہ کو کون روک سکتا ہے، عمارت میں آگ لگ گئی۔ سب ڈھیر ہوگیا۔ اب صرف دیواریں کھڑی ہیں، اللہ بس باقی ہوس۔

شاعری

کہتے ہیں کہ نواب معتمد الدولہ شعر کہتے تھے اور اس فن میں شیخ ناسخ کے شاگرد تھے لیکن راقم کو ان کا کوئی شعر نہیں مل سکا۔ البتہ یہ امر یقینی ہے کہ دونوں یعنی استاد اور شاگرد کے مابین بہت گہرے روابط تھے، معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت نواب پر ادبار آیا شیخ ناسخ کو بھی لکھنؤ سے نکل جانا پڑا تھا۔ پھر جب نواب کانپور میں مقیم ہوئے شیخ بھی وہیں پہنچ گئے۔ نواب کی وفات کے بعد ناسخ بے سہارا ہو گئے۔ کانپور پھر ان کے لیے ''دشت'' ہو گیا، انھوں نے لکھنؤ میں داخل ہونے کے لیے کوششیں تیز کر دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کامیابی کی صورت سامنے آئی چنانچہ 1248ھ (1832) کے شروع کی ایک غزل میں کہتے ہیں۔

پیکِ فرخندہ فال آ پہنچا　　پھر پیام وصال آ پہنچا
چشم بے نور ہوگئی پُر نور　　کیا وہ یوسف جمال آ پہنچا
دشت سے کب وطن کو پہنچوں گا　　کہ چھٹا اب تو سال آ پہنچا

کانپور کے زمانہ قیام میں نواب کا دل بجھ چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت وہ مرثیہ کی بھی کماحقہٗ سرپرستی نہیں کر سکے تھے۔

1-مہر

معتمد الدولہ عجیب بیدار مغز شخص تھے۔ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو اپنے بیٹوں کے معاملات کی فکر ہوئی۔ مرنے سے چند روز پہلے اپنے بڑے بیٹے امین الدولہ مہر کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اس موقع پر بڑا جشن ہوا۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی۔

از ثروت نواب امین الدولہ شاد و خرم شدن جملہ کہہ ومہہ
از ناخن جود وکرم خود بکشود ہر کس کے بدل داشت زافلاس گرہ
از تیغ حوادث ہمہ تن محفوظیم فیض وہمش کرد بما کار زرہ
اے رشک نوشتیم چہ تاریخ جلوس ذی الحجہ ویوم اوّل سہ شنبہ

1247

اس طرح اپنی ساری املاک، کاروبار، اعزہ اور متعلقین کی تمام ذمہ داریوں سے انھوں نے خود کو الگ کرلیا اور چار دن بعد اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے، میر رشک نے کہا۔

یا رب ایں معتمد الدولہ چہ شد مُرد دستور کبیر اے افسوس
گفت تاریخ وفاتش ہاتف زیں جہاں رفت وزیر اے افسوس

1247

امین الدولہ کا اصلی نام ''آغا علی'' تھا، وہ معتمد الدولہ کی خورد محل نواب بی جان کے بطن سے تھے اور اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ سالِ ولادت صحیح طور پر معلوم نہیں۔ البتہ اس بنا پر کہ ان کا بڑا بیٹا 1245ھ (1829-30) میں پیدا ہوا تھا۔ محض قیاساً کہہ سکتے ہیں کہ خود آغا علی کا سالِ ولادت 1225ھ (1810) کے آس پاس ہوگا۔ آغا علی کی پیدائش کے چند سال بعد نواب سعادت علی خاں کا انتقال ہوا۔ نواب غازی الدین حیدر مسند نشیں ہوئے تو معتمد الدولہ کو ان کی نیابت ملی۔ چند سال بعد غازی الدین حیدر بادشاہ اور معتمد الدولہ ان کے وزیر اعظم ہوئے۔ بادشاہ نے ان کی اولاد کو بھی خطابوں سے سرفرازی عطا کی۔ آغا علی کے خطابات اس طرح مقرر ہوئے:

''امین الدولہ سیف الملک نواب سید آغا علی خان بہادر فیروز جنگ''۔

آغا علی خاں کی پہلی شادی نواب بی بی بیگم کے ساتھ اور دوسری ان کی سگی پھوپھی فاطمہ بیگم کی

بیٹی کے ساتھ ہوئی تھی۔ فاطمہ بیگم کے مرنے کا قطعہ تاریخ میر رشک نے یہ کہا تھا۔

فاطمہ بیگم کے بد خوش دامنِ نوآبِ من　　سوئے بخت رفت و بر لب می رسد صد حیف آہ
یافتم از غیب ایں تاریخ صوری معنوی　　وائے ذیحجہ نہم روز احد صد حیف آہ

1262

فاطمہ بیگم کی بیٹی نواب آغا علی خاں کی دوسری زوجہ ہونے کی وجہ سے ''خورد محل'' کہلائی۔

مرزا رجب علی بیگ سرور سے پہلے شہر بدر ہو کر لکھنؤ سے کانپور پہنچنے والے ذی حیثیت لوگوں میں نواب قمر الدین احمد خان بہادر عرف مرزا حاجی اور میر فضل علی خاں اور ان کے اعزہ و اقربا بھی تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے اس شہر کو اپنے لیے ''حوالات'' سمجھا تھا اور یہاں سے جلدی سے جلدی رہائی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف رہے۔ اس شہر میں جتنی مدّت تک مقیم رہے جلاوطنی کے غم اور شرمندگی کی وجہ سے ''گوشہ نشین عزلت گزیں'' رہے۔ کانپور کے رہنے والوں پر تو یہ کوئی مثبت اثر بھلا کیا قائم کرتے انھوں نے خود اپنی رہائش کے لیے بھی کوئی قابل لحاظ انتظام یا اہتمام نہیں کیا۔ اسی لیے جب مرزا رجب علی بیگ سرور وہاں پہنچے تو انھوں نے یہ تاثر لیا کہ یہاں ''اشراف عنقا صفت ناپید'' ہیں۔ ان کے برخلاف جب معتمد الدولہ کانپور میں آئے تو ''دیس نکالا'' ملنے کے باوجود ان کی رئیسانہ طبیعت نے اس بات کو گوارا نہ کیا کہ وہ اپنے معمول اور معیار کے خلاف زندگی بسر کریں۔ ان کے اسی مزاج اور طرزِ فکر نے اس شہر کی کایا پلٹ کر دی۔ وہ جس وقت کانپور میں پہنچے تھے حالات بقول شیخ امام بخش ناسخ یہ تھے کہ

یہ نوچے کھاتے ہیں زندوں کو کانپور کے لوگ　　کہ جیسے کھاتے ہیں مُردوں کو زاغ گنگا میں

معتمد الدولہ کی سرپرستی میں شہر میں جشن منائے گئے اور رفتہ رفتہ شہر کا مزاج بدل گیا۔ سب سے پہلا جشن کانپور پہنچنے کے فوراً بعد امین الدولہ کے بیٹے کی ولادت کا منایا گیا۔ ناسخ نے قطعۂ تاریخ نذر کیا۔

مولدِ پورِ مہین پورِ وزیر　　کرد شاداں خاطر برنا و پیر
گفت ناسخ سالِ میلادش بخواب　　صبح طالع شد برآمد آفتاب

1245

مختلف قسم کی تقریبات کے علاوہ شہر کانپور میں طرح طرح کے تفریحی مشغلے بھی شروع ہوگئے۔ چنانچہ ناسخ کی ایک غزل میں یہ شعر توجہ طلب ہیں۔

عبث وہ کھیل رہے ہیں شکار مچھلی کا　　کہ رشک ہے یہ دلِ بیقرار مچھلی کا
لگائے کانٹے میں ٹکڑا کوئی مرے دل کا　　جو چاراچاہیے اے گلعذار مچھلی کا
بتاؤ مانجھیو تم کو قسم ہے گنگا کی　　کدھر وہ کھیل رہے ہیں شکار مچھلی کا

مچھلی کے شکار اور اس کے لوازمات، گنگا کی سیر، اور میلوں ٹھیلوں نے اہل کانپور کو نئی قسم کی مصروفیات اور نتیجہ کے طور پر یافت کی بھی نئی راہیں دکھائیں۔ ضمناً یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''گنگا کی قسم'' کو بھی اضافوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ یہ قسم دلّی اور لکھنؤ دونوں مرکزوں پر پہلے سے مروّج نہیں تھی۔

شروع میں بٹھور کا ذکر آچکا ہے۔ یہ ہندوؤں کا معبد تھا اور ظاہر ہے کہ جہاں لوگ جمع ہوں میلہ لگ جاتا ہے۔ نواب امین الدولہ مہر نے اس میلے میں بہ نفسِ نفیس شرکت کی۔ ان کے ساتھ متعلقین اور متوسّلین کی جماعت بھی پہنچی۔ نواب کے شایانِ شان وہاں اہتمام اور انتظام کیے گئے۔ میلے کی رونق بہت زیادہ ہوگئی، خود نواب نے اس سے متعلق ایک غزل کہی۔

تیرا جلوہ بٹھور میں دیکھا　　کیا کہیں کیا بٹھور میں دیکھا
چاند شرمندہ جس سے ہے ایسا　　ماہ سیما بٹھور میں دیکھا
جب اُٹھا ناچنے کو وہ خوش قد　　حشر برپا بٹھور میں دیکھا
پُشتے اے تیغِ ناز کشتوں کے تھے　　گھاٹ تیرا بٹھور میں دیکھا
اِن بُتوں سے خدائے عالم کا　　کارخانہ بٹھور میں دیکھا
جس سے بازارِ مصر شرمائے　　ایسا میلا بٹھور میں دیکھا
مجھ کو سمجھا وہ آشنائے بتاں　　جس نے بجرا بٹھور میں دیکھا
دورِ مے، وصلِ یار، آبِ رواں　　سب مہیا بٹھور میں دیکھا
جھک گئے آسمان تیرے حضور　　چرخ پوجا بٹھور میں دیکھا
مہر نے ایک ماہ کامل کو　　جلوہ فرما بٹھور میں دیکھا

بٹھور کا میلہ جس میں ''چرخ پوجا'' ہوتی تھی۔ پوری طرح ہندوؤں کا تھا۔ اس میں اگر اتفاق سے کوئی مسلمان پہنچ جاتا تھا تو وہ پریشان ہو جاتا تھا۔ شیخ ناسخ ایک دفعہ چلے گئے تھے تو انھوں نے اسے ''مصیبت زا'' کہا تھا، متعلق قطعہ یہ ہے۔

بٹھور ایسا مصیبت زا ہے قصبہ — کہ اس میں دم بدم کہتا ہوں اے وائے
نظر آتا ہے ہر سو شیو کا لنگ — میں مومن ہوں بتنگ آیا ہوں اے وائے

لیکن امین الدولہ مہر جس ماحول کے پروردہ تھے اس کا فیض یہ تھا کہ وہ ایسے میلے کو بھی عام پسند بنا سکتے تھے اور انھوں نے اسے عام ہندوستانی کی دلچسپی کے لائق بنا کر دکھا بھی دیا۔ اب اس میلے میں ایسی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی جس سے کوئی مومن تنگ آ جائے۔ ہر چیز کا اپنا محل اور موقع ہوتا ہے اور اگر وہ اپنے موقع پر ہو تو کسی کی پریشانی کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی، نواب کی شرکت کے زمانے میں بھی ہر قسم کی پوجا کا سلسلہ جاری تھا۔ البتہ اتنا ہوا کہ بے جا نمود و نمائش جو دوسروں کی دل آزاری کا سبب بنتی تھی موقوف ہو گئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب ہر سال اس میلے میں شرکت کرتے تھے چنانچہ ان کے دیوان میں اس سے متعلق کئی غزلیں موجود ہیں۔ یہاں صرف دو مقطعے نقل کیے جاتے ہیں۔

تاریخ عیسوی میں یہ مصرع ہوا ہے مہر — کیا ہی پسند آیا ہے تیرت بٹھور کا
1833(1248-49ھ)

اور ؎

اس ماہوش نے مجھ سے یہ تاریخ میں کہا — اے مہر لو پڑی ہے یہ میلہ بٹھور کا
1249ھ(1833-34)

نواب نے اپنے تفریحی مشاغل کے لیے اسباب تیار کروائے۔ چنانچہ 1249ھ (1833-34) میں ایک خوبصورت کشتی بنوائی میر رشک نے قطعۂ تاریخ کہہ کر پیش کیا۔

یہ کشتی نواب امین الدولہ — تحفہ کشتی بنی ہے ماشاء اللہ
تاریخ کہی رشک نے اس کشتی کی — اب کیا کشتی بنی ہے ماشاء اللہ
1249ھ

اوپر بجرے کا ذکر آ چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب کو بجرے کی سیر کا بہت شوق تھا بلکہ وہ اسی میں دور تک سفر بھی طے کر لیتے تھے۔ ایک دفعہ بنارس تک گئے، سیر رشک نے کہا۔

ہر گھاٹ کے پتھر ہوئے پارس کے برابر　　بجرا ترا پہنچا جو بنارس کے برابر

اسی طرح ایک اور شعر میں بھی ضمناً بجرے کا ذکر آ گیا ہے۔

لوگ کیا، بجرے کئی ڈوب گئے اے یمِ حُسن　　تو نے چھٹکا جو پُنس کا لبِ دریا الٹا

مختلف اشیا کے علاوہ انگریزی لباس وغیرہ کا استعمال بھی کانپور میں عام ہونے لگا تھا، چنانچہ میر رشک ہی کی ایک غزل میں ہے۔

پہنیں گے جب لباس نصاریٰ یہ شہسوار　　سڑکوں سے زین اسپ کو لندن بنائیں گے

نالے طرح طرح کے کرے گا یہ ایک دَم　　اکتارے کو فراق میں ارگن بنائیں گے

ضمناً میر علی اوسط رشک نے اس ملکِ نصاریٰ کے ڈاک کے نظام کے بارے میں بھی ایک قابلِ توجہ بات کہہ دی ہے یعنی

جو چاہو تم، تو مجھے پہنچے کانپور میں خط　　لکھو پتا جو محلّے کا کچھ محال نہیں

نہ پہنچے خط یہ تصور میں بھی نہیں آتا　　کہ مرغِ نامہ رساں طائرِ خیال نہیں

کچھ مدت کے بعد نواب کی سرپرستی میں تعمیروں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، چنانچہ ایک مسجد کی تعمیر کا قطعہ یہ ہے۔

عبادت سرائے چوں ترتیب یافت　　ز فرمان مہر ابنِ دستور شاہ

ز ارشاد عقل و ز فضل خدا　　عبادت ہمی کرد شام و پگاہ

رفیقاں بہ تقلیدِ آں راہبر　　شب و روز مصروف ذکرِ الٰہ

خدایا دہش از گنہ اجتناب　　بحقِّ خود و بہرِ ایں خانقاہ

چنیں گفت مصراعِ تاریخ رشک　　محلِّ نماز است و تعقیب گاہ

1251ھ(1835)

آدمی جہاں رہتا ہے خوشی اور رنج دکھ سکھ بھی کچھ ہوتا ہے۔ کانپور میں نواب کے متعلقین کے یہاں بھی ہر قسم کے معاملات پیش آتے رہتے تھے۔ چنانچہ ان کے اور متعلقین کے دو اوین

میں بکثرت واقعات کا مذکور موجود ہیں، نواب مہر نے پانچ شعر کی ایک غزل میں کسی بچے کی بسم اللہ کی تقریب کا ذکر کیا ہے، تین شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

سارے عالم کو مبارک ہو تری بسمِ اللہ　　لوح پر لکھتے قلم آج یہی بسمِ اللہ
حرف ان پر ہے نہ ہوں آج جو مشغولِ طرب　　اس طرح کی نہیں دیکھی ہے کبھی بسمِ اللہ
ہے دعا مہرؔ کی آئے تجھے لکھنا پڑھنا　　یہ مبارک کریں اللہ و نبی بسم اللہ

یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ قطعہ کس بچے سے متعلق ہے۔ بظاہر یہ امین الدولہ مہر کے پہلے بیٹے کی بسمِ اللہ کی ہوگی، جو 1245ھ (30-1829) میں پیدا ہوا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ امین الدولہ نے اس تقریب میں بہت اہتمام کیا تھا اور ان کے علم کے مطابق شہر میں شاید کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو ''مشغولِ طرب'' نہ رہا ہو۔

نواب مہر کے اسی دیوان میں ایک غزل میں کسی بیٹی کے مرجانے پر تاسف کا اظہار کیا گیا ہے، غزل فارسی میں ہے۔

امروز سیاہ است جہاں در نظرِ ما　　مدفن شدہ پُر نور ز نورِ نظرِ ما
چوں چرخ بہ کوکب شدہ اے بخت محدّر　　از داغ دریں رنج ودلِ ما جگرِ ما
بر بست چورخت سفر اے مہر زدنیا　　ایں دخترِ ما راحتِ شام وسحرِ ما
بود اے فلک از شہر صفر لیل دہم حیف
شُد مصرع تاریخ غروب قمر ما

صفر 1253ھ

قیصر التواریخ میں امین الدولہ کے دو بیٹے بتائے گئے ہیں۔ یعنی ''احمد آغا'' اور ''نادر آغا''، ان میں سے پہلا جیسا کہ مذکور ہوا 1245ھ میں پیدا ہوا تھا۔ ان دونوں کے ناموں میں قابل توجہ بات یہ ہے کہ باپ ''آغا علی'' کے نام کے جُزوِ اوّل کو جو جُزو اصلی (دوسرے بھائیوں کا نام سید علی، باقر علی، محمد علی تھا) بھی ہے۔ دونوں بیٹوں کے نام میں جُزوِ آخر کے طور پر شامل کر لیا گیا ہے۔ ناموں کا اس طور پر رکھا جانا ہندوستانی مسلمانوں میں معمول نہیں تھا۔ اس لیے قیاس کہتا ہے کہ شاید یہ بھی ملکِ نصاریٰ میں رہنے کا اثر ہو۔ نادر آغا کی پیدائش کے موقع پر میر علی اوسط رشک نے

ایک مختصر سا قصیدہ پیش کیا ہے ۔

ہر چند ہے عالم مری تقریر کا مشتاق　　پَر مشقِ خموشی سے ہے اظہارِ سخن شاق
کہنا ہو قصیدہ بھی، تو کس پر لکھوں بیتیں　　کل سات ہیں ایامِ مہ و سال کے اوراق
میں ذرّہ ہوں ذرہ سے ہے ناچیز مری فکر　　گو پرورشِ مہر سے ہوں شہرۂ آفاق
کیوں مدح و ذم مردمِ دنیا میں ہوں مصروف　　روزی مجھے بے فکر دیا کرتا ہے رزّاق

نوکر بھی ہوں اس کا کہ جو تقریب کوئی ہو
تکلیف نہ دے قطعہ کی اللہ رے اخلاق

ہاتف نے جو چپکا مجھے پایا تو پکارا　　اے رشک گذرتی ہے تری کم سخنی شاق
نوّاب کے گھر نجم درخشندہ ہُوا ہے　　اس بات میں ہم ہیں ترے اشعار کے مشتاق
منظور اگر ہے کہ خوشامد میں نہ ہو جھوٹ　　عاجز نہیں اس طرز سے بھی نظم کے مشتاق
جو بات کہ سچّی ہو چھپانا نہیں اچھا　　ممنوع ہے الحق سخنِ کذب کا الحاق
لختِ جگرِ مہر کو کہنا مہِ انور　　کچھ شاعری اس میں ہے نہ جھوٹ اس میں ہنا غراق

فرمودۂ ہاتف نے ہدایت جو مجھے کی
تاریخ کا قطعہ بھی بڑھایا پے الصاق

صد شکر وہ موجود ہوا جس کے تھے مشتاق　　ہے خلعۂ دل موردِ آسائشِ آفاق
عمر صد و سی سال خدائے دو جہاں دے　　دادا کی ملے داد و دہش، باپ کے اخلاق
آسودہ رہے سایۂ دامانِ پدر میں　　شاعر ہو یہ ایسا کہ مضامین کا خلاق
عیش و طرب و لطف و مسرت رہے زوج　　علم و عمل و طاقت و قوت میں رہے طاق
میلاد دوشنبہ کا سبب ہوگیا روشن　　اس مہ کا قمر نور کے تڑکے سے تھا مشتاق
اثنین میں پیدا ہوئے ہیں تین ائمہ　　اس دن کا تولّد بھی سیادت کا ہے احقاق

کس نور کا ہے مصرعِ تاریخ ولادت
<u>پیدا ہوا ساعت میں قمر کی مہ آفاق</u>

1257ھ(1841)

کہنے کو تو یہ محض قطعۂ تاریخ ہے لیکن اس میں وہ ساری باتیں موجود ہیں جو قصیدے میں مطلوب ہوتی ہیں۔ اس میں تشبیب بھی ہے، اور گریز بھی۔ دعا بھی ہے اور خاتمہ بھی، مطلع اول بھی ہے اور اور مطلع ثانی بھی، پورا قطعہ مدحیہ مضامین پر مشتمل ہے۔ زبان و بیان کا انداز اور شعروں کی غرض و ہیئت کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کے قصیدے کہے جانے میں مانع ہو۔ اس قصیدے سے اس علاقے کی شاعری کے بارے میں کئی توجہ طلب حقائق سامنے آتے ہیں:

(الف) کانپور میں کوئی شاہی دربار موجود نہیں تھا۔ شعروادب کا سرپرست اعلیٰ ایک معزول اور مرحوم وزیر کا بیٹا تھا جس کے پاس وثیقہ کی رقم کے سوا آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ اس کے پاس اختیارات بھی کچھ نہیں تھے۔ وہ تو خود ایک جلاوطن پناہ گزیں کی حیثیت سے اس شہر میں زندگی گذار رہا تھا۔ ایسے حالات میں یہاں قصیدوں کے لکھے جانے کا چلن نہیں ہوا تھا۔ مختلف تقریبوں سے متعلق قطعاتِ تاریخ لکھے جاتے تھے۔

(ب) کانپور میں شروع زمانے میں نواب اور ان کے متعلقین کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا، وہی شاعری کے لیے موضوع بنے۔ بعد میں اس شہر کی تفریحوں اور تقریبوں سے متعلق اشعار کہے گئے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کی شاعری بتدریج خیالی سے واقعاتی ہوتی چلی گئی۔ چونکہ یہ ایک نیا رجحان تھا، شعرا نے اکثر جھوٹ اور سچ کی بات کہی ہے مثلاً نواب مہر کہتے ہیں۔

نہیں ہے طرح کا یہ جھوٹ مصرع تاریخ ہوا ہے مہر کو سچ عشق مہوشاں پیدا

1250ھ (1834)

رفتہ رفتہ یہاں کی شاعری اس حد تک واقعاتی ہوگئی کہ ایک سے زائد شاعروں نے اپنے دیوان کی ہر غزل میں تاریخی مقطع کہنے کا التزام کیا ہے۔ زیرِ نظر قطعہ میں بھی یہ بات دیکھنے کی ہے کہ شاعر نے نومولود کے لیے کسی ایک بھی ایسی بات کے لیے دعا نہیں کی جو عقلاً اس کے لیے ناممکن ہو۔

(ج) غزلیں چونکہ عموماً کسی واقعہ یا کیفیت سے متاثر ہوکر کہی جارہی تھیں۔ ان میں مطلع سے مقطع تک ایک مخصوص فضا پائی جاتی تھی اور باوجود یکہ ان کو غزل مسلسل نہیں کہا جاسکتا تھا۔ ان کے لیے ایک عنوان ضرور تجویز کیا جاسکتا تھا اور وہ عنوان عموماً ردیف سے حاصل کیا جاتا تھا۔

غزل گوئی کا یہ نیا انداز کانپور کے باہر بھی بہت تیزی سے مقبول و مروّج ہوا تھا۔ چنانچہ آگرہ اور لکھنؤ کے بھی اکثر نام بر آور وہ شعرا نے اس قسم کی غزلیں کہی ہیں۔ یہاں محض نمونہ کے طور پر نواب مہر کی دو غزلیں نقل کی جاتی ہیں۔

ہم کو شہا دیس نکالا ملا تا بہ گدا دیس نکالا ملا
لکھنؤ تھا جسم، تو ہم جان تھے آئی قضا، دیس نکالا ملا
شاہ ہم اِس حکم کے دیوانے ہیں بے سر و پا دیس نکالا ملا
ظلم ہے شیطان، بنی آدم ہیں ہم
مہر بجا دیس نکالا ملا

دم پھڑکتا ہے مرا ہر دم برائے لکھنؤ لکھنؤ مجھ کو دکھادے، اے خدائے لکھنؤ
لکھنؤ کا میں ہوں عاشق، عشق میں ہوتا ہے جذب کیا تعجب ہے اگر مجھ کو بُلائے لکھنؤ
بادشاہِ لکھنؤ کی ایک زر بخشی یہ ہے قیصر و فغور و خاقاں ہیں گدائے لکھنؤ
آرزو ہے تجھ سے اے فرمانروائے کائنات
مہر پر ہو مہرباں فرمانروائے لکھنؤ

نواب امین الدولہ مہر شاعری میں شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ چنانچہ ان کے پہلے دیوان کے کئی مقطعوں میں اس کا ذکر آیا ہے مثلاً

پوچھتے ہو مجھ سے کیا اے مہر آہ نام تھا ناسخ مرے استاد کا

اور

کیوں نہ آنکھوں سے لگائے مصرعِ ناسخ کو مہر چشمِ جاناں اور ہے چشمِ غزالاں اور ہے

2-ناسخ

شیخ امام بخش ناسخ نواب معتمد الدولہ کے آخر زمانے میں بلکہ ان کے بعد بھی چند سال تک کانپور میں مقیم رہے تھے، لیکن وہ خود ان کی عمر کے بھی آخری سال تھے اور اس وقت ان کی حیثیت ''استادِ زماں'' کی تھی۔ وہ اپنے شاگردوں کی ترقیوں سے خوش ہوتے تھے۔ کوئی واقعہ خاص پیش آتا تو اپنے کسی شاگرد کو لکھ بھیجتے اور جب وہ اسے نظم کر دیتا تو اس کی کاوش کے لیے اسے داد دیتے تھے۔

چنانچہ ایک واقعہ کو میر علی اوسط رشک نے اس طرح نظم کیا ہے۔

قابل تحریر ہے نقلِ عجیب　　فی الحقیقت یہ فسانہ ہے غریب
بچہ اک کلوار کا تھا دلربا　　اک پٹھان اس ماہرو کا محو تھا
خاطرِ بد کیش میں آئی یہ بات　　کیجیے معشوق کی قطعِ حیات

اور پھر اس نے اپنے خیال کے مطابق اسے قتل کر ڈالا، اس کے بعد۔

خود کچہری میں وہ بے پروا گیا　　لاشۂ مقتول بھی لیتا گیا
حکم شیطان لعین غالب ہُوا　　آپ اپنے قتل کا طالب ہوا

اس میں شک نہیں کہ یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب تھا۔ شیخ ناسخ نے بھی سنا اور انھوں نے پورا احوال میر رشک کو لکھ بھیجا۔

ان دنوں تھے کانپور میں ناگہاں　　میرے مرشد ناسخ معجز بیاں
سن کے یہ احوال لکھ بھیجا مجھے　　نامہ اس عنوان سے آیا مجھے
یہ حکایت نظم کرنا چاہیے　　سب حقیقت نظم کرنا چاہیے
قصہ اس ناقص کا پورا نظم ہو　　شعر اس کے مادّے کا نظم ہو
ہے رعایت بھی ضروری معنوی　　مادّہ ہو نظم صوری ومعنوی
جب لکھا استاد کامل نے یہ ذکر　　آگئی تاریخ فرمائش کی فکر
یعنی ایسا مادّہ آجائے ہاتھ　　ہوں سنینِ عیسوی ہجری کے ساتھ
بیت بھر میں ہوں سنین عیسوی　　مصرعِ آخر میں ہجری واقعی
فکر میں بیٹھا ہوا تھا میں خموش　　ناگہاں یوں آئی آوازِ سروش

مار ڈالا بچہ اک کلوار کا= 5 8 6 +

خارجی سولی پر اب کھینچا گیا= 1245 ھ

1831

دوسری طرف شاگردوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ بھی استاد سے فرمائش کرتے رہتے تھے چنانچہ محسن نے لکھا ہے:

''جس زمانہ میں شیر بیشۂ سخنوری، ہزبرِ نیستانِ معنی پروری، استادِ راسخ، جناب امام بخش ناسخ مغفور دارد کانپور تھے، یہ غزل ارشاد فرمائی تھی

ع جب کبھی پہنا جڑاؤ اُس نے زیور کان میں

میں (شیخ الٰہی بخش عشقی) نے عرض کیا، اکثر غزلیں آپ نے اِسی طور کی فرمائی ہیں، اگر سب اعضا میں غزلیں ہو جائیں تو ایک دیوان بطور سراپا ترتیب پائے۔ کچھ جواب ارشاد نہ ہوا مگر دوسرے روز اس غزل سے محظوظ فرمایا ع

کیا نسیمِ صبح لائی ہے مرا دم ناک میں

اسی طور پر اکثر غزلیں اور بھی فرمائیں مگر افسوس ہے کہ زیست اس وحید العصر کی نے وفا نہ کی''۔[1]

''کان'' والی غزل جس کا اوپر ذکر آیا دراصل دو غزلہ ہے اور ان کے مطلعے اور مقطعے یہ ہیں۔

کیا چمکتے ہیں پر و تیرے گوہر کان میں — ہے یقیں ایسا نہ ہوگا کوئی جوہر کان میں
بوتری زلفوں کی جاتی ہے جو اکثر کان میں — میل ہو جاتی ہے رشکِ مشک و عنبر کان میں
جب کبھی پہنا جڑاؤ اس نے زیور کان میں — نازکی بولی کہ کیوں لٹکائے پتھر کان میں
یا علیؑ ہو جان ناسخ کی نہ کیوں تم پر نثار — تم ہی ہو رکنِ رکیں ایمان کے ارکان میں

اور ''ناک'' والی غزل کے مطلعے اور آخری شعر اس طرح ہیں۔

ہے تصور اس گل تر کا دل غمناک میں — عطر ہے اشکوں کے بدلے دیدۂ نمناک میں
شیشۂ مے کی تمنا ہے دل غمناک میں — ساغرِ مے کی ہے حسرت دیدۂ نمناک میں
واعظا وہ مست ہیں آئے اگر بوئے شراب — پنبۂ مینا سے رکھ لیں وہیں ہم ناک میں

اس قسم کی غزلیں کہتے وقت شاعر کی توجہ دو امور پر رہتی تھی:

اوّل یہ کہ ردیف کی ترتیب اس طور پر ہو کہ اس میں کسی عضو بدن کا نام ضروری جز کے طور پر شامل ہو جائے، اور دوئم یہ کہ غزل کے ہر شعر میں مطلع سے مقطع تک اس عضو بدن کی رعایت ملحوظ رہے۔ اس طرح غزل کے تمام شعروں میں ایک خاص قسم کے رابطہ کی صورت پیدا ہو جائے گی اور باوجود یکہ دو غزل مسلسل نہیں ہوگی اس کے لیے مذکورہ عضو بدن کو عنوان کی حیثیت دی جا سکتی

ہے۔اس طرح کی غزلیں اصطلاحی معنوں میں نظم تو نہیں ہوں گی لیکن ان کو ''غزلہائے نظم طور'' ضرور کہا جا سکتا ہے۔

یہ ذکر آ چکا ہے کہ کانپور کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد میر علی اوسط رشک نے جو غزل کہی تھی اس کی ردیف تھی ''میدان جوہی کا''، اور وہ مطلع سے مقطع تک اس میدان کی کیفیتوں کے بیان پر مشتمل تھی۔ باوجود اس کے اس کا ہر شعر اپنی جگہ پر مکمل اور دوسرے شعر سے غیر متعلق بھی تھا۔غزل گوئی کے اس انداز کو کانپور کے مخصوص ماحول کی دین سمجھا جانا چاہیے۔

کہا گیا ہے کہ شیخ ناسخ نے اسی طور پر ''اکثر غزلیں'' فرمائی تھیں۔ان کے دیوان میں جو غزلیں موجود ہیں۔ان میں سے دو کے مطلعے درج ذیل ہیں۔

زانو کی طرح صاف ہیں اس حور کی ساقیں　　آئینہ کی رانیں ہیں تو بلور کی ساقیں

اور۔

کس قدر صاف ہے تمھارا پیٹ　　صاف آئینہ سا ہے سارا پیٹ

کہا جا چکا کہ ان ''غزلہائے نظم طور'' میں ردیف نے شعر گوئی کے لیے موضوع کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور یہ معلوم ہے کہ قصیدے کے لیے بھی موضوع یعنی ممدوح کی شخصیت متعین ہوتی ہے۔اس لیے عملاً ان غزلوں نے قصیدے کے متبادل کا درجہ حاصل کر لیا تھا اور اسی مناسبت سے ان کو ''غزلہائے قصیدہ طور'' بھی کہا گیا ہے۔ان میں بعد کو چونکہ مدلّل انداز سے کہنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، ان کے لیے کبھی کبھی ''غزلہائے مدلّل'' کی ترکیب بھی آئی ہے۔ان ترکیبوں کے اطلاق کے لیے شیخ امام بخش ناسخ کی درج ذیل غزل ایک اچھے نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

رفتار میں اور رنگِ سلیماں ہے یہ گھوڑا　　پر سیرت و خلقت میں تو انساں ہے یہ گھوڑا

سلطان جہاں کی یہ سواری کا اثر ہے　　ہے اہلِ قیام بدن جاں ہے یہ گھوڑا

کافی ہے فقط ظلِّ الٰہی کا اشارہ　　ناسخ کی طرح طابعِ فرماں ہے یہ گھوڑا

شیخ ناسخ اگرچہ اس زمانے کے مسلم الثبوت استاد تھے۔انھوں نے کانپور کے اس طرزِ جدید کو بخوبی اختیار کر لیا تھا۔دراصل وہی اس زمانے کی ہوا تھی اور اس سے دامن کو بچا لینا کسی کے لیے بھی عملاً ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ناسخ کے دوسرے دیوان میں بکثرت غزلیں اسی نئے طرز میں ہیں۔

یہاں مثالاً محض چند غزلوں کے مطلعے نقل کیے جاتے ہیں۔

آج مولد ہے جنابِ احمد مختار کا　　خار زارِ دہر میں عالم ہُوا گلزار کا
مولد ہے آج اُس شہِ عالی جناب کا　　جو گیارھواں پسر ہے ولایت مآب کا
آج دنیا میں امامِ انس وجاں پیدا ہوا　　یعنی ابن عمِ شاہِ مرسلاں پیدا ہوا
ہو مبارک کہ ہوئے حیدر وصفدر پیدا　　شہرِ علم ازلی کا یہ ہُوا در پیدا
ہو مبارک قائم آلِ عبا پیدا ہوا　　مہدیِ ہادی امام ما سوا پیدا ہوا

3-سید

نواب معتمد الدولہ آغا میر کے دوسرے بیٹے کا نام سید علی تھا اور اپنے نام کی مناسبت سے یہ سیّد تخلص کرتے تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ نے ان کو ذیل کے خطابوں سے سرفراز کیا تھا:

"نظام الدولہ، امیر الملک، نواب، سید علی، خان بہادر، دلاور جنگ"۔

ان کے بھتیجے نواب سید علی خاں ابن معین الدولہ کی بیاض میں ان سے متعلق ذیل کا اندراج موجود تھا:

"ازروئے حساب تاریخ 6/مارچ 1816 (ربیع الثانی 1231ھ) نواب نظام الدولہ بہادر تولد شد نداز کاغذات نواب شرف النسا بیگم"۔

چنانچہ نظام الدولہ کا مولد لکھنؤ تھا وہیں اُنھوں نے ابتدائی تعلیم وتربیت حاصل کی تھی۔ چند سال بعد ان کا ختنہ ہوا۔ بڑی خوشی منائی گئی، "سیم وزر" لٹایا گیا۔ شیخ ناسخ نے قطعۂ تاریخ نذر کیا۔

تاریخِ ختنہ

نشاطِ ختنہ سیّد علی خاں　　بہ آقائے جہاں مسعود بادا
ز دست جود سیم وزر فشاندن　　بہ فیاضِ زماں مسعود بادا
فزوں ہردم بود حشمت الٰہی　　بگویم ہر زماں مسعود بادا
شدہ از داماد دلہا ہمہ بزم　　برنگِ بوستاں مسعود بادا
زرعب صیحہ کوسِ شکوہش　　عدو شد بے نشاں، مسعود بادا

برائے سالِ تاریخ ہمایوں بگو تاریخ خاں مسعود بادا

1239ھ(1823-24)

نظام الدولہ کی بھی ان کے بڑے بھائی امین الدولہ کی طرح دو شادیاں ہوئی تھیں اور دونوں ان کے کانپور میں منتقل ہو جانے کے بعد ہوئی تھیں۔ نواب سید علی خاں کی بیاض میں اس سلسلے کا ایک اندراج یہ ہے:

''نواب بہو بیگم صاحبہ گُل محل نواب نظام الدولہ دختر نواب روشن الدولہ بہادر وزیر شاہ اودھ''۔

کیفیت اس کی اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ جس زمانے میں معتمد الدولہ کو عروج حاصل تھا، بقول حکیم نجم الحسن خاں:

''معتمد الدولہ نے مرزا محمد حسن پسر نواب روشن الدولہ کو سلیمان شکوہ کی دوسری بیٹی کے ساتھ بزور و ظلم منعقد کیا''۔

اس رشتہ سے یہی نہیں ہوا کہ روشن الدولہ کا دہلی کے شاہی خاندان سے سمدھیانہ ہو گیا۔ بلکہ اس بنا پر کہ مرزا سلیمان شکوہ کی ایک بیٹی کی شادی غازی الدین حیدر کے ولی عہد نصیر الدین حیدر کے ساتھ ہوئی تھی۔ روشن الدولہ کا بیٹا لکھنؤ کے ولی عہد کا ہم زلف بھی ہو گیا۔ روشن الدولہ نواب معتمد الدولہ کے نہایت ممنون تھے بعد کے زمانے میں جب ان کا اقبال یاور ہوا تو انھوں نے معتمد الدولہ کے احسانوں کا بدلہ اس طرح دیا کہ اپنی اس بیٹی کی جو اُن کی منکوحہ کے بطن سے تھی معتمد الدولہ کے دوسرے بیٹے نظام الدولہ کے ساتھ شادی کر دی۔ چنانچہ حکیم نجم الغنی نے لکھا ہے کہ:

''معتمد الدولہ کا ایک بیٹا روشن الدولہ کی بیٹی کے ساتھ منعقد تھا، سسرال میں آ کر روشن الدولہ کی یہی بیٹی ''نواب بہو بیگم'' کہلائی۔

جس وقت معتمد الدولہ نے وفات پائی نظام الدولہ کی عمر سولہ برس سے کچھ زائد ہوئی تھی۔ چند سال تک انھوں نے اپنے بڑے بھائی امین الدولہ کی سرپرستی میں بسر کی۔ اِن کی تعلیم و تربیت کے انتظامات بھی امین الدولہ نے ہی کیے ہوں گے۔ اسی زمانہ میں لکھنؤ کی سیاست بدلی اور منتظم الدولہ کی معزولی کے بعد وزارت کی خلعت نواب روشن الدولہ کو عطا ہوا، نجم الغنی کا بیان ہے:

"14 جمادی الآخر 1248ھ ماہ نومبر 1832 کو روشن الدولہ وزیر ہوئے، ان کا نام محمد حسین خاں اور عرف مرزا نتھو اور خطاب روشن الدولہ منیر الملک محمد حسین خاں بہادر قائم جنگ ہے، اور بعد میں صولت جنگ لکھا ہے۔"[4]

روشن الدولہ کو یہ منصب نواب قدسیہ محل بیگم کی سفارش سے ملا تھا، ابھی دو برس بھی نہیں گذرے تھے کہ بیگم نے رحلت کی، میر علی اوسط رشک نے قطعہ تاریخ کہا جو اس طرح ہے۔

ہائے قدسیہ بیگم ذی جود شد ز الماس ریزہ آخر ہائے
آں مسافر نواز وحاتم وقت شد ز دار فنا مسافر ہائے
دلِ عالم ازیں غمِ جاں کاہ شد ملول وشکستہ خاطر ہائے
رشک تاریخِ انتقال نوشت بیمۂ ماہ ربیع آخر ہائے

1250ھ (1834)

نواب روشن الدولہ نے دانائی سے کام لے کر 12 رجب 1250ھ نومبر 1834 کو اپنی سگی بہن گمانی خانم کی بیٹی قمر طلعت کی شادی نصیر الدین حیدر بادشاہ کے ساتھ کردی۔ اس کے بعد سے نصیر الدین حیدر خود کو روشن الدولہ کے دامادوں میں شمار کرنے لگے، ان کی خاطر سے روشن الدولہ کے اعزہ کو بھی مناصب اور اعزازات حاصل ہوئے۔ معتمد الدولہ کی وہ جائداد اور املاک جو لکھنؤ میں تھی ان کے بیٹوں کے حق میں واگذاشت ہوگئی اور ان کا لکھنؤ میں آنا جانا شروع ہوگیا۔

اسی زمانہ میں کسی بات پر نظام الدولہ کی ان کے بڑے بھائی امین الدولہ سے اَن بَن ہوگئی۔ لیکن بڑی اچھی بات یہ ہوئی کہ دونوں نے آپس کی بات چیت سے معاملات کو طے کرلیا، جو فیصلے ہوئے انھیں تحریری شکل دے دی گئی۔ تاکہ آئندہ بھی کوئی فتنہ پیدا نہ ہو، بڑے بھائی کی حیثیت سے امین الدولہ نے نظام الدولہ کو صلح کا خلعت عطا کیا۔ میر علی اوسط رشک جو دونوں بھائیوں کے استاد اور بہی خواہ تھے اس صلح سے بہت خوش ہوئے۔ ممکن ہے کہ اس میں ان کی کوششوں کو بھی دخل رہا ہو۔ انھوں نے اس موقع پر چند قطعات تاریخ کہے، ایک یہ ہے۔

مل گئے آپس میں دو مہر و ماہ ہوگیا تحریر سے ملنا سند
صلح کا نواب نے خلعت دیا رہ گئے کھاتے ہوئے حاسد حسد

مصرع تاریخ لکھا رشک نے آج ہوا خلعتِ صلح ابد

1251ھ (1835)

دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ نا اتفاقی حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب سے پیدا ہوئی تھی۔ اس صلح کا ہو جانا بہت اچھا رہا۔ کیونکہ اسی زمانے میں روشن الدولہ بھی معزول ہوئے، اور محمد علی شاہ بادشاہ کے حکم سے جلاوطن ہو کر وہ بھی کانپور آ گئے تھے۔ کچھ مدت تک وہ عیش سے رہے اور بعض شاعروں کی سرپرستی بھی کی۔ پھر ان کے بیٹے نے ان کی دولت پر قبضہ کر کے کانپور میں اپنے نام سے ایک محلہ جرنیل گنج آباد کیا۔ خود روشن الدولہ نے آخری دن مفلسی میں کاٹے، اور 12، جب 1269ھ (23/اپریل 1853) کو وفات پائی۔ جنازے کو کانپور سے لکھنؤ لا کر دفن کیا گیا۔

روشن الدولہ کی دولت میں سے نظام الدولہ کو بھی بہت کچھ حصہ ملا تھا، چنانچہ وہ بھی کانپور میں بڑی آن بان سے بسر کرتے تھے، اپنے بڑے بھائی امین الدولہ کے فیض صحبت سے وہ بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے، امکان ہے کہ شروع میں شیخ ناسخ سے بھی کچھ استفادہ کیا ہو لیکن باقاعدہ شاگرد میر علی اوسط رشک کے ہوئے تھے، سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

"نظام الدولہ، امیر الملک، سید علی خان بہادر، دلاور جنگ، تخلص سیّد، خلفِ اوسط نواب معتمد الدولہ بہادر، شاگرد میر علی اوسط رشک"۔

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

بُت خانوں میں بھری ہوئی خلقت خدا کی ہے — بُت بھی خدائی کرتے ہیں قدرت خدا کی ہے
بیجا نہیں حسینوں کی یہ لَن ترانیاں — اے غافلو یہ حُسن امانت خدا کی ہے
چھلّے کا کھائے تیرے گل اے یار ہاتھ میں — گلدستہ ہے کہ پھولا ہے گلزار ہاتھ میں
سید کبھی نہ طالبِ اکسیر ہوں جو آئے — خاکِ مزارِ حیدرِ کرار ہاتھ میں

خیال کریں کہ اس کلام کا انداز وہی ہے جو کانپور کے مخصوص حالات میں رائج ہو رہا تھا۔

4- رشک

میر علی اوسط رشک ان لوگوں میں سے تھے جو نواب معتمد الدولہ کے ساتھ لکھنؤ سے کانپور

آئے تھے، نصیر الدین حیدر بادشاہ کے آخر وقت میں جب معتمد الدولہ کی املاک لکھنؤ میں ان کے بیٹوں کے نام واگذاشت ہوگئی تو امین الدولہ اور نظام الدولہ کا لکھنؤ میں آنا جانا بھی ہوگیا۔
ابن طوفان نے رشک کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"میر علی اوسط رشک تخلص، از شاگردانِ معتمد حضرت شیخ عبد اللہ ناسخ و (میر خلیق) از پسرانِ میر حسن دہلوی صاحب مثنوی، کلامش لطیف و مضمونش تازہ، بالفعل در کانپور تشریف می دارد، اکثر شریک مشاعرۂ مرزا برق می شد، چوں کار کن و استاد امین الدولہ مہر تخلص، پسر مبین نواب معتمد الدولہ مرحوم است، در لکھنؤ گاہگاہ رونق افروز می شود، دو شعر از غزلش یاد است۔

منہدی لگا کے باندھے جو پنجے ارنڈ کے — ہم بد گمان سمجھے کہ ہے ہاتھ ہاتھ میں
منظور ہوئے گریۂ قدرت کا پشت خار — سکھلا کے رکھیے آپ مرے ہاتھ ہاتھ میں"[6]

میر علی اوسط رشک کے دیوان سے اس زمانے کے کانپور کے بہت سے قابل ذکر واقعات کا پتا چلتا ہے مثلاً۔

ہمہ ایوانِ میر اسد صاحب — سوخت، فریاد، آہ، واویلا
شد ز آتش فروزیِ گردوں — ہمہ برباد، آہ واویلا
گفت تاریخ رشک سوختہ دل — آتش افتاد آہ واویلا

1247ھ(1831-32)

یہ میر اسد صبر تخلص کرتے تھے۔ شیخ ناسخ کے شاگرد اور معتمد الدولہ کے اقربا میں سے تھے۔
میر رشک نے میر اسد کے علاوہ کانپور اور ملحقات میں کئی اور لوگوں کی وفات وغیرہ کی بھی تاریخیں کہی تھیں۔ خود اپنی بیوی کے مرنے کے سانحہ سے متعلق جو چند قطعے کہے تھے ان میں سے ایک یہ ہے۔

زوجۂ من در تقائے وزہد و ایثار و ورع — بود از نسوانِ عالم عمدہ، ایمانم گواہ
مولدش بد فیض آباد و مکانش لکھنؤ — مدفنش شد کانپور، از حکم تقدیر الٰہ
رشک تاریخ نکاح و وصل و عمر و مرگ گفت — عقد سال شد دہم شد، سال چہلم موت آہ

1251ھ

اس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ رشک کی یہ بیوی 1211ھ (97-1796) میں پیدا ہوئی تھی اور 1229ھ (1814) میں اس کی شادی ہوئی تھی۔

اسی سال میر رشک نے اپنے بیٹے علی ضامن کا ختنہ کرایا اور پھر اس کی شادی بھی کر دی۔ علی ضامن کی ماں اپنی شادی کے بعد کوئی بائیس برس زندہ رہی تھی۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ میر رشک نے علی ضامن کی شادی کسی قدر کم عمری میں کر دی تھی۔ ختنہ اور شادی کی تاریخ ذیل کے مصرعوں سے برآمد ہوتی ہے۔

ع یوم بست دہم از ماہ مبارک شادی

1251ھ

اور ع ہو ہمایوں ختان یا اللہ

1251ھ

میر رشک نے اپنی خالہ اور بعض دوسرے اعزّ او غیرہ کے انتقال کی تاریخیں بھی کہی تھیں۔

نواب امین الدولہ کی طرف سے جو عنایتیں ہوتی تھیں۔ ان سے متعلق بھی میر رشک کے دیوان میں کئی قطعات ملتے ہیں مثلاً

بمن داد نواب آقا علی خاں چو از فرطِ ہمت قلمدانِ سیمیں
پے نذر تاریخ فوراً نوشتم زہے شد عنایت قلمدانِ سیمیں

1252ھ

گذشتہ اوراق میں جو کچھ مذکور ہوا، اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ کانپور کا ماحول تاریخ گوئی کے لیے خصوصیت کے ساتھ سازگار تھا۔ وہاں کے شاعروں نے اس فن کو ترقی اور وسعت دے کر کمال کے درجے تک پہنچا دیا تھا۔ میر علی اوسط رشک اس شہر کے سب سے بڑے استاد اور بقول محسن "محقق علم شعر" تھے۔ ان کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد نے صحیح لکھا ہے کہ ان کو:

"شاعری کی سرکار سے تاریخیں کہنے کا ٹھیکہ ملا تھا"۔ 7

میر علی اوسط رشک نے کانپور میں اپنا پہلا دیوان 1253ھ (1837) میں مرتب کر کے اس کا تاریخی نام "نظم مبارک" مقرر کیا۔ اس دیوان کے شروع میں پنجتن کے عدد کے مطابق

شیخ ناسخ کی غزلوں پر پانچ خمسے لکھے ہیں۔ غالباً اسی پانچ کی رعایت سے نواب معتمد الدولہ اور ان کے اخلاف کی سرپرستی میں خمسہ گوئی کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ ''فسانۂ عجائب'' میں بھی جس کی تالیف کانپور میں ہوئی تھی ضمناً مذکور آیا ہے کہ:

''طوطے نے شہزادے کو بیانِ دلچسپ، قصصِ عجیب، حکایاتِ غریب، شعرِ خوب، خمسہائے مرغوب سنا، اپنے دامِ محبت میں اسیر کیا''۔

چنانچہ اس شہر کے تقریباً سبھی شاعروں کے دیوان میں خمسے شامل کیے جانے لگے تھے۔ میر رشک کے ایک خمسے کا پہلا اور آخری بند یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

شکر صد شکر ہُوا عاشقِ دادر پیدا　　شہر بے در ہو تو سیر اس کی ہو کیوں کر پیدا
روز میلاد یہی دھوم تھی گھر گھر پیدا　　ہو مبارک کہ ہوئے حیدر صفدر پیدا
شہر علم ازلی کا یہ ہُوا در پیدا

یوں تو ہے فوق نبی کو بھی نبی پر ناسخ　　دوسرا ایک سے ہے دہر میں بہتر ناسخ
رشک سے بھی ہے عقیدے میں برابر ناسخ　　نہیں ممکن کوئی ہو مثلِ علی پَر ناسخ
گیارہ فرزند ہوئے اس کے برابر پیدا

دیوان کے آخر میں میر رشک نے اپنی ''رباعی تاریخ'' شامل کی ہیں۔ مثالاً صرف دو رباعی درج ذیل ہیں۔

ہے دستِ الٰہ ہاتھ تیرا یا شاہ　　اب غیر کے ہاتھ پر نہ رکھ میری نگاہ
تیرا ہو غلام غیر کا دست نگر　　لا حول ولا قوۃ الا باللہ

دیگر

مشکل میں ضرور چاہیے یادِ علی　　چاہی ہے پیغمبروں نے امدادِ علی
موجود ہے اے رشک کلامِ قدسی　　اللہ نے احمدؐ سے کہا نادِ علی

میر علی اوسط رشک کی مذہب پسندی ان کی رباعیوں میں بھی صاف جھلک رہی ہے۔

مثنوی

کانپور میں طویل مثنویاں بہ گمانِ غالب نہیں لکھی گئیں۔ جتنی مثنویوں کا حال ہمیں معلوم ہو سکا ہے وہ سب مختصر ہیں اور ان میں سے بیشتر براہِ راست یا بالواسطہ مذہبی خیالوں کی آئینہ دار ہیں۔

1-خرم

مولوی خرم علی، قصبہ بلھور، ضلع کانپور کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے بیشتر کتابیں اور رسالے مذہبی مسائل سے متعلق اردو نثر میں لکھے ہیں۔ طبیعت موزوں پائی تھی۔ اس لیے کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتے تھے اور اپنے نام کی مناسبت سے خرم تخلص کرتے تھے۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ان کی ایک مختصر سی مذہبی مثنوی موجود ہے۔ 8 جس کا مخطوطہ کُل دو ورقوں کا ہے۔ ظاہراً مصنف نے اس کا کوئی نام مقرر نہیں کیا تھا، کاتب نے اسے ''مثنوی مولوی خرم'' لکھا ہے۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

خدا فرما چکا قرآن کے اندر مرے محتاج ہیں پیر و پیغمبر

اور خرم کی یہ مثنوی اس شعر پر ختم ہوتی ہے۔

تو اپنے حال میں کچھ سوچ خرم زباں اب بند کر واللہ اعلم

1-رشک

میر علی اوسط رشک نے اس مدت میں دو مثنویاں لکھی تھیں۔ پہلی مثنوی کا قصہ ان کو شیخ ناسخ نے لکھ کر بھیجا تھا، جس میں ایک پٹھان نے ایک کلوار کے بچے کو قتل کر دیا تھا اور پھر خود عدالت میں حاضر ہو کر پھانسی کی سزا پائی تھی۔ اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

دوسری مثنوی بھی انھوں نے ناسخ ہی کی فرمائش سے لکھی تھی۔ صورت یہ ہوئی تھی کہ جس زمانے میں شیخ ناسخ کانپور گئے تھے۔ شیخ امداد علی نے حاضر ہو کر ان سے بارھویں امام کے حالات تفصیل سے نظم کرنے کی فرمائش کی۔ میر رشک بھی اس وقت وہاں موجود تھے، ناسخ ان کی مذہبی معلومات کے معترف تھے۔ اس لیے انھوں نے میر رشک سے یہ کام کرنے کے لیے کہا۔ رشک نے استاد کے حکم کی تعمیل کی اور یہ مثنوی لکھی۔ اس کا عنوان ہے:

''مثنوی در بیان رجعت امام مہدی''۔

اور یہ مثنوی ان شعروں سے شروع ہوتی ہے۔

اگر ہو بسملہ سے فارغ افواہ　　کریں تحمید یوں الحمدُ للہ
کسی شے سے نہیں ہرگز مشتبہ　　جہات وامکنہ سے ہے منزہ

یہ مثنوی دراصل ''حدیثِ مفضل بن عمر'' کا ترجمہ ہے۔ جس میں فرقۂ امامیہ کے عقیدہ کے مطابق امام مہدی کی رجعت کا بیان ہوا ہے۔ مثنوی کے آخری دو شعر یہ ہیں۔

بس اے رشک اب قلم رکھ لے یہاں سے　　ملے گا اجر امامِ انس وجاں سے
ہوئی منظوم ہندی میں بخوبی　　حدیث رجعتِ مہدیِ ہادی

ان شعروں کے بعد شاعر نے اس مثنوی کی تاریخ نظم کی ہے۔

ہوئی تاریخ نظمِ نظم کی فکر　　پتے سے یاد رہتا ہے ہر اک ذکر
کہی تاریخ بھی ہاتف نے کیا ہے　　ہو نظم پاک مقبول الٰہی

1248ھ

یہ مثنوی مطبع سنگی لکھنؤ میں 1263ھ (1847) میں چھپ گئی تھی۔ ضخامت کُل 26 صفحوں کی ہے۔ اس کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری کے سبحان اللہ کلکشن میں موجود ہے۔

D

ہزل وریختی

کانپور میں جب طبیعتوں کو اطمینان ہوا اور وہاں تفریح وتفنن کے سامان فراہم ہو گئے تو شاعروں کو بھی ہزل اور ریختی کی طرف توجہ ہوئی اور سنجیدہ اور معتبر استادوں نے بھی ظریفانہ شعر کہے۔

1-رشک

آسی نے میر علی اوسط رشک کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''اگر چہ یہ نہایت متین اور مہذب تھے ان کے بعض شعر ظرافت کے بھی پائے جاتے ہیں، اس کی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت کے لوگ متانت کے ساتھ ظرافت نگاری کو بھی شامل رکھتے تھے، جو شعر لکھے جاتے ہیں ان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نادانستہ ظرافت نہیں ہے بلکہ قصداً اس طرف قدم بڑھایا گیا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہرگز نہ لکھے جاتے۔''1

ان کی ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

چادل الماس، گوشت لخت جگر　　فرقتِ یار میں پُلاؤ نہیں
میرے کھانے سے کیوں فلک ہے کباب　　پاؤ روٹی ہے نان پاؤ نہیں

اور کیا ہے ترا لعاب دہن　　یہ اگر قند کا چواو نہیں
اب کے جاڑے ہیں اور نالہ وآہ　　اس طرح کا کوئی الاؤ نہیں
یہ زمین غزل وہ ہے اے رشک　　جس میں ذرہ کہیں بھراؤ نہیں

میر رشک صاحب ایک اور غزل اس طرح کہتے ہیں۔

اے مایۂ حیات کبھی مجھ کو بھیج دے　　جھوٹا تری رکابی کا توروں سے کم نہیں
سینے سے دل چُرا کے چُراتے نہیں نظر　　یہ بُت بھی کانپور کے چوروں سے کم نہیں
یارب یہ گورے ہیں کہ فرشتے عذاب کے　　بنگلے بھی کانپور کے گوروں سے کم نہیں
جاتے ہیں مجھ سے چھپ کے ترے گھر جو رات کو　　اغیار تیرہ بخت بھی چوروں سے کم نہیں

یہ سب شعر میر رشک کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں۔ اس لیے ان کو "نادانستہ ظرافت" کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

2-لا اعلم

مشہور ہے کہ میر رشک کی اوّل الذکر غزل کو سُن کر بقول آسی:

"کسی ظریف الطبع نے سر مشاعرہ یا سر محفل رشک کو مخاطب کیا، اور یہ شعر پڑھا۔

چھیڑے دور سے دکھاؤ نہیں　　رشک بیٹھا ہے بَن بلاؤ نہیں 2

3-فرد

یہ دربھنگہ کے رہنے والے تھے۔ لیکن کانپور میں آ کر رہ پڑے تھے، اس شہر میں ان کے بہت شاگرد تھے۔ اس لحاظ سے یہاں کے شعری ماحول پر ان کے اثرات بھی خاصی حد تک مرتب ہو رہے تھے، محسن نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

"وحید الدین خاں عرف مولوی خدا بخش خاں فرد ولد محسن خاں قوم افغان یوسف زئی، معلم پیشہ، باشندہ دربھنگہ، متعلقہ صوبہ بہار سنہ ۵۷ سے کانپور میں مقیم مثل علی خاں، غم در بابو خاں دستار بند اس شہر میں بہت شاگرد ان کے ہیں، اور خود مولوی گری (استادی) کا دم مارتے ہیں، اور اپنے تئیں سب سے اونچا مانتے ہیں، صاحب دیوان شاگرد غلام ہمدانی مصحفی"۔3

ان مولوی فرد کے کلام کے بارے میں آسی نے اس طرح رائے دی ہے:

''اشعار عاشقانہ، لیکن اکثر ظرافت آمیز کہتے تھے''۔[4]

اور ان کی ظرافت عموماً ریختی کا انداز اختیار کر لیتی ہے، چنانچہ ذیل کے شعروں سے ظاہر ہے۔

بند انگیا کے نہ بندھو اے کبھی — عمر بھر بندہ تو نامحرم رہا

سطح سینہ پہ ترے اے بتِ نوخیز یہ کیا — ابھرا ابھرا نظر آتا ہے کچھ اُٹھا اُٹھا

وہاں چھاتی ہے گدرائی ہوئی کیوں کر یہاں کھٹکا — درخت بار ور میں باندھتا ہے باغباں کھٹکا

داستان

جس وقت سے کانپور اور مضافات پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تھا، یہ خطہ اودھ کے جلاوطنوں کا وطن بن گیا تھا۔ ان مخصوص حالات میں کانپور کو آباد کرنے والوں میں لکھنؤ کے بعض شرفا بلکہ کچھ مقتدر شخصیتیں تھیں، مرزا رجب علی بیگ سرور بھی انھیں شرفا میں سے ایک تھے۔

1 - سرور

کانپور کے بارے میں مرزا سرور کا یہ بیان مشہور ہے کہ اس شہر میں انھوں نے ''چھوٹی اُمّت کی بڑی کثرت دیکھی''، لیکن اِسی کثرت میں انھیں ایسے لوگ بھی ملے تھے جن میں سے ایک کا نام حکیم اسد علی تھا۔ ان کے بارے میں سرور نے لکھا ہے:

> ''یہ طور دیکھ کر دل وحشت منزل سخت گھبرایا، کلیجہ منہ کو آیا، قریب تھا جنون ہو جائے، لیکن بہ شربت عنابِ و معجونِ شفقت ارسطو فطرت، بقراط حکمت، حکیم سید اسد علی صاحب، شیر بیشۂ علم و کمال، سخن فہم ظریف، خوشحال، طبع سودا انگیز اور سرجنوں انگیز کو آرام و تسکین حاصل ہوئی، ایک روز ان سے بعد اظہارِ حال مکلف فسانہ دوستانہ یہ بھی کہا کہ ''ایک کہانی لکھا چاہتا ہوں''، سُن کر فرمایا: ''بے کار مباش کچھ کیا کر میر۔
>
> میر نہیں پیر تم، کاہلی اللہ رے نامِ خدا ہو جواں کچھ تو کیا چاہیے

اس وقت یہ کلہ تو سن طبع کو ناز یانہ ہوا، اگر چہ اس پیچ میرزکو یہ یارا نہیں کہ دعوائے اردو زبان لائے، یا اس فسانہ کو بہ نظر ثانی کسی کو سنائے، اگر شاہجہان آباد کہ مسکن اہل زبان بیت السلطنت ہندوستان تھا، وہاں چندے بود و باش کرتا، فصیحوں کو تلاش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا، جب میر امن صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے ذہن وحصے میں یہ زبان آئی ہے، دلی کے روڑے ہیں، محاورے کے ہاتھ منہ توڑے ہیں، پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر، یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے، مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے، بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے، کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ وعار ہے، مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید"۔5

اگر چہ اس اقتباس میں یہ مذکور نہیں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ سرور اپنے اس فسانہ کو بادشاہ لکھنؤ کے حضور میں گذران کر اپنا قصور معاف کرانا چاہتے تھے۔ تا کہ انھیں لکھنؤ میں داخلہ کی اجازت مل جائے۔ اس بنا پر بادشاہ لکھنؤ کی خوشنودی کی خاطر انھوں نے کانپور کی برسات وغیرہ کی مذمت کی، اور اس کے مقابلے میں شہر لکھنؤ کی تعریف کی۔ اسی طرح دہلی کے "بیت السلطنت ہندوستان" ہونے کو زمانہ ماضی کی بات قرار دیا۔ دہلی کی مذمت کے سلسلے میں میر امن کے خلاف بھی کئی جملے لکھ ڈالے۔ جوش میں یہ بھی خیال نہ رہا کہ خود اپنا قلم "بیہودہ گوئی" تک پہنچ گیا ہے۔

لکھنؤ کی تعریف میں مرزا رجب علی بیگ سرور نے بعض مستعار باتوں کا بھی ذکر کر دیا ہے، مثلاً لکھتے ہیں کہ:

" کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ سناتی ع مزہ انگور کا ہے رنگتروں میں"6

کہتے ہیں کہ محمد شاہ بادشاہ دہلی نے سنترہ کا نام رنگترہ رکھا تھا۔ چنانچہ دہلی کے ایک شاعر غلام رسول شوق کی غزل کے دو شعر یہ ہیں۔

مزہ انگور کا ہے رنگترے میں عسل زنبور کا ہے رنگترے میں
ہیں اشعار ہلالی اس کی پھانکیں یہ مضموں دور کا ہے رنگترے میں

اپنے فسانہ کو شروع کرنے سے پہلے سرور نے بادشاہ کی مدح اس عنوان سے قلمبند کی ہے:

"مذکور شاہ غیور، ہتھ دشوکت، نوشیروان معدلت، غازی الدین حیدر بادشاہ، غازی وارث، دودمان سعادت"۔

لیکن اس بادشاہ کے زمانے میں مقصد حاصل نہیں ہوا، تو اس کے مرنے کے بعد بادشاہ دوم کی مدح اس طرح شامل کی:

''کلمہ حق کہنے والے کا مدار دار پر ہوتا ہے، منصور مگر اس کا محلہ ہے، یہ نکتہ بگوش دل وجاں سُن اُلحق مرّ حاسدوں کے خوف سے یہ مذکور مختصر کیا، اچھے آغاز کا انجام بخیر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ مشفت کسی کی بیکار نہیں کھوتا ہے، یہ فسانہ عہد دولت شاہ غازی الدین حیدر شروع ہوا تھا، اور تمام عصر سلطان بن سلطان ابو النصر نصیر الدین حیدر دام ملکہ ہوا، اللہ اللہ یہ عجب شاہ عجاہ اریکہ نشیں ہوا، جتنا اس کی صفت میں لکھیے بہت کم ہے، لہٰذا اس غزل پر اختتام کیا، یہ جملہ تمام کیا۔

تا ابد قائم رہے فرمانروائے لکھنؤ

یہی نہیں سرور نے اس بادشاہ کے زمانے میں متن میں بھی ترمیم اور اضافے کیے تھے لیکن ان کی یہ کوشش بھی بار آور نہیں ہوئی۔ بہر نوع اس زمانے میں فسانۂ عجائب کا ایک ترمیم شدہ متن وجود میں آ چکا تھا، گمان غالب ہے کہ مندرجہ بالا اقتباسات اسی کا حصہ ہیں۔

3 ربیع الثانی 1253ھ/7 جولائی 1837 کو نصیر الدین حیدر نے وفات پائی، تو نصیر الدولہ محمد علی شاہ ان کی جگہ تخت نشیں ہوئے۔ سرور نے ان کے زمانے میں بھی اپنے فسانے پر پھر نظر ثانی کی اور اس کے متن میں بعض اضافوں کے علاوہ بہ گمان غالب کچھ ترمیمیں بھی کیں۔

فسانۂ عجائب مطبوعہ 1262ھ میں یہ مذکور ہے کہ محمد علی شاہ کے وزیر شرف الدولہ کی سرکار میں سرور کو ملازمت حاصل ہو گئی تو:

''اس کہانی کی بھی آبرو ہوئی۔ ہر ایک کو خواہش ہوئی۔ جستجو ہوئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ لکھی نہ گئی، چھپنے کی صلاح ٹھہری''۔

اس طرح سرور کو بالآخر اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل ہو گئی اور ان کے فسانہ کی چند بار کی ترمیم شدہ صورت چھپ کر خاص و عام کے سامنے آ گئی۔

2-یوسف

باطن کے تذکرے میں یوسف تخلص کے ایک شاعر کے حال میں مذکور ہے کہ اس نے بھی ایک قصہ لکھا تھا۔ باطن کے الفاظ یہ ہیں:

" یوسف تخلص، نواب امجد علی خاں نام، رئیس قصبہ دیوی علاقہ فتح پور ہنسوا مولف قصہ افسانۂ رنگین یوسف کے مضمون کو چاہِ طبع سے اہل کاروان فکر نکال کر لائے، پیش قافلہ سالار سامعین قصہ مضمون طبع یوسف زلیخا یاں شایق کو فسانہ خواب راحت ہے، داستان فکر سخن مشتاق جمال لحبۂ نظم کو رنگین عبارت ہے"۔ Z

فتح پور ہنسوہ کانپور سے متصل ہے اس لیے یہاں پر اس اقتباس کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوا افسوس ہے کہ یوسف کے اس قصہ کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔

مذہبی نثر

شہر کانپور اور اس کے مضافات میں بھی اردو نثر میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ البتہ اس علاقے میں جن نثری تحریروں کا حال دریافت ہو سکا ہے۔ وہ عموماً مذہب سے متعلق ہے۔

1- خرم علی

مولوی خرم علی بلہوری کا شاعر کی حیثیت سے ذکر کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے لکھنؤ اور دہلی میں قیام کر کے وہاں کے علما سے تکمیل کی تھی۔ پھر سید احمد شہید کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان سے خلافت حاصل کی تھی۔ ان کی ہدایت کے مطابق ساری عمر علمی مشاغل میں بسر کی۔ آخر عمر میں اپنے ننھال قصبہ آسیون میں جا کر سکونت پذیر ہو گئے۔ وہیں 1273ھ (1856-57) میں وفات پا کر مدفون ہوئے۔ مولوی خرم علی نے اردو نثر میں مذہبی مسائل سے متعلق کئی کتابیں اور رسالے تصنیف و تالیف کیے تھے۔

(الف) نصیحت المسلمین: یہ مولوی خرم علی کی پہلی تصنیف ہے۔ انھوں نے اس کے سبب تالیف میں لکھا ہے:

"سنا چاہیے کہ اب ہندوستان میں عجب ایک بلا پھیل گئی ہے، کہ اُمتِ محمدیؐ میں بہت

سے لوگ شرک میں گرفتار ہیں، لیکن اکثر مسلمان بیچارے بہ سبب بے علمی اور ناواقفی کے ناچارہ ہیں، تو اس واسطے بندہ عاجز خرم علی کے دل میں آیا کہ اس شرک کی برائی قرآن شریف سے ثابت کیجیے، اور ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف صاف بیان کریے، تا کہ ہر ایک کو فائدہ عام ہو، اور جو مسلمان بھائی کہ عربی زبان نہیں جانتے اس کو سمجھ کر شرک کی عادت سے بچیں، اور اپنے پیغمبر کی راہ کو اختیار کریں، اور جو لوگ کہ اس کو سمجھیں اور نہ مانیں تو اپنا سر کھائیں، قبر میں آپ ہی معلوم ہو جائیگا، بارے الحمدُ للہ کہ سن بارہ سو اڑتیس ہجری میں یہ رسالہ بن چکا، اور اس کا نام نصیحۃ المسلمین رکھا"۔

کتاب نصیحت المسلمین کا آغاز ذیل کی عبارت سے ہوتا ہے:

"سبحان اللہ کیا شان ہے تیری کہ بغیر مدد دوسرے کے اتنے بڑے آسمان اور زمین کو کس خوبصورتی کے ساتھ پیدا کیا، اور کسی نبی اور ولی کو اپنے کارخانے میں کچھ اختیار نہیں دیا ہے، ہزار ہزار شکر تیرے احسان کا کہ تو نے ہم کو قرآن اور حدیث سے اپنی توحید کو بوجھایا، اور شرک کی آفت سے ایک عالم اس میں پھنس رہا ہے تو نے محض ہم کو اپنے کرم سے بچایا، اور جناب محمد علیہ الصلاۃ والسلام کی سیدھی راہ پر چلایا، الٰہی درود اور رحمت بھیج ہمارے اس نبی مقبول پر کہ جو اس کی راہ پر چلا اس نے واسطے دوزخ سے پناہ لی"۔

اور خاتمہ اس کتاب کا ذیل کے شعر پر ہوا ہے۔

اب اتنا اور بھی سُن لیجیے حضرت جو حق پر نہ چلے، اس پر ہے لعنت
ہمارا کام سمجھانا ہے یارو اب آگے چاہے تم مانو نہ مانو
تو اپنے حال میں کچھ سوچ خرم زباں اب بند کر واللہ اعلم

مولوی خرم کی اس کتاب کے مباحث مختصراً اس طرح ہیں:

"شرک کیا ہے؟ اقسام شرک، شرک کی مذمت، شرک و بدعت قرآن و حدیث کی روشنی میں"۔

یہ کتاب پہلی بار کلکتہ 1848 میں چھپی تھی، بعد میں دہلی، مدراس، میرٹھ، اور لکھنؤ میں بھی

چھپ کر شائع ہوئی ہے۔

(ب) رسالۃ ترغیب الجہاد: مولانا خرم علی نے 1242ھ (1827) کے بعد جہاد کی ضرورت اور فضیلت سے متعلق ایک رسالہ فارسی میں لکھا تھا۔ پھر اس کا ترجمہ بطور خلاصہ اردو میں کیا۔ اس اردو رسالہ کی شروع کی عبارت مختصراً اس طرح ہے:

''حمد بے شمار اس قادر مطلق کو جو پتھر بت کو رائی اور رائی کو پتھر بت کر سکے، اور جو پتھر سے نمرود کو مار ڈالے، اور جس کی مدد سے موسیٰ فرعون سے بادشاہ کو مصر کی بادشاہی سے نکالے،..... تحفہ درود کا اس کے رسول کریم کو جس نے پہلے کافروں کو نرمی سے سمجھایا، جب نہ سمجھے تب جہاد کیا، سننا چاہیے کہ اب ہندوستان کفرستان ہو گیا ہے، چنانچہ قوم سکھ لاہور وغیرہ کے مدت سے حاکم ہیں، ظلم ان کا حد سے گذر گیا، ہزاروں مسلمانوں کے ناحق خون کر ڈالے، اور ہزاروں کو بے عزت کیا، اذان کہنا، گائے کو ذبح کرنا بالکل موقوف کر دیا، چنانچہ بیسویں تاریخ جمادی الاول کی بارہ سو بیالیس میں کفار سکھ سے جہاد شروع ہو گیا..... اب مسلمانوں پر فرض ہے کہ جلد لشکر اسلام میں ملیں اور جہاد میں شریک ہوں، اس خیر خواہ اسلام نے جہاد کا حال اس رسالہ ترغیب الجہاد میں قرآن مجید اور حدیث کی معتبر کتابوں سے پانچ بابوں میں لکھا، اور اس کا خلاصہ ترجمہ ہندی بولی میں کیا جو سب مسلمان اس کو سمجھیں، اور جہاد پر مستعد ہو جائیں''۔

اس کتاب ترغیب الجہاد کے پانچ ابواب اس طرح ہیں:

پہلا باب: جہاد کے معنی اور جہاد کے فرض ہونے کے بیان میں

دوسرا باب: سستی جہاد کے عذاب میں

تیسرا باب: جہاد اور ثواب کے بیان میں

چوتھا باب: شہادت کے ثواب میں اور شہیدوں کے مرتبوں میں

پانچواں باب: فی سبیل اللہ مال خرچنے کے ثواب میں اور نمازیوں کی مدد اور خدمت کے بیان میں۔

کتاب کے آخر میں ایک طویل نظم ہے جس کے آخر اشعار یہ ہیں ۔

اہلِ ایمان کو کافی ہے دلا اتنا پیام　　اب مناجات پہ بہتر ہے کہ ہو ختم کلام
اے خداوند سماوات وزمیں، ربِّ عباد　　اب مسلمانوں کو دے جلد سے توفیق جہاد
اپنے بے زور مسلمانوں کو کر زور آور　　وعدۂ فتح جو ان سے ہے کیا ، پورا کر
ہند کو اس طرح اسلام سے بھر دے اے شاہ　　کہ نہ آوے کوئی آواز بجز اللہ اللہ

مولوی خرم علی کے اس رسالے کے ایک مخطوطہ کا ترقیمہ اس طرح ہے:

''الحمدللہ کہ رسالہ ترغیب الجہاد بہ تاریخ نہم شوال 1242ھ (1827) بہ اتمام رسید''۔

(ج) سر الشہادتین: شاہ عبدالعزیز دہلوی نے شہادت حسنینؓ کے ذکر میں ایک مختصر رسالہ عربی میں لکھا تھا۔ مولانا خرم علی نے اس کا ترجمہ اردو میں نواب ذوالفقار الدولہ ذوالفقار علی کی فرمائش پر غالباً 1246ھ (31-1832) میں کیا تھا، اس کی ابتدائی عبارت مختصراً اس طرح ہے:

''حمد بے شمار اس حاکم باالقدار کو کہ جس کے بھید سے کوئی خبر نہیں اور اس کی تیر قضا کی بجز صبر وشکیبائی کے کوئی سپر نہیں اور ہزاروں درود اس کے نبی کریمؐ پر کہ جس نے اعدائے دین سے کیا کیا صدمے اٹھائے اور اس کے آل واصحاب پر جن سے حق بندگی کا کیا خوب ادا ہوا.... سنا چاہیے کہ رئیس العلما شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے شہادت امام حسنؓ وحسینؓ میں عجب تقریر دل پذیر فرمائی، کہ آج تک کسی عالم دانشمند کے خیال میں نہیں آئی.....از بسکہ رسالہ نادرۂ روزگار عربی میں تھا.....نواب ذوالفقار علی بہادر دام اقبالہ نے راقم الحروف عاجز خرم علی سے ارشاد فرمایا کہ اس کا ترجمہ ہندی میں ہو جائے تو ہر شخص اس کا لطف اٹھائے چنانچہ بہ موجب ارشاد کے عمل میں آیا اور خلاصۂ مطالب ترجمہ ہندی محاورے کے مطابق کر کے جہاں مجمل تھا اس کو مفصل کیا تا کہ ہر شخص بے تکلف مطالب کو پہنچے اور کسی کا دل نہ الجھے۔ بارے الحمدللہ ماہ محرم 1242ھ (1826) میں انجام کو پہنچا اور ترجمہ سر الشہادتین اس کا نام رکھا''۔

(د) آداب الحرمین: اس رسالے کے مقدمہ میں مولف نے لکھا ہے:

''یہ رسالہ ہے آداب الحرمین، اس میں مسائل ضروری حج کے اور زیارت مدینۂ منورہ

کے اردو میں صاف صاف بیان ہیں، شرح وقایہ اور دُرالمختار وغیرہ سے عاجز محرم علی
نے بہ موجب فرمائش سید میرک جان شناور لکھنوی کے 1249ھ (1833-34)
میں مرتب کیا۔ حق تعالیٰ مسلمین کو اس سے فائدہ بخشے"۔

افسوس ہے کہ سید میرک جان شناور کے حالات کچھ معلوم نہ ہو سکے، بہرنوع مولوی محرم علی کے اس رسالہ کا اختتام ذیل کی عبارت پر ہوا ہے:

"پھر ہر ایک قبروں پر جاوے اصحاب اور اہل بیت کی اور سلام کرے چنانچہ مشہور ہے
اور مستحب ہے کہ مدینہ کی اور مساجد میں نماز پڑھے خصوصاً مسجد قبا میں اور جبلِ اُحد کی
اور وہاں کے شہیدوں کی زیارت کرے، اور وہاں اپنے واسطے خدا کے دعائے خیر
کرے، باقی آداب اور دعائیں وہاں کے معلّم بتلا دیتے ہیں، زیادہ تفصیل کی حاجت
نہیں، الٰہی اپنے کرم و فضل سے ہم کو بھی حرمین شریفین کی زیارت نصیب کر، آمین"۔

یہ رسالہ آداب الحرمین مطبع محمدی لکھنو میں محمد حسین کے اہتمام سے چھپا تھا۔ اس نے بھی اس کے آخر میں بعض دعاؤں کا اضافہ کر دیا ہے۔

(ہ) تحفۃ الاخیار: یہ حدیث کی مشہور کتاب "مشارق الانوار" کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کو بقول ڈاکٹر محمد ایوب قادری حدیث کے اردو تراجم میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے۔ ترجمہ کا مقدمہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔ "حمد و نعت کے بعد دریافت کیا چاہیے کہ علم حدیث اشرف العلوم ہے۔ .....سب علوم دینی اس کے محتاج ہیں..... باوجود اس کے ہندوستان میں اس علم شریف کا چرچا نہیں.....مناسب معلوم ہوا کہ کسی حدیث کی کتاب کا ترجمہ عوام فہم اردو میں کیجیے۔ سو سب کتابوں میں مشارق الانوار حسن صغانی کی نہایت پسند آئی۔ اس واسطے کہ مختصر کتاب ہے اور اس کی احادیث کی صحت پر اتفاق ہے کوئی اس کی حدیث ایسی نہیں جو غیر معتبر ہو۔ بہ خلاف مشکوٰۃ کے کہ اس میں ہر جنس کی روایت ہے، صحیح بھی ضعیف بھی۔ بارے الحمدللہ کہ بارہ سو اُنچاس ہجری میں حسب دلخواہ ترجمہ تمام ہوا، اور تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار اس کا نام مقرر کیا"۔

اس کتاب کے ترجمے میں ذیل کے امور ملحوظِ خاطر رکھے گئے ہیں:

"(1) حدیث کا ترجمہ تحت لفظ نہیں کیا۔ اس واسطے کہ عرب کا محاورہ ہند کے محاورے

سے اکثر مطابق نہیں بلکہ محاورہ مقدم رکھا ہے، مُرادی مطلب جا بجا لکھا اور باوجود اس کے حتی المقدور تحت لفظ ترجمے کی بھی رعایت کی ہے۔

(2) اصل غرض اس سے یہ ہے کہ اہل اسلام کو فائدہ عام ہو، یہاں تک کہ حرف شناس اور عوام بھی محروم نہ رہیں، اس واسطے نہایت مشکل مطالب نہیں لکھے۔

(3) مصنف نے کمال اختصار سے قصہ حدیث کا نہیں بیان کیا کہ حضرت نے یہ حدیث کس وقت اور کس تقریب سے فرمائی تو اس کا مطلب بخوبی نہیں معلوم ہوتا۔ اس واسطے حدیث کے ترجمے کے بعد فائدہ میں اس کا پورا قصہ لکھ دیا اور جہاں مطلب مجمل اور مشکل تھا اس کو مفصل کر دیا"۔

مولوی رحم علی نے اس کتاب کا اختتام ان شعروں پر کیا ہے۔

شکر کہ انجام کو پہنچی کتاب — علم احادیث کی لبِ لباب
جو کہ مطالب تھے بر اوجِ فلک — ترجمے سے آئے اُتر ارض تک
یعنی کہ اردو کی پہن کر قبا — شاہد قاری ہوا جلوہ نما
گنجِ خفی دست بدست آگیا — کیا ہی ہوا رازِ نہاں برملا
دوستو اب اس کا ادا حق کرو — خلق کو سمجھاؤ، خود اِس کو پڑھو
اس کو نہ جُزواں میں رکھ چھوڑیو — ہاں کہیں ایسا نہ ستم کی جیو
پیرو سُنّت ہی کا رہیو بجاں — دل میں نہ بدعات کو دینا مکاں

یہ رسالہ پہلی مرتبہ مطبع مصطفائی لکھنؤ سے جمادی الاوّل 1257ھ (1841) میں چھپا تھا۔ پھر بمبئی سے شائع ہوا۔

2- کشفی

مولوی سلامت اللہ کشفی اصلاً بدایوں کے رہنے والے تھے، لیکن کانپور میں رہنے لگے تھے، وہیں ستاسی برس کی عمر پا کر 13 رجب 1281ھ (1864) کو وفات پائی۔ شاعری کا بھی شوق تھا، چنانچہ کشفی تخلص سے ظاہر ہے۔ عربی فارسی میں کئی تصانیف چھوڑیں۔ اردو میں ان کی صرف ایک کتاب "خدا کی رحمت" کا حال معلوم ہو سکا ہے، اس کا آغاز ان کلمات سے ہوتا ہے:

''بعد حمد خدا اور نعت محمد مصطفیٰ علیہ الصلاۃ والثنا کے مسلمانوں کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ عمل مجلسوں مولود شریف کا جس طرح سے مہینے ربیع الاول اور سوا اس کے اور مہینوں میں معمول ملک ہند میں ہے، قدیم سے ثابت اور معمول دین کے عالموں اور بزرگوں کا ہے، چنانچہ زیادہ چھ سو برس سے زمانہ گذرتا ہے کہ کتابوں معتبر سے رواج عمل جبر کا عرب، عجم، روم، شام میں پایا جاتا ہے.....''۔

اس کتاب خدا کی رحمت کے اختتام کی عبارت اس طرح ہے:

''المختصر حضرت کے فضائل اور خصائل بہت ہیں، مسلمانوں کو لازم ہے کہ یہ اعتقاد دل سے کریں اور زبان سے بھی کہتے رہیں کہ سب سے بہتر خدا کے بعد رسولؐ خدا ہیں، شعر

یہ بات سچ ہے کہ آدم سے لے کے تا عیسیٰ　　خدا کے بعد بڑے سب سے ہیں رسولِ خدا''

یہ کتاب مطبع منشی نول کشور کانپور میں 1882 میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔

3-عباس علی فاروقی

مولوی عباس علی فاروقی جاج مئو کانپور کے رہنے والے اور مولوی ناصر علی مورخ کے فرزند تھے۔ علم حدیث میں صاحب نظر تھے اور شعر بھی کہتے تھے۔ اردو میں دو کتابیں ان سے یادگار ہیں:

(الف) صولۃ الضیغم: یہ ایک ضخیم کتاب مولوی عباس علی نے اردو میں تالیف کی تھی، پھر افادیت کے خیال سے انھوں نے خود ہی اس کا خلاصہ تیار کیا تھا۔ سبب تالیف میں لکھتے ہیں:

''اب جاننا چاہیے کہ راقم اس رسالے کا عباس علی بن ناصر علی بن فضل اللہ فاروقی جائسوی کہتا ہے کہ آگے میں نے کتاب صولۃ الضیغم علیٰ اعداء ابن مریم نصاریٰ کے رد میں تصنیف کی تھی، لیکن جو اس کا حجم بہت تھا، اس واسطے میں نے یہ مختصر ترتیب دیا، جس کو اس میں کسی طرح کا شبہ پڑے وہ اصل کی طرف رجوع کرے''۔

مولوی عباس علی کی کتاب ''خلاصۃ صولۃ الضیغم'' کا قطعہ تاریخ تکمیل اس طرح ہے۔

چوں بفضلِ خدائے عزّ وجَل　　یافت ترتیب ایں رسالہ خوب
گفت ہاتف کتاب مرغوبست　　سال تاریخ ہم بود مرغوب

1248ھ (1832-33)

خاتمۂ کتاب میں مولف نے اپنی کتاب کی افادیت وغیرہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ:

''اس کتاب میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وحضرت موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے واسطے ایک چھوٹا سا دھما کہ ہے، اس قدر بیان کیا گیا اور جسے زیادہ تشریح وتفصیل کی طلب ہو وہ صولۃ الصلیم کی طرف رجوع کرے۔ اس وقت ان کی گمراہی سے بخوبی آگاہی ہوگی اور اگلے وقت میں اس سبب سے کہ نصاریٰ کا عمل نہ تھا اور زور وشور اس دین منسوخ کا پنہاں تھا اگلے عالموں نے ان کے رد کی طرف کم توجہ فرمایا لیکن اس زمانے میں عالموں پر فرض وواجب ہے کہ ان کے دین کے ابطال پر کوشش کریں۔ ورنہ رفتہ رفتہ یہی لوگ خلق کثیر کو گمراہ کر ڈالیں گے اور یہ گمان نہ چاہیے کہ رد لکھنے سے کفار قائل نہیں ہوتے۔ پھر کیا فائدہ کیونکہ جب میں صولۃ الصلیم لکھ چکا اور دس پانچ جگہ یہ امر مشہور ہو گیا، کہ لوگوں نے ویٹ اور ولیم پادریوں کی بھ سے بحث کرادی۔ آخر میں خدا کی مدد سے ان پر غالب ہوا۔ تب ان کے رفیقوں سے جو نئے نئے کرسٹان ہوئے ہیں دو شخص میرے پاس آکر مسلمان ہو گئے''۔

کہا جا چکا کہ کانپور ''ملک نصاریٰ'' کہلاتا تھا۔ وہاں دین نصاریٰ کے رد میں کتاب لکھنا اور بحث کرنا بڑی جرأت کی بات تھی۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب لکھ کر مولوی عباس علی فاروقی نے مدلل اور مناظراتی ادب کی اردو زبان میں ابتدا کی تھی۔ زبان اس کتاب کی قابل توجہ حد تک صاف ہے۔ مصنف نے روزمرہ بول چال کے الفاظ استعمال کیے ہیں، مثلاً:

''لگی، سپوت، مہاجال، چوکھا، باسن، اندھڑ، جورو، چھنال، چورم چور، ہالا ڈولا، چنگا کرنا، قبولنا وغیرہ''۔

(ب) صبح کا ستارہ: یہ مولوی عباس علی کی اردو میں دوسری کتاب ہے۔ یہ دراصل امام غزالی کی تصنیف ''دقائق الاخبار'' کا اردو ترجمہ ہے اور 1249ھ (1833-34) میں مکمل ہوا تھا۔ کہیں کہیں مترجم نے اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کیا ہے، سبب تالیف میں مذکور ہے کہ:

''حمد اس خدا کو جو عالم کا پروردگار ہے، اور درود وسلام اس نبیؐ پر جو سب نبیوں کا سردار ہے، بعد ازاں عباس علی بن ناصر علی المورخ بن فضل اللہ الجاجموی غفر اللہ لھم کہتا ہے

کہ سنہ بارہ سو اچاس ہجری میں جب میرے بھائی قاسم علی نے کہ نہایت تقی وشجاع مجاہد تھا، اور میری والدہ نے انتقال کیا، میں نے کتاب دقایق الاخبار کو کہ امام حجۃ الاسلام ابوحامد محمد الغزالی نے موت کے احوال میں تصنیف کی تھی، مغلق عربی سے سلیس اردو مین ترجمہ کیا، تا فائدہ اس کا عام ہو جائے، اور ثواب اس کا میں نے ان دونوں کی روح کو بخشا، اور جو شخص اس کتاب سے فائدہ پاوے اور نفع اٹھاوے اس سے امید ہے کہ اس مغموم کو اور ان دونوں مرحوم کو اپنی دعا سے محروم نہ کرے، اور اصل کتاب میں مَیں نے کچھ کمی بیشی نہیں کی مگر بعض جگہوں میں بہ ضرورت یا بقصد اختصار اور نام اس ترجمہ کا ''صبح کا ستارہ'' ہے، اس واسطے کہ یہ زمانہ بھی آخری ہے اور اس میں اخیر وقت کا حال بھی مسطور ہے اور خلق کو اس سے ہدایت بھی حاصل ہوگی''۔

مترجم مولوی عباس علی نے اپنی زبان کو ''سلیس اردو'' کہا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی تحریر بول چال کی زبان کے مطابق اور عام فہم ہے۔ اس میں ایسے الفاظ بھی آئے ہیں جن کو بعد کے زمانے میں ترک کر دیا گیا، مثلاً:

''چھور (کنار، سرا)، کپا، (کڑاپن)، جوکھنا (تولنا)، چکنا ناوغیرہ''۔

مطبعے

انگریز ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ اپنے اس مقصد کو انھوں نے آخر تک نظر انداز نہیں ہونے دیا تھا۔ کانپور پر قابض ہو جانے کے بعد انھوں نے اس مقام کو نہ صرف کیمپ (فوجی چھاؤنی) کی حیثیت سے ترقی دی بلکہ بہت تیزی سے اسے ایک صنعتی شہر بھی بنا دیا تھا۔

کانپور کی صنعتوں کی توسیع کے لیے 1822 (1237ھ) میں ایک مطبع ''کانپور ایڈورٹائزر'' کے نام سے جاری کیا گیا لیکن اس ابتدائی دور میں وہ چل نہ سکا۔

چند سال بعد آرچر نامی ایک انگریز نے 1830 (1245-46ھ) میں ایک دوسرا مطبع قائم کیا اور اس کا نام ''مطبع مسیحائی'' رکھا۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کی دعوت پر آرچر کو کانپور سے لکھنؤ جانا پڑا اور اس طرح اس شہر میں یہ مطبع بھی جلد ہی بند ہو گیا۔

ان دونوں مطبعوں میں اردو کی کسی کتاب کے چھپنے کا تا حال ہمیں معلوم نہیں ہو سکا ہے، لیکن مطبعوں نے اس شہر میں طباعتی اداروں وغیرہ کے قیام کے لیے فضا تیار کر دی تھی۔

حواشی

(الف) کانپور کی آبادی

1-تواریخ نادرالعصر ص26,24

2-نفس اللغہ ص55

3-فسانۂ عجائب ص31تا32

4-ایضاً ص18

5-ایضاً ص32

6-تاریخ اودھ جلد4 ص354

7-تواریخ کانپور جلد4 ص44

8-ایضاً جلد3 ص39

9-قیصر التواریخ جلد2 ص190

10-خوش معرکہ زیبا جلد1 ص224

(ب) شاعری-غزل

1-سراپا سخن-سبب تالیف ص2

2-تاریخ اودھ جلد4 ص167

3-ایضاً جلد4 ص//

4-ایضاً جلد4 ص380

5-خوش معرکہ زیبا جلد2 ص332

6-ابن طوفان ص9

7-آب حیات ص358
8-فسانۂ عجائب ص39

(ج)مثنوی

1-اردو مخطوطات علیگڑھ ص345

(د)ہزل وریختی

1-خندۂ گل ص231
2-ایضاً ص232
3-سراپا سخن ص202,16
4-خندۂ گل ص340

(ہ)داستان

1-گلستان بے خزاں ص288

(و)مذہبی نثر

1-علما کا حصہ ص149 تا 162
2-ایضاً ص402 تا 404
3-ایضاً ص534 تا 540

(ز)مطبعے

(3)الہ آباد

(الف) غزل

1-ناسخ	شیخ امام بخش	114
2-نادر	کلب حسین خاں	118
3-اعظم	مرزا اعظم علی بیگ	122
4-قدسی	سید محمد جان	125
5-افضل	شاہ غلام اعظم	127
6-مظلوم	مظلوم شاہ	134
	(ب) مرثیہ	141
1-فریاد	مرزا مغل	141
	(ج) ہزل و ریختی	143
1-اعظم	مرزا اعظم علی بیگ	143
2-جولاں	سید قدرت علی	144
3-قران	مرزا حسن	144

(د) ٹھمری دوہے 145

ا-انور 146

(ہ) خطوط نویسی 147

1-حسین علی حسین 147

(و) مذہبی نثر 149

1-کرامت علی 149

2-منولال 156

(ز) تذکرے 157

1-شوکت نادری 157

2-تذکرہ ابن طوفان 158

مطبع 160

حواشی 161

الہ آباد میں نواب محمد قلی خاں برادر زادہ نواب صفدر جنگ حاکم تھے۔ ان کی دانشمندی اور تدبر سے متاثر ہو کر اہل فیض آباد نے بھی ان کو اپنا حاکم بنا لینے کا خیال کیا تھا، چنانچہ مذکور ہے کہ:

''بعض عمایدو اراکین کی یہ مشورت ٹھہری کہ اس نواب (شجاع الدولہ) کو حکومت سے خارج کر کے نواب محمد قلی خاں کو کہ الہ آباد میں مقیم تھا، بلا کر مسند حکومت پر نصب کریں، نواب بہو بیگم صاحبہ نے کہ اس کا اقتدار بہت تھا، اس ارادۂ بیجا سے اراکین ریاست کو باز رکھا، (بعد میں) مرزا پور اور الہ آباد کا صوبہ بھی شامل صوبۂ اودھ ہو گیا''۔1

نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں2 جب ملک کی تقسیم عمل میں آئی تو اعظم گڑھ گورکھپور اور صوبہ الہ آباد پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

الہ آباد کے متعلقات میں کڑا مانک پور کا خطہ بھی ہے اور جنوب میں جانے کا راستہ بھی یہی ہے۔ چنانچہ اب بھی ریواں وغیرہ کے علاقے کے لوگ یوپی کے رہنے والوں کو عموماً ''الہ آبادی'' کہتے ہیں۔ صوبہ الہ آباد کے صوبہ اودھ کے ساتھ رابطہ کا سلسلہ علاء الدین خلجی کے وقت سے بلکہ اس سے بھی پہلے سے چلا آتا ہے۔ چنانچہ یہاں کی زبان اور تہذیب پر اودھ کے اثرات زیادہ ہیں اور کسی قدر اثر ریواں وغیرہ کی بول چال کا بھی معلوم ہوتا ہے۔ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے اس شہر کے ذکر میں لکھا ہے:

''شہر الہ آباد کے موزوں طبع حضرات کے ناموں اور ان کے کچھ حالات نیز ان کے کچھ قیمتی اشعار کے بیان میں مخفی نہ رہے کہ اگرچہ شہر میں شعر و شاعری کا تذکرہ

پرانے زمانے سے ہے لیکن حضرت شاہ محمد علیم مغفور و مرحوم کی وفات کے بعد اس فن کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ چند بزرگوں نے مشاعرہ کی طرح ڈالی لیکن پانچ چھ مشاعروں سے زیادہ کا اتفاق نہیں ہوا.... مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس فن کے مشاق شاعروں اور اور نئے پرانے خوش گویوں کو تخلص کے ساتھ یاد کیا جائے اور وہ یہ ہیں:

فارسی شعرا: شہید، خلاق، نظمی، صادق، طبیب، مفتون، سید، عزیزی، خان، فائز، نزہت، عالی، جعفر، احمدی

اردو شعرا: مظلوم، فریاد، قدسی، اعظم، بیمار، افضل، احمد، مبتلا، راغب، بیدار"۔3

شعرائے اردو کی اس فہرست میں آخری دو کو چھوڑ کر باقی سب 1243ھ (28-1827) تک اس شہر میں قابل ذکر حیثیت حاصل کر چکے تھے۔

مولانا محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ شیخ ناسخ پہلی بار غازی الدین حیدر بادشاہ کے عہد میں الہ آباد آئے تھے۔ اس کے بعد کئی بار وہاں جانا ہوا۔ شاہ اجمل کے دائرے میں ان کا قیام رہتا تھا، چنانچہ خود کہتے ہیں:

ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم　　آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

آزاد ناقل ہیں کہ:

"جن دنوں شیخ ناسخ شاہ اجمل کے دائرے میں تشریف رکھتے تھے، وہاں تین گھرانے بابرکت اور صاحب دستگاہ تھے، تینوں جگہ سے وقت معمولی پر کھانا آتا تھا۔ ایک خوان بلکہ دسترخوان شاہ ابوالمعالی کی سرکار سے آتا تھا۔ اس میں ہر قسم کے امیرانہ اور عمدہ کھانے موجود ہوتے تھے۔ ایک خوان سید علی جعفر کے ہاں سے آتا تھا، کہ شاہ ابوالمعالی کی بہن ان سے منسوب تھیں۔ ایک خوان شاہ غلام حیدر کے یہاں سے آتا تھا، اس پر بھی اپنا باورچی خانہ الگ گرم ہوتا تھا۔ جس چیز کو جی چاہتا تھا پکواتے تھے"۔4

معتمد الدولہ کی معزولی کے وقت 1243ھ (28-1827) میں ناسخ کو لکھنؤ سے نکلنا پڑا تو الہ آباد میں ان کا قیام خاصا طویل رہا۔ غالباً اسی زمانے کے بارے میں سعادت خاں ناصر نے لکھا ہے:

''جن روزوں میں شیخ امام بخش ناسخ علیہ الرحمہ دائرہ میں دائر سائر تھے، شاہ صاحب کی اولاد تمام وکمال ان کی شاگردی کی مقر بلکہ شاگرد ہوئی''۔5

تقریباً اسی زمانے میں کلب حسین خاں نادر بھی اس شہر میں پہنچ گئے، انھوں نے شعر وسخن کی ترویج میں جو کوششیں کیں۔ ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''جب سے کہ ان اوراق کے جامع نے مشاعرہ کی طرح ڈالی ہے اور اس سلسلے میں جد وجہد کی ہے، اس شہر کے رہنے والے شعرا کے علاوہ بیالیس حضرات یہاں پہنچے ہیں اور اکثر مشاعرے میں شریک ہوتے ہیں۔ ان اوراق کا جامع اسی طرح سے جیسا کہ فی الحال اس ضلع کی تحصیل میں قائم مقامی پیشکار کے عہدے پر مقرر ہے، اسی شہر اور اسی عہدے پر قائم وبحال رہا تو غالب گمان یہ ہے کہ چند سال کی مدت میں ان سو کے علاوہ سینکڑوں شعرا پہنچ جائیں گے۔ اس شہر میں راقم الحروف نے دو سال سے مشاعرے کی بنیاد رکھی ہے اور وہ بدستور جاری ہے،..... پہلے تو صرف میں ہی اس ضلع میں تحصیلدار تھا اور اب میرے ایک بزرگ بھی تحصیلداری کے عہدے پر مقرر ہو گئے ہیں''۔6

کلب حسین خاں نادر بنیادی طور پر غزل گو تھے۔ ان کے مشاعروں میں بھی معمولاً غزلیں ہی پڑھی جاتی تھیں۔ ان کے اثر سے اس شہر میں اسی صنفِ شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ انھوں نے اپنا پہلا تذکرہ ''شوکتِ نادری'' کے نام سے لکھا تھا۔ اس کے بارے میں امتیاز علی خاں عرشی نے لکھا ہے:

''یہ دراصل الہ آباد کے چند شاعروں کا تذکرہ ہے اور 1247ھ (1831-32) میں لکھا گیا ہے''۔

اس تذکرے میں کلب حسین خاں نادر نے اردو کے شاعروں کا جو کلام نقل کیا ہے وہ عموماً غزل ہی ہے۔

1- ناسخ:

شیخ امام بخش ناسخ کے حالات میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:

''ایک دیوان الہ آباد میں مرتب کیا تھا، بے وطنی کا عالم، دل پریشان، غزلیں خاطر خواہ بہم نہ پہنچیں، اس لیے دفتر پریشان نام رکھا، اس میں غزلوں رباعیوں اور تاریخوں کے سوا اور قسم کے نظم نہیں، قصائد کا شوق نہ تھا، چنانچہ نواب لکھنؤ کی تاریخ وتہنیت میں بھی کبھی کچھ کہا ہے تو بطور قطعہ ہے، ہجو کے کانٹوں سے ان کا باغ پاک ہے''۔8

الہ آباد کے ایک مشاعرے کا ذکر آزاد نے اس طرح کیا ہے:

''ان (ناسخ) کے مزاج میں منصفی اور حق شناسی کا اثر تھا چنانچہ الہ آباد میں ایک دن مشاعرہ تھا، سب موزوں طبع غزلیں کہہ کر لائے تھے، شیخ صاحب نے غزل پڑھی، مطلع تھا۔

دل اب محوِ ترسا ہُوا چاہتا ہے　　یہ کعبہ کلیسا ہوا چاہتا ہے

ایک لڑکے نے سب کے پیچھے سے سر نکالا بھولی بھالی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ معرکہ میں غزل پڑھتے ہوئے ڈرتا ہے، لوگوں کی دلدہی نے اس کی ہمت باندھی پہلا ہی مطلع تھا۔

دل اس بُت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے　　خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے

محفل میں دھوم مچ گئی، شیخ ناسخ نے بھی تعریف کر کے لڑکے کا دل بڑھایا، اور کہا:

''بھائی یہ فیضان الٰہی ہے۔ اس میں استادی کا زور نہیں چلتا ہے۔ تمھارا مطلع مطلعِ آفتاب ہے۔ میں اپنا پہلا مصرع غزل سے نکال ڈالوں گا''۔9

شیخ ناسخ کے دیوان میں اس زمین میں دو غزلہ موجود ہے، لیکن جو مطلع آزاد نے ناسخ کے نام سے نقل کیا ہے وہ اس میں نہیں ہے۔ البتہ جو مطلع بچہ سے منسوب کیا گیا ہے وہ اس میں موجود ہے۔ دو غزلے کے مطلعے اور مقطعے یہ ہیں۔

وہ ہے پاس جس کو دلا چاہتا ہے　　تڑپتا ہے کیوں اور کیا چاہتا ہے

غزل سُن کے اک بوسہ دے ڈال پیارے　　یہی تجھ سے ناسخ صلہ چاہتا ہے
دل اک بت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے　　خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے
جنوں ضعف اگر یوں ہی زنجیرِ پا ہے　　تو زنداں بھی صحرا ہوا چاہتا ہے

شیخ ناسخ کے آخری بار الہ آباد جانے کا حال سعادت خاں ناصر نے اس طرح قلمبند کیا ہے:

''ایک دفعہ کی نقل ہے اوائل عہد محمد علی شاہ میں کہ شیخ صاحب کو معلوم نہ تھا کہ دفعتہ حکیم صاحب (منتظم الدولہ) داخل لکھنؤ ہوئے۔ جب کہ شیخ صاحب نے سُنا فوراً صورت اپنی بدل کر اور باناتی مرزائی وکلاہ پہن کر اور کالوان رتی کی صورت بنا کر اور کانور کندھے پر رکھ کر لکھنؤ سے پوشید ہمراہ کالوان رتیوں کے بم بم کہتے ہوئے روانہ الہ آباد ہوئے، جب یہ خبر حضرت محمد علی شاہ کو پہنچی وہ نہایت ہنسے اور حکیم صاحب سے کہہ کر شیخ صاحب کا قصور معاف کروایا، اور شقہ مہری حکیم صاحب کا بنا بر طلب بہ نام شیخ صاحب الہ آباد بھیج کر شیخ صاحب کو لکھنؤ بلایا اور شیخ صاحب کے دو سو روپیہ کی ماہواری اپنی سرکار سے جاری کی۔ پرورش اہل کمال کی اور خاوندی فرمائی۔ قدرداں ایسے ہوتے ہیں چنانچہ دو سو روپے کی تنخواہ شیخ صاحب کو مدام آن جناب سرکار شاہی سے ملا کی''۔10

اس واقعہ سے متعلق حسین علی تاسف نے جو قطعہ کہا تھا، وہ درج ذیل ہے:

''قطعہ در تاریخ گریختن ناسخ از خوف آمدنِ منتظم الدولہ (حکیم مہدی علی خاں کشمیری)''۔

خود بُلایا شہ نے اس نوآب کو با کر وفر　　دبدبہ ہے جس کی آمد کا کئی فرسنگ سے
بحر غرق کشتیِ اعدا وہ اب طوفان ہے　　بحر لشکر موجزن ہے بیشتر جو گنگ ہے
تیغ زن کیا کیا بہادر افسرانِ جیش میں ہے　　رستم دوراں نہ لاوے تاب ان کی جنگ سے
قتل و غارت، قید و ذلت کے جو واں ساماں ہوئے　　رنگِ رویاں سرکشوں کا فق ہوا ہر رنگ سے
خوف جاں سے خونیوں کا ہو گیا زہرہ ہے آب　　لشکرِ جرار جس دَم پار آیا گنگ سے
لکھنؤ سے آج بھاگا شیخ ناسخ بے حیا　　ہے دبنگی جس کا جامہ خالی عار و ننگ سے
اس کے بس چڑھتے ہی اُترا سب حکومت کا نشہ　　دل میں جو بیساختہ سرشار تھے اس بھنگ سے

سر اٹھایا تھا جنھوں نے فوجِ عرشِ اقبال کا　　وہ گئے تحت الثریٰ کو صدمۂ سرخنگ سے
دار پر اس دار میں تھے مجرمانِ سلطنت　　بے ادب خائف تھے اس کی دانش و فرہنگ سے
اس بھگوڑے کی تاسف کہہ یہ تاریخ گریز　　دُم کٹا بھینسا مگر یہ بچ گیا چورنگ سے

1253ھ

قسمت کی بات ہے ناسخ تو مفرور ہو کر بچ گئے، لیکن اسی سال رمضان کے مہینے میں خود حکیم صاحب ہفتہ عشرہ تک بیمار رہ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شیخ امام بخش ناسخ کی الہ آباد کے زمانہ قیام کی ایک غزل کے چند شعر یہ ہیں۔

لے کے خط جا شتاب اے قاصد　　جلد لے آجواب اے قاصد
کی جیو قطع راہ راتوں کو　　اے شبِ ماہتاب، اے قاصد
خط ہے اس کا بجائے خطِ شعاع　　تار ہے آفتاب اے قاصد
کوچ میں دیر کی تو گور میں مَیں　　کروں گا پا تراب اے قاصد
جلد گنگا اتر کہ زیست مری　　ہے بسانِ حباب اے قاصد
فرقت یار میں نہیں آتا　　مجھے راتوں کو خواب اے قاصد
دیتے ہیں ساکنِ الہ آباد　　مجھ کو وحشی خطاب اے قاصد
کیا کسی شغل میں بھلا پہلے　　دل ہے پُر اضطراب اے قاصد
وہم میں بھی کبھی نہ تھے یہ دن　　ہے جدائی کا خواب اے قاصد
خطِ ناسخ کا لاجواب شتاب　　ہو دعا مستجاب اے قاصد

اسی ردیف میں ناسخ کی تین غزلیں اور بھی ہیں۔ اسی شہر الہ آباد میں انھوں نے یہ غزل بھی کہی تھی۔

نامہ بر ہے، نامۂ احباب ہے　　ہائے بیداری ہے یا یہ خواب ہے
تین ترپنی، تو دو آنکھیں مری　　اب الہ آباد بھی پنجاب ہے
خط جو لکھنے میں ہُوا ہے جوشِ اشک　　بند کاغذ کا کفِ سیلاب ہے
رو رہا ہوں کیا الہ آباد میں　　دائرہ جو ہے یہاں گرداب ہے

قاصدا پرزے اُٹھا لے جیب کے یہ جواب نامۂ احباب ہے

شیخ ناسخ نے اسی سلسلے میں چھ غزلیں اور بھی کہی ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف ردیفوں میں اور بھی ایسی بہت غزلیں ہیں۔ غور کیجیے تو ان میں سے ایک غزل بھی ایسی نہیں جسے شاعر کے واقعات اور اس کی دلی کیفیات سے تعلق نہ ہو اور اسے محض تخیل کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہو۔ غزل میں مطلع سے، آخری شعر تک ایک مخصوص فضا بھی موجود ہے۔ مطالب کو سیدھے سادے لفظوں میں مدلل انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ غزل گوئی کا یہی انداز اس زمانے میں الہ آباد میں رائج ہو رہا تھا۔ غزل کے علاوہ شیخ ناسخ نے تاریخ گوئی سے بھی دلچسپی لی تھی، مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ:

''دیوان کے اخیر میں بہت سی تاریخیں ہیں اور اکثروں میں نہایت عمدہ اور برجستہ مادّے نکالے ہیں۔ شوکت الفاظ کہتی ہے کہ اگر وہ قصیدہ کہتے تو خوب کہتے، مگر افسوس کہ اس طرف توجہ نہ کی''۔11

ناسخ کے قصیدہ کی طرف توجہ نہ کرنے کی بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ اُنھوں نے لکھنؤ میں قصیدے، لکھے تھے۔ لیکن الہ آباد اور کانپور وغیرہ میں ناسخ کے حالات قصیدہ گوئی کے لیے سازگار نہیں تھے۔ البتہ ان کی تاریخ گوئی کے بارے میں آزاد کا یہ بیان صحیح ہے کہ:

''کلیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ پہر اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے، چنانچہ ان دنوں شاہ اجمل کے دائرہ میں تشریف رکھتے تھے ایک دن باورچی سے خاگینہ کی فرمائش فرمائی تھی۔ اس میں کوئی سنپولیا گرا ہوگا، چونکہ دوبارہ یہ حرکت ہوئی تھی۔ آپ نے تاریخ کہہ دی۔

جاں بلب آمد مرا از غفلت طباخ آہ ی بُود خاگینہ با مار کریہہ از بہر من

جوں دگر بارہ خطا بنمود سال عیسوی گفت دل مارِ سیہ بخت ایں سفیہہ از بہر من''12

1839

الہ آباد میں دائرہ کے پھاٹک میں بیٹھے تھے چھت میں سے سانپ گر پڑا اس کی تاریخ کہی۔

یا علی آوردہ ام پیشِ تو فریاد از فلک ی رود ہر لحظہ بر من جور بیداد از فلک

مار چوں بر سینہ ام افتاد سیال نحس آں گفت دل مار سیہ بر من بنتاد از فلک

1243ھ(1827-28)

شیخ ناسخ کے کہے ہوئے بہت سے قطعات ان کے دیوان کے علاوہ مختلف مآخذ میں بھی بکھرے پڑے ہیں۔

2-نادر:

ابنِ امین اللہ طوفان نے نادر کے تلمذ وغیرہ کا بیان ان لفظوں میں کیا ہے:

"مرزا کلب حسین خاں نادر تخلص، بہ ہنگامیکہ در لکھنؤ بہ مصاحبتِ امیرے بود از خواجہ حیدر علی آتش اصلاح می گرفت و باز در الہ آباد از شیخ ناسخ یک سال شاگردی کرد، دریں روز ہا بہ نواح غازی پور است"۔13

کلب حسین خاں نادر لکھنؤ میں کب اور کس امیر کے مصاحب رہے اور انھوں نے آتش سے کتنی مدت تک اصلاح لی تھی۔اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا ممکن نہیں ہے۔البتہ ذیل کے اقتباس سے ان کی الہ آباد میں ملازمت کا حال معلوم ہوتا ہے:

"اپنے آغازِ ایام شباب میں بہ اوسط 1826(1242ھ) ضلع الہ آباد میں بہ عنایت مسٹر جان ڈنسمور صاحب کلکٹر ابتدائے عہدہ تحصیلداری کا پایا اور قریب نو برس کے اس عہدہ کو اس خوبی اور نیک نامی سے انصرام کو پہنچایا کہ کبھی مورد عُرمانہ بھی نہ ہُوا۔ بلکہ بہ ترقی مشاہرہ ایک پرگنہ سے دوسرے پرگنہ میں تبدیل ہوتا رہا۔ نہ میں کسی پر مستغیث ہُوا اور نہ مجھ پر کسی نے کچہری میں استغاثہ کسی طرح کا کیا"۔14

اس اقتباس میں یہ بات صحیح نہیں ہے کہ نادر نے اپنی ملازمت کی ابتدا تحصیلدار کی حیثیت سے کی تھی۔صحیح یہ ہے کہ شروع میں یعنی 1243ھ(1827-28) کے قریب وہ الہ آباد ضلع کی تحصیل میں "قائم مقام پیشکار"15 مقرر ہوئے تھے،اور اسی حیثیت سے انھوں نے چند سال تک محنت اور ایمانداری سے کام کیا، پیشکار کی حیثیت سے ان کا ایک پرگنہ سے دوسرے پرگنہ میں تبادلہ بھی ہوتا رہا تھا۔نادر نے جیسا کہ مذکورہ اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے 1240ھ(1824-25) کے قریب شاعری شروع کی ہوگی، کچھ عرصہ تک لکھنؤ میں آتش سے اصلاح لیتے رہے۔پھر الہ آباد

چلے آئے، یہاں 1243ھ (1827-28) میں جب ناسخ پہنچے تو انھوں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، اور وہاں ایک برس تک ان سے فیض اٹھایا۔

1244ھ (1828-29) میں نادر کا تبادلہ ضلع الہ آباد کی تحصیل سوراوں (سوراؤں) کے لیے ہوگیا۔ انھوں نے وہاں کے شاعروں سے مراسم اور روابط قائم کیے۔ چنانچہ اپنے تذکرہ شوکتِ نادری میں ان میں سے درج ذیل کے حالات قلمبند کیے ہیں:

''طبیب تخلص، مولوی رجب علی رئیس قصبہ منّو، عملہ پرگنہ سوراوں، ضلع الہ آباد، اور فائز تخلص، مولوی روح الفیاض رئیس پرگنہ سوراوں قصبہ منّو قاضی۔''15

یہی نہیں بلکہ نادر کے پہلے دیوان میں سوراوں کے کسی مسلمان تھانے دار کی مسجد سے متعلق ''قطعہ تاریخِ تعمیر'' بھی نادر کے وہاں پر موجود ہونے کا مظہر خیال کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے یہ اشعار بھی توجہ کے لائق ہیں۔

تو جو آیا، بسا الہ آباد لکھنؤ اب خراب ہے ناسخ
بہ طفیل، تلمذ و تعلیم اک جہاں کامیاب ہے ناسخ
از برائے تلامذہ تحقیق مدح تیری صواب ہے ناسخ
دور تجھ سے جو ہوگیا نادر دل کو اک اضطراب ہے ناسخ

یعنی شیخ ناسخ کے الہ آباد آنے کے کچھ ہی مدت کے بعد نادر کو ان سے دور ہو جانا پڑا تھا اور اس دوری کا سبب ان کا یہی تبادلہ تھا۔

نادر بقول خود فرائضِ منصبی بڑی خوبی سے ادا کرتے رہے تھے۔ جس کے نتیجے میں ان کے مشاہرہ میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ 1245ھ (1829-30) میں ترقی کر کے تحصیلدار کی حیثیت سے الہ آباد میں مامور ہوگئے تھے۔ چنانچہ خود لکھتے ہیں:

''اس شہر میں راقم الحروف نے دو سال سے مشاعرے کی بنیاد رکھی ہے، پہلے تو صرف میں ہی اس ضلع میں تحصیلدار تھا اور اب میرے ایک بزرگ بھی تحصیلداری کے عہدہ پر مقرر ہوگئے ہیں''۔16

نادر اس جگہ کوئی دو برس تک تحصیلدار رہے۔ اس کے بعد 1247ھ کے اواخر (1833)

میں ان کا تبادلہ ضلع غازی پور کے لیے ہوگیا۔ جہاں وہ کوئی چھ سات برس تک مقیم رہے۔

الہ آباد کے زمانہ قیام میں نادر کی شعر گوئی کی عمر سات برس کے قریب ہوگئی تھی۔ کچھ تو یہ خیال کہ انھوں نے اس زمانے کے دونوں بہترین استادوں سے فیض پایا تھا اور کچھ نوجوانی میں طبیعت کا جوش و خروش بھی تھا۔ چنانچہ وہ سہ غزلے چہار غزلے کہہ کر اپنی مشاقی اور قدرتِ کلام کا اظہار کرتے تھے۔ شوکت نادری کے آخر میں انھوں نے لکھا ہے:

> ''اتفاقاً ایک روز یہ اوراق بعض احباب کے ملاحظے میں آئے اور انھوں نے قبول نہیں کیا۔ مجبوراً بزرگوں کے ارشادات کے پاس ولحاظ میں اپنے کچھ مہملات دیوانِ ثانی سے نقل کر کے اس رسالے میں داخل کر دیے''۔

اس تمہید کے ساتھ انھوں نے جو ''کلام نادر'' درج کیا ہے وہ ایک چوغزلہ ہے، اس کے مطلعے اور مقطعے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔

چمکے جو صاعقہ تری برق نگاہ کا — خرمن فلک پہ سوختہ ہوجائے ماہ کا
خواہاں نہ ہو جہاں میں کوئی مہر و ماہ کا — چمکے ستارہ گر مری زرّیں کلاہ کا
نادر بدل کے قافیہ پڑھتا ہے پھر غزل — کیونکر بلند شور نہ ہو واہ واہ کا
جلوہ ہے لب پہ یار کے اس طرح خال کا — کوثر پہ جیسے ہووے نشیمن ہلال کا
ہوں سرخرو، محبِ ہوں پیمبر کی آل کا — زیبا ہے گر پنھائیں کفن مجھ کو آل کا
بعدِ فنا بھی دھیان ہے اس نونہال کا — زیبا ہے گر پنھائیں کفن مجھ کو چھال کا
نادر غزل پڑھ اور بہ تبدیلِ قافیہ — شہرہ ہُوا ہے خلق میں تیرے کمال کا
اللہ رے قدر و مرتبہ عشقِ مجاز کا — محمود بادشاہ ہو بندہ ایاز کا
نادر بدل کے قافیہ پڑھ اور ایک غزل — قائل ہر ایک ہے تری طبعِ گداز کا
کرتا ہے ترکتاز جو شبد یزیار کا — منظر روندنا ہے ہمارے غبار کا
رونے میں ہے خیال جو دندان یار کا — اشکوں میں طور ہے گہر آبدار کا
ہم سے ملائیں آنکھ، نہیں حوصلہ ہے یہ — دس بیس کا، پچاس کا، سو کا، ہزار کا
نادر خدا کی یاد میں اوقات صرف کر — کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا

دیکھنے کی بات ہے کہ یہ سب غزلیں روایتی انداز کی ہیں، بول چال کی زبان میں خیالی مضامین نظم کیے گئے ہیں۔ ہر شعر میں مبالغہ کا عنصر بھی ظاہر ہے۔

نادر کے کلام کا کوئی مجموعہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں قطعات تاریخ نہ ہوں، تاریخ گوئی سے انھیں شروع سے دلچسپی رہی ہے، چنانچہ ان کے درج ذیل قطعات قابل توجہ ہیں:

" قطعہ تاریخ مسجد معمور شیخ مصطفیٰ علی صاحب الہ آبادی 1244ھ،

قطعہ تاریخ بحال شدن سید تراب علی رئیس پرگنہ مہنہ ضلع الہ آباد 1245ھ،

قطعہ تاریخ وفات سید ولایت علی فرزند سید بخش علی صاحب قاضی کڑا ضلع الہ آباد 1246ھ،

تاریخ وفات شاہ محمد اعلیٰ صاحب رئیس الہ آباد 1246ھ

تہنیت تولد فرزند سعید منشی آنند سروپ صاحب دیوان اجنٹی الیون ضلع غازی پور 1251ھ"[17]

شیخ ناسخ کے انتقال کے بعد بھی نادر الہ آباد میں ان سے اصلاح لینے کے واقعات کو یاد کرتے رہے تھے۔ کہتے تھے ؎

فاصلہ ہر چند گذرا ہے قریب اک قرن کا　　یاد اب تک لطف اصلاح الہ آباد ہے

الہ آباد کے زمانۂ قیام میں نادر نے بہ گمانِ غالب تاریخوں اور غزلوں کے سوا اور کچھ نہیں کہا تھا۔ شعر و سخن کے فروغ سے متعلق اپنی ساری کوششوں کے باوجود غالباً پورب کے علاقوں میں رہنے کی وجہ سے نادر کو زیادہ شہرت حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ چنانچہ گلشنِ بے خار میں بھی ان کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ ابن طوفان نے ان کے پندرہ شعر نقل کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں ؎

دل میں ہوس زلف چلیپا نہیں رکھتے　　ہم سر نہیں رکھتے کوئی سودا نہیں رکھتے

ہم دیکھ لیا کرتے ہیں اے جان دروں سے　　گو روزن دیوار کو تم وا نہیں رکھتے

اعلیٰ کو اسفلوں سے پہنچتا نہیں گزند　　شبنم سے ایک دن بھی نہ دیکھا تر آفتاب

مو باف سے تمامی کے بیتاب برق کی　　دکھلایا رُخ جو تم نے ہُوا مضطر آفتاب

رہا جو رات کو وہ سبزہ رنگ چھاتی پر　　ہرے ہوئے مرے زخمِ خدنگ چھاتی پر

3-اعظم

پروفیسر شبیہ الحسن نے سعادت خاں ناصر کے ایک غلط بیان پر اعتماد کر کے بغیر تحقیق کیے یہ لکھ دیا ہے کہ:

"الہ آباد میں ان (ناسخ) کے شاگردوں کے زمرہ میں شامل نہ ہونا ایک قابل ذکر واقعہ بن گیا"۔18

بے شک کلب حسین خاں نادر نے خواجہ آتش کو چھوڑ کر ناسخ کی شاگردی اختیار کی تھی لیکن اس کی وجہ صاف تھی۔ وہ آتش سے دور ہو گئے تھے، اور اب جہاں تھے وہاں پر خود ناسخ پہنچ گئے تھے۔ ناسخ کی موجودگی کے باوجود الہ آباد میں جو شاعر دوسرے استادوں کے شاگرد تھے وہ بدستور اپنے استاد سے وابستہ رہے تھے۔ چنانچہ تذکرہ شوکت نادری میں آتش کے دو شاگردوں کا حال درج ہے، یعنی:

مرزا اعظم علی اعظم اور سید محمد جان قدسی

یہ دونوں آخر تک آتش سے ہی وابستہ رہے، یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ قدسی شاہ اجمل کے نواسے تھے، ایک فریاد کے بارے میں ضرور نادر کا بیان یہ ہے کہ:

"میاں مصحفی صاحب کے شاگردوں میں سے ہیں، اور نیز چند روز تک اپنی غزلیں استاد زماں جناب شیخ امام بخش ناسخ کی خدمت میں گذران کر کافی فائدہ اٹھایا ہے"۔19

یہاں بھی وجہ وہی ہے کہ فریاد لکھنؤ سے الہ آباد آ گئے تھے، اور یہاں ناسخ موجود تھے، پھر جب شیخ مصحفی کا انتقال ہو گیا تو یہ باقاعدہ ناسخ کے شاگرد ہو گئے تھے۔ چنانچہ محسن نے لکھا ہے کہ:

"مرثیہ میں شاگرد میاں افسردہ، غزل میں شاگرد شیخ ناسخ"۔20

نادر نے اعظم کو الہ آباد کے ان شاعروں میں شمار کیا ہے جو 1243ھ (1827-28) تک معروف ہو چکے تھے۔ ان کے تعارف میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

"مرزا اعظم علی نام شہر الہ آباد کے ایک محلہ خلد آباد کے قدیم باشندوں اور جناب خواجہ حیدر علی آتش کے شاگردوں میں ہیں، اگرچہ فکرِ معاش کی وجہ سے شعر کی فرصت نہیں

پاتے لیکن ان کے فکر کی بلندی کے اوصاف بیان کرنے میں زبانِ قلم اپنے عجز کا اعتراف کرتی ہے"۔21

اور امین طوفان نے بھی ان کے کلام کے بارے میں اس طرح رائے زنی کی ہے:

"مرزا اعظم علی بیگ، اعظم تخلص، از ساکنانِ بلدۂ ارم بنیاد الہ آباد، سخنش پاکیزہ و بجست وعبارت ومضمونش بہتر ودرست، مدتے ہم بہ مصاحبت صاحبانِ ہنر ومحبت کسان پُر جوہر بسر ساختہ وبہ شعر گوئی ہوسہا در باختہ، فصاحت کلامش از برکتِ مصحفی است، یعنی شاگرد آتش است"۔22

محسن نے ان کے بارے میں دو قابل توجہ اطلاعات قلمبند کی ہیں یعنی:

"اعظم تخلص، صدر دیوانی آگرہ، مرزا اعظم علی بیگ، باشندۂ الہ آباد، صاحب دیوان، شاگرد خواجہ حیدر علی آتش"۔23

آگرہ میں حکیم قطب الدین باطن کو ان کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ انھوں نے ان کے قیامِ آگرہ کے زمانہ کے حالات اس طرح لکھے ہیں:

"اعظم تخلص، مرزا اعظم علی نام از ارشد تلامذۂ خواجہ حیدر علی آتش، متوطن الہٰ آباد، عملۂ صدر میں بہ عہدۂ محرری ممتاز ہیں، عرصۂ دراز ہوا کہ عاصی کو بھی ان کے خادموں کی خدمت میں بہ عقیدۂ صدق وبہ درجۂ احسن نیاز ہے، سن شریف قریب شصت سال، لاغر تن، کشیدہ قامت، خوش حال، فکر ان کی بہ طرز خوش، ہمیشہ بہ محفلِ مشاعرات تشریف لاتے ہیں اور اشعار طبع زاد طرح سے گوش سامعین کو مسرت اندوز فرماتے ہیں، اکثر شائقین بہ صیغۂ شاگردی مستفید ہیں، اور ان کے بہت سے شاگرد رشید ہیں"24

باطن نے ان کے دیوان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس لیے محسن کی تحریر پر اعتماد کر کے کہا جا سکتا ہے کہ وہ 1269ھ (1853) سے پہلے کسی وقت مرتب ہو چکا تھا۔ لیکن پہلی بار 1285ھ (1868) میں منشی سدا سکھ لال کے اہتمام میں مطبع نور الابصار میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ خاتمہ کی عبارت اس طرح ہے:

''الحمدللہ کہ یہ دیوانِ سحر بیان افسرِ کشورِ شاعری، قیصرِ قصرِ سخنوری، معظم ومکرم سید
اعظم علی صاحب متخلص بہ اعظم، رئیسِ بلدۂ فاخرہ الٰہ آباد، محلہ خلد آباد مطبوع ہوکر
ختم ہوا، تمام شد''۔24

شاعر نے اپنے اکثر مقطعوں میں ایسے مضامین باندھے ہیں جن سے ان کی سیادت کا پتہ چلتا ہے، بعض غزلوں میں اُس نے قطعے بھی شامل کیے ہیں مثلاً

ملک پکارتے ہیں یا محمدؐ عربی — کہ کوئی آپ سا خضرِ رہِ ثواب نہیں
ثبوت اِس کا ہے معراج کی حدیثوں میں — جناب آپ کی کیوں کر فلک جناب نہیں
درِ قبول پہ جانے کی دہر ہے اعظم — دعا وہ کون سی ہے جو کہ مستجاب نہیں

پورے دیوان میں صرف ایک سہ غزلہ اور پانچ دوغزلے ہیں۔ ایک غزل بطور مربع کہی ہے۔ چنانچہ کچھ شعر یہ ہیں۔

جو وطن میں مَیں نہ رہا — تو فضا سے تھی مرا بَن نہ رہا
جو جہاں میں مَیں خستہ بدن نہ رہا — گل داغ جنوں کا چمن نہ رہا
مرے یمنِ قدم سے تھی جلوہ گری — مجھے کہتے تھے رونقِ شہر سبھی
جو سکونتِ خاص مری نہ رہی — تو وہ حالِ سوادِ وطن نہ رہا
مجھے اہلِ وطن سے گزند ہوئی — مجھے رسم جنوں کی پسند ہوئی
مجھے چشم غزال کمند ہوئی — مرے دل کو خیال وطن نہ رہا
نہیں اعظم خستہ جگر کی خبر — کہ نکل گیا وحشتِ دل سے کدھر
پھرے اُس کی تلاش میں شام وسحر — کوئی دشت وجبال وچمن نہ رہا

اعظم نے ایک غزل در صنعتِ غیر منقوطہ بھی کہی ہے۔ اس میں اعظم کے بجائے تخلص اعلا لظم کیا ہے۔ پانچ شعر یہ ہیں۔

اس کو گر ہو سرِ عطا ہمدم — کوہ کا کوہ ہو طلا ہمدم
مالکِ ملک اور کو کردو — ہم کو ورکا کرو گدا ہمدم
وصلِ دلدار ہو، الم ہو دور — ہو اگر طالعِ رسا ہمدم

عدلِ عادل دوا ہُوا دل کا داد رس، درد رس ہوا ہمدم
دل اعلا کو ہرطرح ہوگا آلِ احمدؐ کا آسرا ہمدم

غالباً آگرے میں رہنے کی وجہ سے اعظم نے مرزا اسد اللہ خاں غالب کی کئی زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ایک غزل کا مطلع اور مقطع یہ ہے۔

پڑ گیا داغ رُخِ مہ میں قمر ہونے تک لگ گیا عیب بڑا اہلِ ہنر ہونے تک
شان رزّاقی رزّاق تو دیکھو اعظم رزق مقسوم دیا زیست بسر ہونے تک

اگر خود اعظم نے تصرّف نہیں کیا ہے تو اس سے غالب کی غزل کی ردیف کی صحیح صورت متعین کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے۔

اعظم الہ آباد کے رہنے والے تھے۔انھوں نے اپنے کلام میں مقامی الفاظ کو بے تکلف صَرف کیا ہے،مثلاً۔

معرکہ میں کہو حاسد سے کہ سر نہوڑائے گذر اعظم شمشیر زباں ہوتا ہے

اعظم کی غزلیں روایتی انداز کی ہیں، وہی خیالی مضامین جو قدما کے وقت سے نظم کیے جارہے تھے۔انھوں نے بھی نظم کیے ہیں،واقعات کے بیان میں بھی وہی انداز اختیار کیا ہے مثلاً کہتے ہیں۔

لکھنؤ میں کام کیا تھا اعظم دیندار کا لے گیا تھا عشق اک بُت کا الہ آباد سے

اعظم کے دیوان میں غزل کے سوا اور کچھ نہیں ہے، نہ مخمس وغیرہ ہیں،اور نہ قطعاتِ تاریخ، شاید انھیں غزل کے سوا کسی صنف کی طرف توجہ کا موقع نہیں ملا۔

4-قدسی

نادر نے ان کو بھی اُن شاعروں میں گِنا ہے جو 1243ھ (1827-28) سے الہ آباد میں نام پا چکے تھے،اپنے پہلے تذکرے میں انھوں نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"آپ کا نام سید محمد جان ہے،اور حضرت شاہ محمد اجمل مرحوم کے نواسے ہیں، جناب خواجہ حیدر علی آتش سے شاگردی کا شرف حاصل ہے،آپ کی طبعِ رسا اس فن کے نہایت مناسب واقع ہوئی ہے،اور آج کل اپنی فکرِ بلند کے ذریعہ داد سخن دے رہے

ہیں، اور جواہرِ معانی کے عمدہ پرونے والوں میں آپ کا شمار ہے، اس شہر میں نظم اردو
میں بہت کم اپنی نظیر رکھتے ہیں"۔25

ابتدائی زمانے کے ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

یاد آتی ہیں کافر جو ملاقات کی راتیں　　کٹتی کسی عنوان نہیں برسات کی راتیں
تم چاندنی راتوں کے مزے لوٹو حریفو　　آجائیں گی اپنی بھی کبھی گھات کی راتیں
گہہ برق کا صدمہ ہے، کہیں رعد فلک کا　　برسات کی راتیں ہیں کہ آفات کی راتیں

قدسی کا اصل نام تو سید محمد اکبر تھا۔ لیکن بہ گمانِ غالب اپنے تخلص کی وجہ سے وہ محمد جان کے عُرفی نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ چنانچہ محسن کی تحریر سے ظاہر ہے:

"قدسی سید محمد اکبر عرف شاہ محمد جان قدسی ولد شاہ علی جعفر، دخترزادہ حضرت شاہ اجمل
علیہ الرحمہ اجمل، باشندۂ الہ آباد، وائرہ شاہ اجمل، واسطے سیر کے لکھنؤ میں آئے تھے،
اصلاح شعر کی خواجہ حیدر علی آتش سے لی، صاحب دیوان"۔

نادر کے قدسی کے ساتھ اچھے روابط تھے۔ چنانچہ قدسی کا بیٹا پیدا ہوا تو نادر نے قطعۂ تاریخ کہا:

"قطعہ تاریخ تہنیت ولادت سید علی اکبر فرزند ارجمند سید محمد جان قدسی"27

1253ھ(1837)

لیکن خود قدسی کا کوئی کلام بجز چند غزلوں کے دستیاب نہیں ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے دوسری اصناف کی طرف توجہ کی تھی، یا اعظم کی طرح "یک فنہ" ہی رہے۔

بہرنوع شیخ ناسخ کے ساتھ اپنے اعزا کے روابط کے باوجود انھوں نے اپنے استاد خواجہ آتش کا دامن چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔ قدسی کی ایک اور غزل نمونہ کے طور پر نقل کی جاتی ہے۔

لگائے جو ترے گیسوئے پُرشکن میں ہاتھ　　شمیمِ مشک لگے گلشنِ ختن میں ہاتھ
یہ تاج نور ہے یا شمع ہے تہہِ فانوس　　نہاں ہیں یا مرے دلبر کے پیرہن میں ہاتھ
تمام عمر ہی جامہ دری میں گذری ہے　　قرار سے رہیں کیونکر مرے کفن میں ہاتھ
تری بلائیں نہ لیں، پاؤں بھی نہیں دابے　　یہ ہم سمجھتے ہیں، بیکار ہیں بدن میں ہاتھ

تسلّی دلِ بلبل ہوئی ہے اے قدسی ہوئے ہیں قطع جو صیاد کے چمن میں ہاتھ

یہ بات دیکھنے کی ہے کہ قدسی نے اپنی غزلوں کے لیے ردیف کے انتخاب میں اہتمام کیا ہے اور ان کے یہاں ایسی غزلیں موجود ہیں جن میں مطلع سے مقطع تک ایک متعین فضا ملتی ہے۔

5-افضل

ایک موقع پر سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں لکھ دیا ہے:

''جن روزوں میں شیخ امام بخش ناسخ علیہ الرحمہ دائرہ میں دائر سائر تھے شاہ (اجمل) صاحب کی اولاد تمام وکمال ان کی شاگردی کی مقر بلکہ شاگرد ہوئی''۔28

لیکن اس کے اس بیان کی صحت کسی طرح ثابت نہیں ہوتی۔ شاہ اجمل کی اولاد میں افضل واحد شخص ہیں جن کا ذکر ناصر کے تذکرے میں ناسخ کے شاگرد کی حیثیت سے آیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

''درویشِ کامل بلکہ اکمل، شاہ غلام اعظم، تخلص افضل، پسر شاہ خلیل ابو المعالی نبیرۂ شاہ اجمل صاحب دائرہ الہ آباد، پہلے شاگرد ناسخ کے تھے، اب میر علی اوسط رشک ان کے استاد''۔29

کلب حسین خاں نادر کے بیان کے مطابق افضل بھی الہ آباد کے 1243ھ سے پہلے کے شاعروں میں سے تھے۔ ان کے تعارف میں نادر نے لکھا ہے:

''آپ کا اسم گرامی شاہ غلام اعظم ابن شاہ ابو المعالی ابن شاہ حضرت محمد اجمل الہ آبادی نور اللہ مضجعہٗ ہے، اس عظیم المرتبت خاندان کے بزرگ ہیں جو نہایت مشہور ہونے کی بنا پر دوپہر کے سورج کی طرح اظہار سے مستغنی ہے، شعر و شاعری باپ دادا سے ورثہ میں ملی ہے، پہلے بزرگوں میں سے ہر ایک اپنے زمانے میں علم استادی بلند کیے ہوئے تھا، اس زمانہ میں یہ حضرت اس فن میں اور دوسری صفاتِ قدسیہ اور کمالات عالیہ میں گویا اپنے بزرگوں سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں، جس نے ان کی بابرکت صحبت پائی، اس نے گویا ان کے پہلے بزرگوں کی زیارت کر لی، اگر ان کی طبع ہمایوں فکرِ سخن کی طرف مائل ہوتی ہے تو اچھے اچھے مصرعے اور دل پسند اشعار کہتے ہیں''۔30

عجیب بات یہ ہے کہ نادر نے ان کو شعرائے اردو میں شمار کیا ہے لیکن ان کے اردو اشعار کے بجائے فارسی کے دو شعر نقل کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افضل کا فارسی کلام نسبتاً زیادہ مقبول تھا۔

کہا گیا ہے کہ ناسخ جب الہ آباد جاتے تھے، دائرے میں شاہ ابوالعالی کے مہمان ہوتے تھے۔ غلام اعظم بچپن سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے ہوں گے، شعر و سخن سے متعلق گفتگو شروع سے کان میں پڑتی رہی ہوگی، چنانچہ خود بھی کم عمری میں کچھ کچھ کہنے لگے ہوں گے، ناسخ سے تلمذ کی حکایت اس طرح بیان کی گئی ہے:

> "شاہ (افضل) صاحب کی شاگردی کا واقعہ ناسخ کے ساتھ حضرت (محمد عبدالعلیم آسی) اس طرح بیان فرماتے تھے کہ جب حضرت ناسخ الہ آباد تشریف لائے تو حضرت افضل کی ذہانت پر عاشق ہو گئے، شاہ صاحب موصوف پیشتر ایک میاں جی کے شاگرد تھے، جو بیجو گوئی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے، میاں جی صاحب کے خوف سے ناسخ کی ہمت نہیں پڑتی تھی، کہ شاہ صاحب کو اپنا شاگرد بنائیں، ایک روز حضرت ناسخ پانچ روپے کی مٹھائی اور دو سو روپیہ نقد لے کر میاں جی صاحب کے پاس حاضر ہوئے، عرض کی کہ میں شاگرد ہونے آیا ہوں، میاں جی آدمی بہت مفلس تھے، دو سو روپے کی کثیر رقم پا کے بہت خوش ہوئے، جب وہ نذرانہ قبول کر چکے تو ناسخ نے دست بستہ عرض کیا کہ افضل کو مجھے دے دیجیے، میاں جی نے فرمایا کہ بڑا دھوکہ ہوا، وہی تو مجھے ایک لڑکا ملا ہے، تم درویش ہو، جان درویش، افضل کو ناسخ کے حوالہ کیا"۔

اس قصہ میں "میاں جی" کا نام یا تخلص نہیں بتایا گیا ہے۔ الہ آباد میں ناسخ غریب الوطن تھے۔ اتنی بڑی رقم پیش کر دینا عملاً ان کے لیے بہت مشکل تھا۔ اگر ناسخ نے تفریحاً بھی اس قسم کا کسی شخص سے معاملہ کیا ہوتا تو ان کے مخالفین اس کا ذکر کر سکتے تھے۔ غرض مختلف وجوہ سے اس قصہ کی صحت کو قبول کرنے میں طبیعت کو تامل ہے۔ بظاہر شاہ غلام اعظم افضل نے 1243ھ (1827-28) میں یا اس کے بعد کسی وقت ناسخ کی شاگردی اختیار کی ہوگی، تعجب اس پر ہے کہ ابن امین اللہ طوفان نے بھی افضل کا ذکر نہیں کیا ہے۔

وہ زمانہ اور تھا، شاگردوں اور چھوٹوں کی تربیت کے انداز بھی اور تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ایک دلچسپ واقعہ اس طرح نقل کیا ہے:

''شاہ غلام اعظم افضل ان (ناسخ) کے شاگرد اکثر حاضرِ خدمت ہوتے تھے، ایک دن آپ تخت پر بیٹھے تھے، اس پر سیتل پاٹی کا بوریا بچھا تھا، افضل آئے وہ بھی اس پر بیٹھ گئے، اسی پر سیتل پاٹی کا ایک تنکا موڑ کر چٹکی سے توڑنے مروڑنے لگے، شیخ صاحب نے آدمی کو بلا کر کہا کہ بھائی وہ آج جو نئی جھاڑو بازار سے لائے ہو، ذرا لے آؤ، اس نے حاضر کی، خود لے کر شاہ صاحب کے سامنے رکھ دی، اور کہا: ''صاحبزادے اس سے شغل فرمایئے، فقیر کا بوریا آپ کے تھوڑے سے التفات سے برباد ہو جائے گا، پھر اور سیتل پاٹی اس شہر میں کہاں ڈھنڈتا پھروں گا، وہ بیچارے شرمندہ ہو کر رہ گئے''۔ 32

معزز شاگرد کی تربیت مقصود تھی۔ ذلیل کرنا منظور نہیں تھا۔ اس لیے جھاڑو ملازم سے لے کر خود اس نوجوان کے سامنے رکھی، نوکر کے ہاتھ سے نہیں دلوائی۔ یہی باتیں ہوتی ہیں جو دلوں میں احترام اور محبت پیدا کر دیتی ہیں، ایک اور واقعہ اس طور پر نقل کیا گیا ہے:

''ایک مرتبہ جب شاہ صاحب لکھنؤ تشریف لے گئے تھے، تو ناسخ سے اجازت مانگی کہ اگر آپ فرمائیں تو حضرت آتش سے مل آؤں، ناسخ نے اجازت دے دی، اور یہ الفاظ فرمائے کہ دیکھو وہ بڈھا کامل الفن ہے، اس کے کسی شعر پر اعتراض نہ کرنا، چنانچہ حضرت آتش مغفور کے پاس تشریف لے گئے، رسمِ تعارف کے بعد شاہ صاحب نے غزل سنانے کی فرمائش کی، آتش نے یہ مطلع پڑھا۔

حُسن سے قدرت خدا کی رو نظر آیا مجھے ریشِ پیغمبر ترا گیسو نظر آیا مجھے

شاہ صاحب نے لاحول پڑھا، آتش خاموش ہو گئے، پھر کوئی شعر نہیں سنایا، جب واپس آئے تو ناسخ سے قصہ سنایا، ناسخ نے کہا میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ بڈھا کامل الفن ہے، اس پر کوئی اعتراض نہ کرنا، حضرت (محمد عبدالعلیم آسی) فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب نے آتش کے شعر کو معشوقانِ مجازی کی تعریف میں سمجھا، اس وجہ سے ریشِ پیغمبر کی تشبیہ پر برافروختہ ہو گئے، حالانکہ آتش نے امام حسین علیہ السلام کی

منقبت میں فرمایا ہے"۔33

تعجب ہے کہ ناسخ کی تاکید کے باوجود مجلس کے آداب کو بالائے طاق رکھ کر افضل نے آتش کے مطلع پر لاحول پڑھا۔ خصوصاً اس وقت جبکہ خواجہ آتش نے ناسخ کے شاگرد اور اپنے مہمان کی حیثیت سے ان کے ساتھ رعایت اور شفقت کا سلوک بھی روا رکھا تھا۔ یہ بات بھی حیرت کی ہے کہ ناسخ کا شاگرد جو اپنے عہد کے شعری مزاج سے بھی واقف تھا۔ اس نے شعر کے سمجھنے میں ایسی فاحش غلطی کیوں کی۔ میر علی اوسط رشک، شیخ ناسخ کے ایسے محبوب شاگرد تھے جو مکزر الہ آباد گئے تھے اور جن سے بالیقین افضل کے روابط قائم ہو چکے تھے۔ چنانچہ افضل نے ان سے تلمذ بھی اختیار کیا تھا، انھوں نے اپنی شاعری کے بارے میں دوٹوک انداز سے کہا تھا کہ ؎

اب شراب حلال پیتا ہوں　　جام ہے چائدان، چائے شراب
کوثر و سلسبیل پر اے رشک　　میرا ساقی مجھے پلائے شراب

اور ؎

مست تیری شراب شرع کا ہوں　　ہے یہاں آب سلسبیل شراب
یا علی مجھ سے گرم جوشی کی　　نہ نکالے کوئی سبیل شراب
رشک جامِ مے محبت کی　　پئے اے قادر جلیل شراب

اور ؎

میرا معشوق وہ محبوب خدا ہے اے رشک　　جس کے بھائی کے تھے سلمان وابوذر عاشق

کم وبیش یہی نقطہ نظر الہ آباد اور کانپور وغیرہ مراکز کے شاعروں کے کلام میں اس زمانے میں معمولاً رائج رہا ہے۔

شاعر اگر صاحب استطاعت ہو تو اس کا شوق مشاعروں کے انعقاد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ افضل بھی اپنے یہاں مشاعروں کا اہتمام کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ محمد عبدالعلیم آسی نے ذکر کیا ہے:

"حضرت ناسخ کے دوران قیام الہ آباد میں شاہ صاحب کے یہاں مشاعرہ ہوا، طرح کی زمین تھی، خنجر چاندنی، ناسخ کی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

دھوپ بہتر، بَر شبِ فرقت کی بدتر چاندنی صاعقے کے طور سے پڑتی ہے مجھ پر چاندنی"34

اس غزل میں ناسخ نے ردیف کے لیے جو لفظ اختیار کیا ہے اس میں غزل کا عنوان بن جانے کی صلاحیت بخوبی موجود ہے اور اس طور پر غزل گوئی کا کانپور میں چلن ہو چکا تھا ناسخ کی غزل کا یہ مطلع اس حقیقت کی غمازی کر رہا ہے کہ الہ آباد میں بھی یہ طرز رواج پانے لگا تھا۔ بعد کے تذکروں میں افضل کا جو کلام نقل ہوا ہے وہ اسی نئے انداز کا ہے۔ مثلاً محسن کے تذکرے میں تین غزلیں نقل ہوئی ہیں، ان کا ایک ایک شعر یہاں لکھا جاتا ہے۔

یہ شرارے ہیں کہ آتے ہیں نظر آنکھوں میں ساتھ اشکوں کے نہیں لختِ جگر آنکھوں میں
فیضِ عکسِ رُخ سے ہے تو قیر پشت آئینہ رنگ دکھلاتی ہے جو تصویر پشت آئینہ
ہے بادشاہ مملکتِ دو جہاں سے عشق عرش آشیاں ہُوا ہے ہمارا ہمارے دل

یہ آخری شعر لائقِ توجہ ہے، اس میں معشوقانِ مجازی کے بجائے "بادشاہِ مملکتِ دو جہاں" سے عشق کا اظہار کیا گیا ہے۔ عشق کا یہ نقطۂ نظر خود الہ آباد کے ان شعرا کے نظریہ سے بھی الگ ہے جو "دائرے" کے باہر تھے۔

شیخ ناسخ جب الہ آباد سے واپس ہوئے تو افضل کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا کہ اب وہ کس سے اصلاح لیں چنانچہ ان کی درج ذیل غزل لائقِ توجہ ہے۔

اے جانِ جاں وصال سے یا شاد کیجیے یا بندگی سے بندے کو آزاد کیجیے
آتا ہے جی میں فرقتِ دلدار سے یہی سر پیٹ پیٹ لیجیے، فریاد کیجیے
عاشق ہیں ہم، اٹھائیں گے سب اپنی جان پر جو ظلم دل میں آئے سو ایجاد کیجیے
قمری کو اپنے عشق کا پہنائیے جو طوق تو راستی سے سرو کو آزاد کیجیے
دامن سے جھاڑیے نہ ہمارے غبار کو اے جان اس طرح سے نہ برباد کیجیے
مدت سے باریابِ تکلم نہیں ہوئے بوسہ زبان کا ہمیں امداد کیجیے

قطعہ

ہے غیر سے تو یادِ فراموش کا مزا کب کہتے ہیں یہ ہم، نہ انھیں یاد کیجیے
ہے التماس اتنی کہ اے جانِ سہو سے بھولے ہوؤں کو بھی تو کبھی یاد کیجیے

جچتا نہیں ہے کوئی بھی افضل نگاہ میں ناسخ کو چھوڑ کر کسے استاد کیجیے

اس غزل کے بیشتر شعر اس امر کی غمازی کر رہے ہیں کہ افضل کو اپنے استاد ناسخ سے دوری کا ملال تھا اور اس غزل کے ذریعہ سے وہ گویا ملاقات کے لیے عرض داشت پیش کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ناسخ کے الہ آباد سے چلے جانے کے بعد بھی افضل بذریعہ مراسلت ان سے استفادہ کرتے اور اصلاح لیتے رہے، لیکن جو بات بالمشافہ گفتگو اور بالمواجہ اصلاح میں ہے، وہ مراسلت سے پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ یوں بھی لکھنؤ اور الہ آباد کے حالات اور شعری ماحول میں بہت فرق تھا، لکھنؤ میں چھوٹے بڑے متعدد درباروں کے قیام کے نتیجہ میں امرا کے مابین چشمک، نمود ونمائش اور مسابقت کے جذبات بہت ترقی پر تھے۔ وہاں محبوب "قابل خرید شے" بن گیا تھا، اور اسی صورت حال نے واسوخت کی صنف کو فروغ بخشا تھا۔ الہ آباد میں معاملات مختلف تھے۔ باوجود اس کے افضل چونکہ لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے، وہاں کے شعری مزاج سے غیر متاثر نہیں رہ سکے، غزل مذکور میں بھی کہیں کہیں واسوخت کا انداز جھلکتا معلوم ہوتا ہے۔

افضل کی زبان ناسخ کے بعض معتبر شاگردوں کی زبان سے مطابقت رکھتی ہے۔ چنانچہ اسی غزل میں:

(الف) "التماس" مونث نظم ہوا ہے، میر رشک نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔

صنم پرست ملیں یا خدا شناس مجھے دعائے وصل کی رہتی ہے التماس مجھے

اور یہی موقف جلال کا بھی تھا۔35 اس کے برخلاف دہلی کے بعض شاعر اسے مذکر کہتے ہیں، مومن کا مصرع ہے ع کروں التماس اپنے حاجات کا

(ب) پانچویں شعر میں افضل نے "پہنایئے" نظم کیا ہے۔ یہ بھی میر رشک کے ضابطے کے مطابق ہے چنانچہ کلب حسین خاں نادر نے لکھا ہے:

"پہنانا بمعنی پوشانیدن.... میر (رشک) صاحب نے اس کو ترک کیا ہے، اور فرماتے ہیں کہ بعد..... بائے فارسی کے ہائے ہوز کا ہونا ضروری ہے"۔36

(ج) اگرچہ اس غزل میں ردیف ایسی اختیار نہیں کی گئی جس کے کسی جزو کو اس کے لیے عنوان مقرر کیا جا سکے، لیکن پوری غزل کا ماحول یکساں ہے۔ یہی نہیں بلکہ شاعر نے اس میں قطعہ

شامل کر کے ربطِ کلام کی صورت کو زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔

شیخ ناسخ میر رشک سے محبت کرتے تھے اور انھوں نے اپنے بعض شاگردوں کو خود میر رشک کے سپرد کر دیا تھا اگر چہ افضل کے معاملے میں اس عمل کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں ہے لیکن اس امر میں شبہ نہیں کہ ان کو ناسخ سے کسبِ فیض کا موقع بہت زیادہ نہیں ملا تھا اور وہ ناسخ کی شاگردی کے زمانہ میں اپنا دیوان بھی مرتب نہیں کر سکے تھے۔ انھوں نے اپنا پہلا دیوان میر رشک سے تلمذ کے زمانے میں مرتب کیا تھا۔ جو بہ گمانِ غالب تمام و کمال میر رشک کی اصلاح سے مزین تھا۔ منیر شکوہ آبادی نے اس کے لیے یہ دو قطعے کہے تھے:

''تاریخ ختم دیوان شاہ غلام اعظم صاحب افضل الہ آبادی''۔

دیوان یہ افضل سخن رس کا ہے ہر صفحہ ہے نسخۂ کرامت دیکھو
ہر بیت کو ایک بیت ابرو جو کہو ہر مصرع ترے سروِ جنت دیکھو
ہر مطلعِ نو ہے مطلعِ مہرِ فلک مضمونوں میں جلوۂ فصاحت دیکھو
ہر نقطہ ہے دُرِ صدفِ فضل و کمال معنی میں تجلیِ لطافت دیکھو
تاریخ منیر سے کہی ہاتف نے دیوانِ گلستانِ فصاحت دیکھو

1256ھ(1840)

دیگر

دیوان افضل سخن داں ہے یہ یا غنچۂ بوستانِ جنت یہ کھلا
کہتا ہے منیر اور تاریخ اس کی پاکیزہ گلستانِ فصاحت یہ کھلا

1256ھ

ان قطعات میں منیر نے افضل کو ''سخن رس'' اور ''سخن داں'' اور ان کے دیوان کو ''گلستانِ فصاحت'' کہا ہے۔ معنی کی لطافت اور مضامین کی پیشکش میں فصاحت کو اس دیوان کی قابلِ توجہ خصوصیات میں شمار کیا ہے۔ یہ صورت حال ابتدائی منزل پر تھی۔ زمانۂ مابعد میں افضل نے جو ترقی کی تھی، اس کا حال آگے قلم بند کیا جائے گا۔

6-مظلوم

سعادت خاں ناصر کو جو معاصر تذکرہ نویس تھا۔ ان کے بارے میں بڑی غلط فہمی رہی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ:

"اولاد شاہ اجمل صاحب دائرہ.... اس عزیز نے میاں مصحفی کی محنت کو ضائع نہ کیا اور دائرۂ جمعیتِ نامخ سے خارج رہا"۔37

اس اقتباس میں جو باتیں کہی گئی ہیں سب غلط ہیں۔ کلب حسین خاں نادر نے مظلوم کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"مظلوم.... غلام حسن ملقب بہ..... مظلوم شاہ، اصل وطنش متصل.... پنجاب مدتے معتد در لکھنؤ بہ خدمتِ میاں مصحفی بودہ و در تلمذِ ایشاں گوئے سبقت ربودہ، از عرصۂ پانزدہ سال دریں شہر رسیدہ، باصبِ فروغِ فن شعر کہ بہ اندراس رسیدہ بود گردید، مردِ متوکل است و دریں فن کامل، راقم نقوشِ غریبہ است و ناظم جواہرِ عجیبہ، معنی یاب و دقت آفریں است"۔38

نادر نے اپنا پہلا تذکرہ "شوکت نادری" 1247ھ (1831-32) میں مکمل کیا تھا۔ اس بنا پر خیال کیا جا سکتا ہے کہ مظلوم 1232ھ (1817) کے قریب الہ آباد آ گئے تھے۔ نادر نے جو لکھا ہے کم و بیش وہی باتیں ابن طوفان نے بھی تحریر کی ہیں۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

"مظلوم شاہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ، مظلوم و مخدوم المنقطع مردم بہ منش و جہاندیدہ، شیریں کلام، کلیم آسا خدائے جمال و جلال بدیشا بہ لسانش عطا گردانیدہ، سوطن مبارکش در قرب و جوار بارہہ، از مدتہا بہ ایں اطراف آمدہ، چندے بہ سیر و صحبتِ لکھنؤ گذرانیدہ واز عمرے سکونت پذیر الہ آباد گردیدہ، مشورۂ شعر بہ مصحفی بود"۔39

ان دونوں بیانوں کو مطابق کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مظلوم جن کا نام غلام حسن تھا۔ بارہہ کے مضافات کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے سیر کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ یہاں شاعری کا شوق ہوا۔ شیخ مصحفی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا، پھر الہ آباد پہنچے اور یہیں رہ پڑے۔ یہاں فقیری اختیار کر کے مظلوم شاہ کہلائے۔ اس لقب کو اس طرح شہرت ملی کہ زمانے نے اصل نام کو بھلا دیا

بلکہ الہٰ آباد والے ان کو باشندۂ لکھنؤ خیال کرنے لگے تھے۔ لکھنؤ میں ان کے قیام کی مدت غالباً مختصر تھی، جنانچہ ابن طوفان نے لفظ ''چندے'' استعمال کیا ہے۔ مصحفی سے تلمذ کی مدت بھی زیادہ نہیں تھی۔ غالباً یہی وجہ ہوئی کہ مصحفی نے اپنے تذکرے میں ان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ الہ آباد میں ایک مدت تک اپنے طور پر شعر کہتے رہے۔ آخر جب ناسخ کی استادی کا غلغلہ زیادہ بلند ہوا تو ان کے فیض سے محرومی گوارا نہ ہوئی۔ عنایت حسین خاں مہجور نے اپنے تذکرہ ''مدیح الشعرا'' میں لکھا ہے کہ:

''قدوۃ الفقرا، زبدۃ الکملا، سرحلقۂ شاعران رنگین بیاں... در ابتدا شاگرد رشید... مصحفی دور آخر چوں.... ناسخ مغفور وارد الہ آباد گشت، بہ تلامذگی آں وحید الدوراں سرمباہات بہ فلک الافلاک برافراخت و ہر چند کہ کامل بود اکمل الکملا گردیدہ''۔ 40

باوجودیکہ مظلوم شاہ کہنہ مشق ہو چکے تھے۔ ناسخ سے ان کا تلمذ اختیار کرنا عقیدت مندی کے اظہار کے لیے رہا ہوگا اور یہ اس حقیقت پر بھی دلالت کرتا ہے کہ وہ پہلے سے ناسخ سے متاثر تھے، ناسخ کی شاگردی اختیار کرنے سے پہلے کا ان کا کچھ کلام یہ ہے۔

دل موسیٰ کف سفاک ستمگر کرتا — آہ سوزاں جو میں زیر دم خنجر کرتا
کشتہ ہے جہاں دفن تری فندق پا کا — سبزے کی جگہ اگتا ہے واں نخل حنا کا
گلچیں ملک الموت ہوا بہر شہ گل — بلبل نے کیا ماتم مغفور چمن میں
دل مرا مائل زلف بت بے پیر نہیں — میں مسلماں ہوں مجھے خواہش تکفیر نہیں
سامنے آتا ہے جب موے میاں کا مضمون — کمر شاہد نظارہ لچک جاتی ہے
کب عشق میں پڑتا ہے قدم اہل ہوس کا — شعلے کے مقابل ہو یہ زہرہ نہیں خس کا
اس منزل ہستی میں جو دیکھا بہ تامل — وقفہ نہیں، گر ہے بھی تو اک آدھ نفس کا
دیں گے یہ دعائیں تجھے، پر کھول دے صیاد — اس موسم گل میں تو اسیران قفس کا
جس حسن کے شعلے سے فرشتوں کے جلیں پر — پروانہ وہاں کیوں نہ رکھے حکم مگس کا
چلا تا ہوں از بس میں شب ہجر میں مظلوم — دم بند کیا ہے مرے نالوں نے عسس کا
کلیم عصر ہوں، کشاف سر فن ترانی کا — چراغ طور ہے مطلع مرے دیوان ثانی کا

ان شعروں میں معنی آفرینی اور صنعت گری کا وصف نمایاں ہے۔ شاعر کو ترکیبوں اور

استعاروں کے استعمال کا شوق زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مذہبی روایتوں اور خیالوں کا اس کی فکر پر غلبہ ہے۔ بطور مجموعی کلام قدما کے طرز میں ہے اور اہل الہ آباد اسی نقطۂ نظر کی قدر کرتے تھے۔ اعظم نے اپنی ایک غزل میں ان کے ایک مصرع کو اس طرح تضمین کیا ہے۔

اعظم بقول حضرت مظلوم اب کے سال　　کیا کیا مچا رہی ہے چمن میں بہار رنگ

شیخ امام بخش ناسخ سے تلمذ اختیار کر لینے کے بعد اس پختگی اور کہنہ مشقی کے باوجود مظلوم شاہ کے طرز شاعری میں تبدیلی آئی چنانچہ ذیل کی غزلوں میں بھی ظاہر ہے۔

رہا دل کو خیال ساقی و میخانہ غربت میں　　فرشتے سے کیا میں نے طلب پیمانہ تربت میں
نظر جس دم چراغ دیدۂ منکر نکیر آیا　　دل شیدا ہمارا بن گیا پروانہ تربت میں
فقیر خمر شانہ ہوں، در دشانہ ہے مجھ کو　　روا رکھنا نہ شانہ ہے میرے شانہ تربت میں

ذرا خواب عدم سے چونک پڑتا، تب تماشا تھا
اُڑا دیتا کفن کی دھجیاں دیوانہ تربت میں

پھولوں کا جو اس گل کی پڑا ہار کمر پر　　اک طرفہ شگفتہ ہُوا گلزار کمر پر
آئینہ مجل ہے شکم صاف سے اس کے　　کھاتے میں گل اندام سدا خار کمر پر

اللہ رے نزاکت تری کس ناز ادا سے
ہاتھوں کو رکھے ہے دم رفتار کمر پر

مظلوم شاہ کی اس پہلی غزل کو نسبتاً زیادہ شہرت ملی تھی، اور یہ اس کا حق بھی تھا۔ مطلع میں ساقی۔ میخانہ اور پیمانہ کو تربت میں جمع کر دینا نئی بات تھی، اسی طرح منکر نکیر کی آنکھوں کو چراغ اور اپنے دل کو اس کا پروانہ بنا دینا رعایت لفظی اور معنی آفرینی کی دلچسپ مثال ہے۔ سبھی شعروں کے مضامین مذہبی روایتوں پر مبنی ہیں اور ان میں عاشقی کے روایتی خیالوں سے ایک دلکش فضا پیدا کی گئی ہے۔ تیسرے شعر میں لفظ ''شانہ'' کو مختلف معنوں میں چار بار نظم کر کے قوت مشقی اور خوش فکری کا اچھا ثبوت پیش کیا ہے۔

وقت کے ساتھ زبان اردو میں لفظوں کے معنی میں جس طور پر تبدیلی آ رہی تھی۔ آخری شعر میں اس کی مثال بھی موجود ہے۔ اس سے پہلے لفظ ''تماشا'' کو معمولاً ہنگامہ کھیل اور تفریحی مشغلہ یا

حرکت وغیرہ کے معنی میں صَرف نہیں کیا جاتا تھا۔

دوسری غزل بھی قدما کی روایت سے ایک حد تک انحراف کی مثال پیش کرتی ہے۔ محبوب کی کمر کو موہوم کہا جاتا تھا۔ یہاں اس کا وجود قطعی اور حقیقی ہے۔ اس کے باوجود لطف یہ ہے کہ قدیمی روایتوں کا دامن چھوٹنے نہیں پایا ہے۔ ایک یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ لکھنؤ اور الہ آباد میں برسوں تک رہنے کے باوجود مظلوم شاہ اپنے وطنِ اصلی کی بول چال کو بالکل فراموش نہیں کر سکے تھے۔ چنانچہ آخری شعر میں ''رکھتا ہے'' کے معنی میں ''رکھے ہے'' نظم کیا ہے۔

مظلوم شاہ کو اپنے استاد شیخ ناسخ سے واقعی محبت وعقیدت تھی۔ چنانچہ ان کے دوسرے دیوان میں ذیل کے اشعار موجود ہیں۔

شیخ ناسخ شاعرِ بے باک والا اقتدار　　آفتابِ جلوہ آرائے سپہرِ عز و شاں
قیصر روم معانی شاہ ایراں سخن　　خسرو توران مضمون، تاجدار شاعراں
در اقالیم سخندانی عدیلش نیست نیست　　مثل او در دور خود ہرگز نہ دیدہ آسماں
درگہہ او سجدہ گاہ سر فرازان سخن　　خاک کوئش سرمۂ چشم دل اہل زباں
فخر از شاگردی او شاعران ہند را　　حامد طرز بیان او فصیح اصفہاں
قائل استادیش ہر کس نباشد تا ابد　　بعد زیب گردن او طوق لعنت در جہاں

اس غزل کا آخری شعر کہہ رہا ہے کہ کوئی خاص واقعہ پیش آیا تھا۔ جس سے متاثر ہو کر مظلوم شاہ نے یہ شعر کہے تھے۔ ناسخ نے لکھنؤ کے تین بادشاہوں کا زمانہ پایا تھا۔ تینوں کے دور میں انھوں نے سرِ تسلیم خم کرنے کے مقابلے میں لکھنؤ سے نکل جانے کو ترجیح دی تھی۔ غالباً اسی بنا پر مظلوم شاہ نے ان کو ''شاعرِ بیباک'' کہا ہے۔

اپنی درویشی کے باوجود مظلوم شاہ کے مزاج میں ظرافت اور شگفتگی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ چنانچہ ان کے کلام سے ظاہر ہے سعادت خاں ناصر نے ان کی ایک دلچسپ غزل کی نشاندہی کی ہے، لکھا ہے:

> ''بی جان ایک طوائف ہے، اس کی تمنا سے یہ غزل اس (مظلوم) نے کہی ہے، کہ قافیہ میں ہر بیت کے نام اس کا ظاہر ہوتا ہے'' 41؎

ہوگیا بد ظن مجھے زاہد شرابی جان کر شیشۂ دل سنگ پر مارا گلابی جان کر

مظلوم شاہ کے تصنیف کردہ ایک سراپا کا ذکر بھی ملتا ہے، جس کا پہلا مصرع یہ ہے۔

وہ حُسن بھبھو کا نام خدا وہ نورِ تجلی صلِ علیٰ 2 4

ظاہر اًیہ سراپا نعتیہ ہے اور مظلوم شاہ کے عقیدے کا مظہر ہے۔

ڈپٹی نصر اللہ خاں خویشگی نے بھی ان کی ایک منظوم تصنیف کی نشاندہی کی ہے، لکھتے ہیں:

''مظلوم شاہ مظلوم تخلص، درویش دل ریشے از ظلم گردوں، دور اندیشے است کہ مظلوم شاہ نام دارد، در الہ آباد زاویہ گزیں است، مَرد خوش اخلاق در سخن سنجی مشہور، آفاق است، ہنگام اقامت آنجا شنیدہ بودم کہ بہار دانش را بہ نظم اردو آوردہ است، فلما بر نہ خوردہ ام''۔43

معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت خویشگی الہ آباد پہنچے مظلوم شاہ کا وہ آخری زمانہ تھا اور ''ظلم گردوں'' کے سبب وہ ''زاویہ گزیں'' ہو گئے تھے۔ اگر خویشگی کی اطلاع صحیح ہے تو بہار دانش کے منظوم ترجمہ کو مظلوم کے آخری زمانہ کا کام سمجھنا چاہیے۔

خواجہ عبدالرؤوف عشرت نے مظلوم کے بارے میں اتنا لکھا ہے کہ:

''شاہ مظلوم دہلی کے شاعر تھے، میر کے شاگرد تھے، 1256ھ میں انتقال فرمایا، قبر کا نشان نہیں معلوم''۔43

اس میں بجز ایک کے کوئی بات صحیح نہیں ہے۔ خواجہ عشرت نے ان کا سالِ وفات اس مصرع سے نکالا ہے، ع ہائے افسوس وائے مظلوم است

1256ھ

اس مصرع میں ''است'' بطور ردیف ہے اور یہ مادہ تاریخ کا جُز نہیں ہے۔ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے بھی ایک قطعہ کہا ہے:

''قطعہ تاریخ وفات مظلوم شاہ متخلص بہ مظلوم 1256ھ''45

ان کے علاوہ میر علی اوسط رشک کا قطعہ تاریخ بھی ہے۔ جس سے بعض مفید اطلاعات

سامنے آتی ہیں، وہ قطعہ یہ ہے۔

در الہ آباد چوں مظلوم شاہ از ہیضہ مُرد　　شاعرِ شیریں زباں خوش طبع با اخلاق وائے
حیف ماہِ انتقالِ او ذی قعدہ بود　　بودہ ہجری سال پنجاہ و ششم افسوس ہائے
رشک تارِ نخش ہمیں مصرع بعینہ یافت　　بودہ ہجری سال پنجاہ و ششم افسوس ہائے

ذی قعدہ 1256ھ (جنوری 1841)

اس وقت قیاساً مظلوم شاہ مظلوم کی عمر پچاس برس کے قریب رہی ہوگی۔

مرثیہ

الہ آباد میں مرثیہ گوئی کو چلن حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ شیخ مصحفی کے تذکرے میں مرزا مغل فریاد کے بارے میں مذکور ہے کہ:

''بزرگانش از ولایت در شاہ جہاں آباد آمدہ، تو طن گزیدہ خودش در لکھنؤ تولد و نشو و نما یافتہ، پیش ازیں بہ مقتضائے موزونی طبع فکر مرثیہ و سلام می کرد و آں را از نظر میاں افسردہ می گزرانید از یک دو سال بہ گفتنِ غزل عمل نمودہ، و بہ نظم کردنِ غزل ریختہ متوجہ شدہ، مشورہ آں بہ فقیر دارد، عمرش بہ ست و دو سالہ است''۔46

یہ شخص کلب حسین خان نادر کے بیان کے مطابق 1243ھ (1827-28) سے پہلے الہ آباد میں آ گیا تھا اور یہاں غزل گوئی میں مصروف رہا تھا۔ چنانچہ نادر نے لکھا ہے:

''چند روز تک اپنی غزلیں استاد زماں شیخ ناسخ کی خدمت میں گذران کر کافی فائدہ اٹھایا ہے''۔47

کلب حسین خاں نادر نے اس کی مرثیہ گوئی کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا ہے البتہ بعد کے بعض تذکرہ نویسوں نے افسردہ سے اصلاح لینے کا ذکر کر دیا ہے۔ بہر نوع الہ آباد میں اس کی مرثیہ گوئی کا حال کچھ معلوم نہیں ہوتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ الہ آباد کے بعض شاعروں کے یہاں اس قسم کے مقطعے ملتے ہیں۔

جو روتا ہوں غمِ سبطِ رسول اللہؐ میں اعظم میرا اشکِ فتادہ رائیگاں مطلق نہیں ہوتا

لیکن اعظم وغیرہ کے دیوان میں کوئی مرثیہ شامل نہیں ہے اور کسی تذکرہ نویس نے ان کی مرثیہ گوئی کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی نے مرثیہ کہے ہوں لیکن اس شہر میں اسے شہرت یا اعتبار حاصل نہیں ہوا۔

ہزل وریختی وغیرہ

سید امام علی صاحقران تخلص نے اپنی فحش گوئی کے لیے بہت نام پیدا کیا تھا۔ وہ رہنے والے تو بلگرام کے تھے اور نواب آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ میں بھی رہے تھے لیکن ان کا طرز جتنا الہ آباد میں مقبول ہوا دوسری جگہوں پر نہیں ہو سکا۔ الہ آباد کے شاعروں میں سے بعض نے فخریہ اور کچھ نے شوقیہ اُن کی اتباع کی تھی۔

1- اعظم:

مرزا اعظم علی بیگ اعظم تخلص، خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ اپنی غزلوں میں ایک دو شعر صاحقران کے انداز کے کہہ کر معمولاً شامل کر دیتے تھے اور فخریہ کہتے تھے۔

کشورِ شاعری میں اعظم بھی　　آج صاحقرانِ ثانی ہے

اس طرز کے ان کے چند شعر درج ذیل ہیں۔

میری صحبت جو خوش آئی تو وہ کہنے لگے ہنس کر　　ارے اعظم بڑھاپے میں تجھے پایا جواں کیسا

چلے ہو نہانے کا کر کے ارادہ　　دولہن آپ کو اب بنا کر کے آنا

یہ ہے گت جو چٹکی بجا کر چلی ہو　　ذرا گھنگھروؤں کو بجا کر کے آنا

دو طرف سے ناگنیں دوڑیں دلِ عشاق پر　　زلف کیا کھولی سپیرے کا پٹارا کھل گیا

اوروں کے ساتھ کرتے رہے بے حجابیاں　　آئے ہمارے پاس تو تم کو حیا لگی

اس طرز میں مرزا اعظم بیگ کا شمار اپنے وقت کے استادوں میں ہوتا تھا عبدالغفور خاں نساخ کے تذکرے سے ان کے دو شاگردوں کا حال نقل کیا جاتا ہے:

(الف) حیرت تخلص، محمد جان خاں ولد باز خاں، باشندۂ الہ آباد۔

مرقد سے میری اُٹھ کے بگولا جو رہ گیا　　کہنے لگے وہ خاک کسی ناتواں کی ہے

اور (ب) سعید تخلص، مرزا سردار حسین ولد مرزا علی اصغر۔

عجب کیا ہے اگر میں بھی اسیرِ چاہ بابل ہوں　　کسی زہرہ شمائل کے ذقن پر دل سے مائل ہوں

2- جولاں:

یہ الہ آباد کے معروف ریختی گویوں میں سے تھے، نادر نے ان کے احوال میں لکھا ہے:

"جولاں، سید قدرت علی نام ہے، دریاباد کے رہنے والے ہیں، جو شہر الہ آباد کا ایک محلہ ہے، کچھ عرصے سے شاعری کر رہے ہیں، اور میاں رنگین کی تقلید میں ریختی کہتے ہیں، اور ایک ایسے خاص طرز میں پڑھتے ہیں کہ اہل مشاعرہ کو سرور حاصل ہوتا ہے، ان کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

آتو کی چھوکری کو لواں اب کی سال ہے　　انا جی رت جگے کا مجھے پھر خیال ہے

ہے شرط یہ کہ یار سے ملیے ہزار طرح　　بندِ ازار کھولے تو کچی چھنال ہے [3]

معلوم ہوتا ہے کہ جولاں کو ریختی کے لیے شہرت ملی تھی۔ چنانچہ عبدالغفور خاں نساخ نے بھی اپنے تذکرے میں ان کا ذکر کیا ہے۔ [4]

قِران:

ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے اپنے پہلے تذکرے میں ان کا حال اس طرح لکھا ہے:

"مرزا احسن نام ہے ان کے والد مرزا اسماعیل بیگ ایک ذی عزت، صاحب اقتدار اور اس شہر (الہ آباد) کے رؤسا میں سے تھے، یہ بزرگ صاحبقران کے رنگ شاعری میں اشعار کہتے ہیں، اور قِران تخلص رکھتے ہیں، گویا یہ صاحبقران ثانی ہیں"۔ [5]

ان کا شعر یہ ہے۔

چادر پہ خون بکر کو بالکل بہا دیا　　شنچے نے اپنی فرج کا کیا خوں بہادیا

ٹھمری دوہے وغیرہ

ضلع الہ آباد کی تحصیل سراتھو کے قصبہ کڑا کو زبان اردو کے قدیم ترین مراکز میں شمار کیا جانا چاہیے، اسی قصبہ کو محمد بن قوام بن رستم مولف بحر الفضایل کا وطن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ فارسی کی اس قدیم لغت کی قسم دوم کے باب چہارم کا عنوان یہ ہے:

" در الفاظ ہندوی کہ در نظم بکار آید"۔1

اور اس میں زبان ہندوی کا یہ شعر بھی ملتا ہے۔

دیکھ پیکھ پیو گھر جاوے تس نس نینو نیند نہ آوے

2- عالمگیر اورنگ زیب کے عہد میں اسی قصبہ میں بابا ملوک داس ہوئے۔ جو سُندر داس کے بیٹے تھے اور رواج زمانہ کے مطابق اپنی بول چال کی زبان میں ملوکا تخلص سے شعر کہتے تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ذیا دھرم نہیں تن میں کھڑا کیا دیکھا درپن میں کانچ کی اک ناؤنی ہے ڈال دیا جب ساگر میں

دھرمی دھرمی پار اُتر گئے ڈوبے پاپی جل میں

اور۔

اجگر کرے نہ چاکری پنچھی کرے نہ کام داس ملوکا کہہ گئے سب کو داتا رام

اسی قسم کا کلام اس علاقے کے ہندو اور مسلمان سب کی زبانوں پر تادیر جاری رہا ہے۔ محمد واصل

عثمانی نے مولوی زین العابدین عابد تخلص متوفی 1305ھ (1888) کے حال میں یہ ذکر کیا ہے کہ:

"سیتا دیوی کے میلے میں پجاریوں کے ساتھ عورتیں یہ دوہا گاتی ہوئی گذریں۔

جب درسن کو جی چہے تو درپن ماں جت رہے
جب درپن لاگی کائی تو درسن کہاں سے آئی

یہ سننا تھا کہ زین العابدین صاحب کو وجد آ گیا۔ اسی کو زبان سے کہتے کہتے بیہوش ہو گئے اور اسی حال میں ان کا انتقال ہو گیا"۔

کٹرے کے اس ماحول میں بعض مسلمان شاعر بھی اسی قسم کے شعر کہتے تھے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ایسے شاعروں کے کلام کی طرف عموماً توجہ نہیں کی ہے۔ ضمناً صرف ایک شاعر کا حال معلوم ہو سکا ہے۔ اس لیے اسی کے ذکر پر قناعت کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔

انور:

سید پرورش علی نام تھا۔ کٹرا شعلع الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ بقول لالا سری رام 1228ھ (1813) میں پیدا ہوئے تھے اردو میں سخی تخلص کرتے تھے اور دو دیوان مرتب کیے تھے۔ رند مشرب اور آزاد پسند آدمی تھے۔ بھاکا کی شاعری میں تخلص انور تھا۔ محمد واصل عثمانی نے لکھا ہے کہ:

"بھاشا میں تخلص انور تھا، آپ نے اچھے اچھے دوہے، ہولی، ٹھمریاں، گیت اور بیت کہے، انور بھاکا لکھنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے، اور بڑے درد انگیز لہجہ میں پڑھتے بھی تھے"۔[5]

افسوس ہے کہ دونوں حضرات نے انور کے اس کلام کا نمونہ نقل نہیں کیا ہے۔ آسی نے ان کے کچھ ظرافت آمیز شعر نقل کیے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

بوسہ للہ سخی مانگتا ہے ایک دیجیے گا تو دس پائیے گا
کہاں دن کو گھر بے محل جائیے گا اجی چھٹ پٹے میں نکل جائیے گا
مرے دل میں آنے سے یہ فائدہ ہے ذرا اور سانچے میں ڈھل جائیے گا
ایک میں جس کا نامۂ اعمال دو فرشتے سیاہ کرتے ہیں
دل کھلونا نہیں جو کہتے ہو ہم یہی لیں گے ہم یہی لیں گے

خطوط نویسی

الہ آباد کے مضافات میں بھی شعر و سخن کا رواج ہوتا جاتا تھا۔ مرزا پور میں حسین علی نام کا ایک شاعر تھا۔ جو اپنے نام کی مناسبت سے حُسین تخلص کرتا تھا۔ میر محمد خاں سرور نے اس کا یہ شعر اپنے تذکرے میں لکھا ہے۔

بتا دے گا انھیں کب تک تو اپنا اتقا زاہد　　کبھی بہر خدا رندوں کی مجلس میں بھی آ زاہد

اس شخص نے اردو نثر نویسی کی طرف بھی توجہ کی تھی۔ جتلا میرٹھی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

"حسین علی متوطن میرزا پور خطے در زبان اردوے ریختہ بنام مولف نوشتہ بود، مع جواب در بنجا قلمی گردد"۔ 2

اپنے خط میں حُسین علی نے مرزا جلال الدین امیر کے ایک فارسی شعر کا مطلب جتلا سے پوچھا تھا۔ حُسین نے تو اپنے خط میں جتلا کو "اشعار کے شناسا" وغیرہ توصیفی فقروں کے ساتھ مخاطب کیا ہے۔ لیکن جتلا نے اپنے جواب میں القاب و آداب تقریباً سب حذف کر دیے ہیں۔ اور مکتوب الیہ کو "میاں علی حسین سلمہ" کہا ہے۔ زبان البتہ دونوں کی پُر تکلف اور مصنوعی ہے۔

یہ بات البتہ قابل توجہ ہے کہ حُسین مرزا پوری کے اقدام کے نتیجے میں جتلا میرٹھی نے بھی اردو میں خط لکھا تھا اور پھر رفتہ رفتہ دوسرے مقاموں پر بھی اردو میں خطوط نویسی کو انھیں خطوط پر رواج حاصل ہونے لگا تھا۔

مذہبی نثر

نواب شجاع الدولہ کے دور میں صوبہ اودھ کو بہت وسعت حاصل ہوگئی تھی۔ چنانچہ مذکور ہے کہ:

"اس زمانے میں اقبال نواب سے اس صوبے کی حد زیادہ بڑھ گئی، غرب میں اٹاوہ وشرق میں مرزاپور اور الہ آباد صوبہ بھی شامل صوبہ اودھ ہوگیا"۔1

لیکن یہ ترقی محض عارضی ثابت ہوئی۔ الہ آباد اور مضافات کے پورے علاقے پر بہت جلد انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ اودھ کے تسلط سے آزاد ہوجانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پورے خطے میں ایک مختلف انداز فکر کو فروغ حاصل ہوا اور اہل لکھنؤ کے عقائد کا بڑھتا ہوا ریلا کچھ رک گیا۔

کرامت علی

الہ آباد سے ملحق جونپور کا شہر تھا۔ وہاں اردو نثر نے ترقی کی، اس اعتبار سے مولانا کرامت علی جونپوری کا نام سب سے زیادہ معروف ہے۔ یہ 18 محرم 1215ھ (11 جون 1800) کو جونپور میں پیدا ہوئے تھے۔ اس زمانے کے معروف علما سے تعلیم حاصل کی۔ سید احمد شہید سے بیعت کرکے ان سے خلافت لی۔ آخر 3 ربیع الثانی 1290ھ (1873) کو رنگ پور میں وفات ہوئی۔

مولانا نے عقائد، فقہ اور تصوف کے موضوعات سے متعلق پچاس سے زیادہ کتابیں اور

رسالے تصنیف کیے تھے۔ ابتدائی زمانے کی ان کی چند کتابیں یہ ہیں:

1- رسالہ در مباحثہ ومحاکمہ: مولانا نے جب بنگال کا سفر کیا تو انھیں حاجی شریعت اللہ کے فرقہ ''لاٹھعہ'' سے سابقہ ہوا۔ ان کے بعض عقائد یہ تھے:

(الف) بنگال دارالحرب ہے۔ وہاں جمعہ اور عیدین کی نماز درست نہیں۔

(ب) ایسے شخص کی جو کلمہ گو تھا۔ مگر شرک میں مبتلا رہ کر بے نمازی مَرا نماز جنازہ حرام ہے۔

(ج) مشائخ طریقت کے ہاتھوں پر بیعت نہیں کرنی چاہیے اور

(د) ٹڈی حلال ہے وغیرہ۔

مولانا کرامت علی نے ان مسائل سے متعلق شروع میں حاجی شریعت اللہ کے شاگردوں سے مباحثہ کیا اور پھر اسی کو 1239ھ (1823) میں قلمبند کر دیا۔ اس کی ابتدا اس عبارت سے ہوتی ہے:

''ماقولکم رحمکم اللہ۔ جمعہ اور عیدین کی نماز اس ملک (یعنی بنگالہ میں) اس زمانے میں کہ وہ قوم نصاریٰ کے تحت میں آ گیا ہے نادرست اور مکروہ ہے، کراہتِ تحریمی کے ساتھ یا جائز اور واجب ہے؟''[2]

اور اس رسالے کا خاتمہ اس بیان پر ہوا ہے:

''.....ایسا ہی حکم ہے کتاب کا، اور اللہ خوب جانتا ہے ٹھیک بات اور اس طرف ہے سب کے رجوع ہونے کی جگہ اور سب کا ٹھکانہ، اور اس کے ہاتھ ہے لازم کر دینا ہدایت اور سیدھی راہ کا بیان کر دیا درست اور سچی بات''۔

اس کتاب کے نسخہ، بمبئی کا ترقیمہ یہ ہے:

''ہذا الکتاب فتویٰ، مباحثہ ومحاکمہ، باہم جناب مولانا مخدومنا محمد علی (حضرت مولوی کرامت علی جونپوری) با شاگردان حاجی شریعت اللہ صاحب مرحوم یعنی با مولوی احسن اللہ وقاضی احمد، ومنشی رحیم بخش ومنشی رحیم الدین، کہ بہ مقام باریسال بہ مقابلہ جمع عمل گاہ ضلع باقرگنج انفصال یافتہ بود، آں را جناب مولانائے موصوف جہت فائدہ عام وکافہ انام برجمع اذن نمودہ بود، لذلک من جمیل الدین احمد آں را بہ پاس خاطر جمیع

مسلمانان نقل نگاشتہ سنہ 1239ھ (1823) بہ روز سہ شنبہ بہ وقت یک ونیم پاس
روز اختتام رسانیدم"۔3

2-قول الامین: یہ بھی اسی سلسلے کی کتاب ہے۔اس کا سال تصنیف تو معلوم نہیں لیکن قیاس کہتا ہے کہ یہ پہلی کتاب کے بعد کسی وقت لکھی ہوگی۔اس کی ابتدائی عبارت اس طرح ہے:

" فقیر کرامت علی جونپوری کی طرف سے سارے دینی بھائیوں کی خدمت شریف میں جو اس فقیر سے حاضرانہ اور غائبانہ محبت رکھتے ہیں، بعد سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے، واضح ہو کہ لامذہب لوگ اور دودامیاں کے گروہ جو فرائضی کہلاتے ہیں، یہ اہل سنت والجماعت ہرگز نہیں ہیں، بلکہ یہ لوگ سارے اہل سنت وجماعت سے خصوصاً حرمین شریفین کے لوگوں سے بڑی عداوت رکھتے ہیں، اور مکہ مدینہ کا نام لینے سے جل کر خاک ہو جاتے ہیں، اور طرح طرح کا اُن کا عیب بیان کرتے ہیں، جو کوئی چاہے آزمالے، اور یہ سب لوگ اپنے گروہ کے سوائے سب کو مشرک جانتے ہیں"۔4

دودامیاں کا اصل نام محسن الدین احمد تھا اور وہ حاجی شریعت اللہ فرائضی کے فرزند تھے وہ 1819 (1234ھ) میں پیدا ہوئے اور 1862 (1276ھ) میں مرے۔

کتاب قول الامین کے آخر کے جملے اس طور پر ہیں:

".....اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے نفس کی اصلاح کی توفیق دے، آمین، اور نماز مومنوں کی معراج ہے، اس کے سبب سے بندہ اللہ تعالیٰ کے قُرب کے مکان میں پہنچ جاتا ہے، اور نماز اللہ تعالیٰ کے دیدار کے مقام کی خبر دیتی ہے، اور نماز میں اس کے دیدار کی بو آتی ہے، اور یہ بات کسی عبادت میں حاصل نہیں"۔5

3-تقویۃ المومنین ہدایۃ الزائفین: بعض علمائے شیعہ نے مولانا کرامت علی سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور رسالے لکھے تو انھوں نے سوال وجواب کی صورت میں 1242ھ (1826-27) میں یہ رسالہ تالیف کیا، اس کو انھوں نے اس طرح شروع کیا ہے:

"جس طرح کا حمد کہ بارگاہ بے نیاز مطلق کی شان کے لائق ہے کسی مخلوق کو طاقت بیان نہیں اور نعمتیں بے شمار جو ہر لحہ ابر رحمت رحمانی سے حدیقۂ حال انسانی پر برستی ہیں،

ان کا شکر جس قسم کا چاہیے کسی کو تاب ادا کرنے کی کہاں، سوا اسی مالک رحیم کے کلام کریم کی تابعداری کر کے اُلحمد للہ ربّ العالمین کہنا اور اپنی عاجزی اور قصور کا بیان کرنا سوائے اس کے بنی آدم کے چارہ نہیں....."۔8

اس رسالے کے آخری جملے یہ ہیں:

".....اپنے مذہب کی صفائی اور راست بازی اسی سوال و جواب سے جو لکھ چکے دریافت کریں، اللہ تعالیٰ اس کے پڑھنے اور سننے والے کو ہدایت کرے"۔

4۔مفتاح الجنت: یہ رسالہ نماز اور اس کے متعلقات کے مسائل کے بیان میں ہے، مصنف نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"اس فقیر گنہگار نے اس کتاب کو تصنیف کرنے کے کئی برس بعد حج کے سفر سے پھرتے ہوئے، 1243ھ (1827-28) میں چھپوایا تھا، سو اب بعضے مقام پر مضمون صاف ہونے کے لیے کچھ لفظیں زیادہ و کم کیں اور دو چار مسئلے ضروری جو چھوٹ گئے تھے، سو ان کو ان کے مقام پر داخل کیا، اب جس کے پاس یہ کتاب ہووے وہ اس کے موافق اپنی کتاب کو درست کر لے"۔7

یعنی یہ کتاب غالباً 1240ھ (1825) سے پہلے تالیف ہوئی تھی، اور مقبول ہوئی۔ عقیدت مندوں نے اس کی نقلیں حاصل کر لی تھیں۔ پھر مصنف نے اس کو چھپوا دیا۔ بعد میں شائقین کے لیے اہل مطبع بھی اسے چھپواتے رہے چنانچہ مطبع مجیدی کانپور سے بھی یہ 1913 میں چھپی تھی، کتاب اس عبارت سے شروع ہوتی ہے:

"سب تعریف اللہ کے واسطے ہے، اور وہی ہے حمد و ثنا کے لائق جو تمام عالم کا پالنے والا ہے، اور وہ بڑا مہربان اور نہایت مہربانی کرنے والا اور اپنے مسلمان بندوں کو جو اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں اور اس کے حکم کے موافق کام کرتے اور اُس کے فرمانے کو برحق جانتے ہیں، بہشت میں لے جانے والا، اور ان کو وہاں کی نعمتیں بخشے گا، کہ جس کا بیان کرنا نہایت مشکل ہے، غرض یہ کہ وہ نہایت خوش رہیں گے.....۔8

اور سبب تالیف اس کتاب مفتاح الجنت کا اس طرح لکھا ہے:

''فقیر گناہگار اپنے گناہوں سے شرمسار ....اور اللہ کی رحمت اور پیغمبر کی شفاعت کا امید وار، خاکسار علی حنفی جونپوری مشہور کرامت علی، اس فقیر عاجز نے جمعہ کی نماز پڑھائی اور اپنی طاقت کے موافق معنی قرآن شریف اور حدیث کے بیان کرنے شروع کیے،....تب اس فقیر علی نے چاہا کہ ایک چھوٹا سا رسالہ جس میں مسئلے ضروری روزے نماز کے سب ہوویں، زبان ہندی میں جو آسانی سے عورتوں اور مردوں کی سمجھ میں آویں، لکھا چاہیے اور اس بات کو موجب بہتری اپنی کا اور پڑھنے والوں کا سمجھ کے، اس کے اس رسالہ کے تئیں، معتبر کتابوں سے جس طرح شرح وقایہ اور فتاوئی محیط اور ہدایہ اور فتاوئی مختصر شافی.....وغیرہ سے خوب تحقیق کر کے.....اس رسالہ میں لکھا ہے .....فقیر کو غرض ریاضت اور رنگینی سے نہیں ہے اور فقیر شاعروں کے زمرے میں ہے، اس واسطے فقیر نے اپنے شہر کی زبان میں لکھا، جس میں کسی کو مشکل نہ ہووے، اور کتاب کا نام مفتاح الجنت رکھا.....''۔

کتاب مفتاح الجنت میں لفظ کو ہر جگہ مونث استعمال کیا ہے اور اس کی جمع لفظیں بنائی ہے۔ اسی طرح ستون یا کھمبے کے معنی میں تھونی لکھا ہے۔ اسی طرح بعض اور الفاظ بھی قابل توجہ ہیں مثلاً:

آبادانی، کافری، صاحبی، دل بھائی (پسندیدہ)

5- انوار محمدی: یہ شمائل ترمذی کا اردو ترجمہ ہے، 1252ھ (1836-37) میں مکمل ہوا تھا، مترجم مولوی کرامت علی نے ''تقریب ترجمہ'' کے سلسلے میں لکھا ہے:

''اس خاکسار علی جونپوری مشہور کرامت علی نے دیکھا کہ اکثر لوگ سب علم تو پڑھتے ہیں، مگر حدیث کا ذکر بھی نہیں کرتے، اور پیغمبر صاحب کی حدیث اور ان کی شکل وصورت رہن، چلن، کھانے پینے، اوڑھنے، پہننے، سونے جاگنے، چلنے پھرنے، ہنسنے بولنے، وضو غسل روزہ نماز وغیرہ اخلاق وعادات کا احوال لوگوں کے نزدیک خواب وخیال ہو گیا ہے، بہت....ارداہ کیا کہ کچھ حدیث کی لذت بھائیوں کو چکھا دیں، اور ہندی زبان کے پیالے میں اس آب حیات کو بھر کر پلا دیں تب بعد فکر اور غور کے یہی مناسب دیکھا کہ شمائل ترمذی جو مشہور اور صحیح کتاب حدیث کی ہے، اس کا ترجمہ

کریں.....اس ترجمہ کو اپنی طاقت اور فہم کے مطابق بہت سیدھی اور آسان ہندی زبان میں کیا، اور لغت کی تحقیق بہت بڑی محنت کے ساتھ کر کے ترجمہ ٹھیک ٹھیک کر دیا.....روز مرہ ترجمہ پر کفایت نہ کیا بلکہ شرح بھی ضروری مقامات کی کر دیا اور اس شرح کا نام انوار محمدی رکھا"۔

کتاب انوار محمدی کی ابتدا کے چند جملے یہ ہیں:

"حمد وصلوۃ کے بعد معلوم ہووے کہ یہ کتاب مستطاب بہ نام شمائل ترمذی کہ مشہور ومعروف ہے اور حدیثوں کی کتاب میں مختصر اور بہت صحیح ہے کہ اس میں فقط وہ حدیثیں ہیں جن میں رسول اکرم ﷺ کے قد وقامت کی کیفیت اور ان کی ساری پاک فضیلتیں اور نیک سیرتیں مذکور ہیں"۔

اور اس کے خاتمہ کے الفاظ یہ ہیں:

"یا ارحم الراحمین اس شرح شمائل کے پڑھنے والے، سننے والے کو اتباع سنتِ احمدی اور شفاعتِ محمدیؐ عطا کر، اور ان کی مشکل دونوں جہان کی آسان کر، آمین"۔

یہ کتاب نہایت مقبول ہوئی اور بار بار چھپتی رہی ہے۔ چنانچہ مطبع شوکت المطابع میرٹھ میں بھی چھپی تھی۔

6- زبدۃ المصلی: کتاب کا ایک دس ورقی نسخہ جس کی کتابت 1250ھ (1834) میں ہوئی تھی مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ موضوع اس کے نام سے ظاہر ہے۔ کتاب کی ابتدا ان کلمات سے ہوئی ہے:

"یا اللہ صاحب، تو رب العالمین ہے، تیرے ہی واسطے سب تعریفیں لائق اور جتنی ثنا اور حمد ہے سب تیرے ہی واسطے ہے....."۔

اور اس کے خاتمے کے الفاظ یہ ہیں:

".....اور اگر بھول کر سنت کرے تو اس پر کچھ نہیں، یا اللہ صاحب، سب مسلمانوں کا دونوں جہاں میں بھلا کر، آمین یارب العالمین"۔

اس کا سال تصنیف معلوم نہیں ہو سکا۔

7-شرح زینت القاری: اس رسالے کے نام سے گمان ہوتا ہے کہ شاید ہ "زینت المصلّی" سے پہلے لکھا گیا ہوگا۔ یہ عربی کے ایک مختصر سے رسالے کا اردو ترجمہ ہے، ترجمہ صفحہ 24 پر مکمل ہوگیا ہے۔ اس کے بعد مترجم نے خاتمہ اور تین فصلوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح کل سترہ فصلیں اور مجموعی ضخامت تیس صفحہ کی ہوگئی ہے۔ خاتمہ کے تحت لکھا ہے:

"علم تجوید میں ایک رسالہ مختصر اور بڑا معتبر جو تمام عرب میں مشہور ہے، عربی زبان میں تھا، اس کا ترجمہ ہندی زبان میں خاکسار علی جونپوری مشہور بہ کرامت علی نے کیا اور جا بجا اس کی شرح بھی دوسری کتابوں سے کر دیا اور جو مضمون سمجھنے سمجھ میں نہ آتے تھے تو اس کو اپنے استاد قاریوں کے پیشوا حضرت سید ابراہیم ابن محمد مدنی سے تحقیق کر کے ترجمہ کیا اور اس رسالے کا نام مصنف نے نہ لکھا تھا جب اس کو استاد موصوف سے پوچھا، فرمایا زینت القاری، بعد اس کے سنا چاہیے کہ مصنف رحمۃ اللہ نے چونکہ بیان مخارج حروف اور صفات حروف کا اور حروف کے ادا کی رعایت کا نہ فرمایا تھا، اس واسطے اس خاکسار نے تین فصل معتبر کتابوں سے مثل جزری اور قواعد القرآن وغیرہ کے ان تینوں کا بیان کر دیا کہ لوگ اس کے لیے دوسری کتاب کے محتاج نہ ہوں، اسی میں اس کو بھی پاویں"۔9

اس کتاب کے آغاز میں مطالب اس طرح قلمبند کیے ہیں:

سب تعریف اللہ کو جو صاحب سارے جہان کا اور آخر بھلا ہے پرہیزگاروں کا اور درود اور سلام اللہ اتارے اپنے رسول پر جن کا نام مبارک محمدؐ ہے اور ان کی ساری آل اور اصحاب پر اور بعد اس کے یہ ایک رسالہ ہے علاقہ رکھتا ہے، تجوید کے قاعدوں سے"۔

اور مترجم نے اپنی کتاب کا خاتمہ اس عبارت پر کیا ہے:

"حرف ھوا یہ یعنی جو زبان کے کنارے سے نکلتا ہے اور اور اس کو ضرسیہ بھی کہتے ہیں: ض اور حرف شفویہ یعنی جو ہونٹھ سے نکلتا ہے: ب، م، ف، و۔ صلی اللہ علیٰ خیر خلقہٖ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین"۔

یہ کتاب بھی چند بار چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

(2)

الہ آباد بھی 7 ہندوؤں کے اہم ترین مقدس اور متبرک شہروں میں سے ایک ہے۔ وہاں

کے ہندو عموماً اپنے مذہبی سرمایہ سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اس کی توسیع واشاعت کو اپنے عملی فرائض میں سمجھتے ہیں۔

مُتولال

تیرھویں صدی ہجری کے وسط (اُنیسویں صدی کے ربع چہارم) میں الہ آباد کے ایک صاحب علم کایستھ گھرانے میں مُتولال نامی ایک شخص نے زبان اردو میں "ناسکت پوران" کا ترجمہ کیا تھا۔ اس ترجمہ کا ایک قلمی نسخہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ اس کا آغاز ذیل کی عبارت سے ہوتا ہے:

"اگر تمام دریائے روئے زمین کو مرتب کرکے اور سب شاخ ہائے درختاں ربع مسکوں کے قلم ہووے پیچ حمد وثنائے قادر ذوالجلال کے وفا نہ کرے، بلبل اندیشہ کو کہاں طاقت کہ اوپر شاخ ہائے توحید کے ترنم وگویا ہووے"۔10

مترجم نے اس ترجمہ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"یہ قلیل البضاعت حقیرہ خصال متولال ولد امدر چند کایستھ ماتھر، ساکن الہ آباد نے موافق خواہش دوستان یک دل اور حسب تمنائے سایلاں درخور فہم اپنی اس داستاں کی معشوقہ کو زبان ہندی سے بیچ اردو زبان کے محفلی بند زیب وزینت کا کرکے اوپر نوزدہ لطیفہ کے مرتب اور مترجم کیا"۔

ناسکیت پوران کے اس ترجمہ کا اختتام ان فقروں پر ہوا ہے:

"یہ کہنا ناسکت کے تئیں.... وہ شخص تمام جرائم سے مخلصی پاکر اس کے ہوئے، اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ راجا جم جی ہست خوش ہوکر قدم بوسی بجائے... رخصت ہوکر گئے"۔

یہ مخطوطہ 43 صفحوں پر محیط ہے اور ہر صفحہ پر تیرہ سطریں ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں کی مذہبی تحریروں میں عربی اور فارسی کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے اور اس کا سبب ظاہر ہے۔ باوجود اس کے ان کی عبارت میں کسی قدر بے ساختگی اور روانی کی صورت بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا حال بھی کم وبیش ایسا ہی ہے۔ البتہ ان میں اصطلاحات اور اسما وغیرہ سنسکرت سے ماخوذ ہوتے ہیں اور زبان کو مروجہ ڈگر پر لانے کے لیے جو سعی وکوشش کی جاتی تھی اس کے نتیجہ میں تکلف اور تصنع کی صورت پیدا ہوجاتی تھی۔

تذکرہ

الہ آباد میں بھی تذکرہ نویسی کی روایت شاہ عالم ثانی کے وقت سے موجود تھی۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، چنانچہ دو تذکرے قابلِ ذکر معلوم ہوتے ہیں۔

1 - شوکت نادری:

اس زمانے کے چلن کے مطابق یہ تذکرہ بھی فارسی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس کے مصنف کلب حسین خاں متخلص بہ نادر ابن احترام الدولہ دبیر الملک نواب کلب علی خان بہادر رئیست جنگ تھے، مصنف نے اس کی تالیف سے متعلق دو قطعات تاریخ کہے تھے، ایک یہ ہے۔

شوکتِ نادری رسالہ خوب یافت ترتیب در الہ آباد
بہر تاریخ چوں نمودم فکر سال تاریخ شد ظفر بنیاد
1247ھ

اس سے ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ الہ آباد میں 1247ھ (1831-32) میں لکھا گیا تھا۔ مصنف نے اس کے مطالب کی تقسیم ایک مقدمہ، سات ابواب اور ایک خاتمہ میں کی ہے، پہلے حصہ میں مصنف نے ان سب لوگوں کو جواب دیا ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے شاعری کی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ اس بحث کے بعد اصل تذکرہ شروع کیا ہے۔ اس میں الہ آباد کے فارسی اور اردو

دونوں زبانوں کے ان شاعروں کا حال قلمبند کیا گیا ہے۔ جو مصنف کے قیام الہ آباد کے زمانے میں وہاں موجود تھے۔ شاعروں کی تعداد بہتر (72) ہے۔ ان کے بعد مصنف نے خود اپنا بھی کچھ کلام احباب کی خاطر سے نقل کیا ہے۔ حالات اگرچہ تفصیل سے نہیں لکھے ہیں لیکن چونکہ سب کا زمانہ اور مقام معلوم ہے۔ وہاں کے شعری ماحول کو سمجھنے کے لیے یہ تذکرہ بہت مفید ہے۔

2-تذکرہ ابن طوفان:

اس تذکرے کو قاضی عبدالودود صاحب نے شائع کیا ہے، انھوں نے اس کے بارے میں جو لکھا ہے یہ ہے:

> "تذکرہ ہذا جس کا کوئی نام مصنف نے نہیں رکھا کسی کتاب کا ضمیمہ معلوم ہوتا ہے، اس کے قلمی نسخے کے صفحہ اول میں بسم اللہ الخ سے قبل عبارت ذیل مرقوم ہے:
>
> اشعار شاعران ہندی زبان ہر زمین کہ بر زبان من خاطر پریشاں بود، بر طبق ایمائے آں فیض رساں آسمان شاں، صورت سنبل گرد یاں بہ شانۂ خامہ مشاطگی کردہ جمع نمود۔
>
> فیض رساں کون ہیں اور مصنف کا کیا نام ہے، یہ باتیں نہ اس میں ہیں، نہ کسی اور ذریعہ سے معلوم ہو سکیں، امین اللہ طوفان مصنف کے والد اور خان الہ آبادی کے استاد تھے،... میرے نزدیک اس کی بہ نسبت کہ خود رقمی اس کے مصنف ہیں، یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ ان کے کسی بھائی کے رشحات قلم سے ہے..... یہ فرض کرتے ہوئے کہ مصنف نے اسے دو چار دن سے زیادہ میں نہیں لکھا ہوگا میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ 5 ذی الحجہ 1247ھ کے بعد اور رجب 1251ھ سے پہلے وجود میں آیا ہے، اس تذکرے میں اکتالیس شاعروں سے متعلق عبارات نثر اور ان کے اشعار منتخب ہیں، .... مصنف کا نقطۂ نظر اور طریقۂ تذکرہ نگاری محققانہ نہیں اور اس کی عبارت فارسی بھی نقص سے مبرا نہیں..... حواشی میں مصنف کے جن اغلاط کا مجھے علم ہے تصحیح کی گئی ہے"۔1

تذکرہ بہت مختصر ہے لیکن قاضی صاحب کے حواشی وغیرہ نے اس کے صرف اُنیس صفحوں کو

ستاسی صفحات تک پھیلا دیا ہے۔

اس تذکرہ سے الہ آباد کے بعض شاعروں کے بارے میں مختصر لیکن مفید معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اور اس اعتبار سے یہ تذکرہ بہت قابل قدر ہے۔

مطبعے

نواب سعادت علی خاں نے اپنی مسند نشینی کے صلے میں جو علاقہ انگریزوں کے حوالہ کر دیا تھا اسی میں صوبہ الہ آباد بھی تھا۔ قبضہ حاصل کر لینے کے بعد اس شہر کی بھی انگریزوں نے اپنے طور پر آبادکاری کی فکر کی، بعض صنعتیں وغیرہ بھی شروع کیں۔ 1836 میں اپنی ضرورتوں کے مطابق ''مطبع گرین وے'' کمپنی قائم کیا۔ لیکن بدقسمتی یہ رہی کہ اسی سال میں یہ جل کر خاک ہو گیا، بہر نوع اس مطبع نے آگے کے لیے راہ کھول دی اور زمانہ مابعد میں بھی یکے بعد دیگرے مطبعے قائم کیے گئے۔

گرین وے کمپنی کے مطبع کو کتابیں شائع کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔

حواشی

1-تواریخ نادر العصر	ص61تا63
2-ایضاً	ص76
3-شوکت نادری	ص50تا51
4-آب حیات	ص353
5-خوش معرکہ زیبا جلد ا	ص429
6- شوکت نادری	ص50تا52
7-تذکرہ نادر	ص9
8-آب حیات	ص339
9-ایضاً	ص352
10-خوش معرکہ زیبا جلد ا	ص139
11-آب حیات	ص340
12-ایضاً	ص353تا354
13-ابن طوفان	ص10
14-خلاصہ قوانین مالی	ص303

15- شوکت نادری ص51

16-ایضاً ص52

17-انتخاب رقمی ص152 تا 155

18-ناسخ ص101 تا 102

19- شوکت نادری ص81

20-سراپا سخن ص10

21- شوکت نادری ص319

22-ابن طوفان ص14 تا 15

23-سراپا سخن ص319

24-گلستان بے خزاں ص21

25- شوکت نادری ص83

26-سراپا سخن ص184

27-انتخاب رقمی ص156

28-خوش معرکہ زیبا جلد 1 ص429

29-خوش معرکہ زیبا جلد 2 ص370

30- شوکت نادری ص54

31-عین المعارف ص12

32-آب حیات ص348

33-عین المعارف ص14

34-ایضاً ص13

35-مفید الشعرا ص36

36-تلخیص معلا ص102

37-خوش معرکہ زیبا جلد 1 ص429

38- شوکت نادری بحوالہ ابن طوفان ص83

39-ابن طوفان ص13

40-بحوالہ ابن طوفان ص84

41-خوش معرکہ زیبا جلد ا ص429

42-نمائش مخطوطات پٹنہ ص80

(4) خطہ بہار

(الف)غزل

	صفحہ
1۔خیالی خیالی رام	169
2۔فدوی مرزا محمد علی	170
3۔عاشق کلیان سنگھ	171
4۔راجا راجا بہادر	171
5۔راسخ غلام علی	172
6۔فرحت خواجہ فیض اللہ	173
7۔یاس مولوی انور علی	173
8۔فرد وحید الدین خاں	174
9۔محترم خواجہ محترم علی خاں	175
(ب)مرثیہ	176
1۔ترقی شاہ امان علی	176
2۔ظہور شاہ ظہور الحق	177
3۔فرد ابوالحسن	177

(ج)مثنوی 179

1-راسخ غلام علی 179

2-عاشق کلیان سنگھ 183

(د)تاریخ گوئی 185

1-عاشقی حسین قلی خاں 185

2-قمر علی 186

(ہ)واسوخت،ہجو وغیرہ 187

1-پس منظر 187

2-متفرق ہجویں 188

(و)نثر 191

1-ظہور ظہور الحق 191

2-محمد تقی بلخی 193

3-ولایت علی 194

4-ذوالفقار علی 196

حواشی 198

شاہ عالم ثانی کے ابتدائی زمانے میں 1179ھ (1765) میں لارڈ کلایو سرکار کمپنی بہادر کے گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان میں آیا۔ اس نے شتاب رائے کی وساطت سے کمپنی کے لیے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کر کے بادشاہ سے اس کو مہاراجا کا خطاب دلوایا۔ چند سال کے بعد ہی خیانت کے الزام میں اسے برطرف کر دیا گیا۔ اگر چہ یہ الزام غلط ثابت ہوا اور راجا کو اس کے منصب پر بحال کر دیا گیا لیکن اس برطرفی کے زمانے میں جو رسوائی ہوئی تھی راجا نے اس کے صدمے میں جان دے دی۔

1۔ خیالی

شتاب رائے کے بعد اس کا بیٹا کلیان سنگھ رائے رایان کے لقب سے نائب دیوان مقرر ہوا اور راجا خیالی رام اس کا نائب ہوا۔ آخر الذکر شاعر بھی تھا۔ مردان علی خاں جنتلا نے لکھا ہے:

> ''خیالی اسمش راجا خیالی رام، از امرا ہائے عظیم آباد است، از چندے بہ شرکت راجا کلیان سنگھ پسر راجا شتاب رائے مالگذاری صوبۂ عظیم آباد بہ او تعلق دارد۔ مرد عاقل و قابل و موزوں طبع، ذوق سخن بسیار دارد۔''[1]

خیالی رام خیالی با صلاحیت شاعر تھا اور اس نے مروجہ مختلف اصناف میں شعر کہے تھے۔ نمونہ کے طور پر اس کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں۔

اشعارِ غزل

حالتِ نزع ہے اے یار کہاں جاتا ہے　　ابھی مرتا ہے یہ بیمار کہاں جاتا ہے
ہو خیالی کو اگر دولتِ کونین نصیب　　دور قدموں سے ترے، یار کہاں جاتا ہے
آپ سے ہم نے جگ ہنسائی کی　　کیوں کسو سیتی آشنائی کی
مارنا پھر جلانا اک دم میں　　اے بتاں تم نے یاں خدائی کی

رباعی

کس کس کوچے میں عشق لایا ہم کو　　کیا کیا ستم وجور دکھایا ہم کو
منظور یہی اگر دل آزاری تھی　　سوتے تھے عدم میں، کیوں جگایا ہم کو

ان شعروں کی زبان کی ساخت، بیان کے طرز اور فکر وخیال میں بھی قدامت کا رنگ صاف جھلکتا ہے اور غالباً یہی سبب ہوا ہے کہ بعد کے بیشتر تذکرے خیالی کے ذکر سے خالی ہیں۔

2۔ فدوی

شتاب رائے خود تو شاعر نہیں تھے لیکن شعر وسخن کے دلدادہ تھے۔ کہتے ہیں کہ اشرف علی خاں فغاں اور میر ضیا وغیرہ ان کے وابستگانِ دولت میں سے تھے۔ شتاب رائے کے بیٹے بھی شاعر نواز تھے۔ فدوی کے حال میں لکھا ہے:

> ''فدوی دہلوی، نامش مرزا محمد علی مشہور بہ مرزا بچو، در عظیم آباد بہ خدمتِ شاہ گھسیٹا می گذارند و تعارفے با برادر کہتر راجا کلیان سنگھ خلف راجا شتاب رائے نیز دارد و دانش در ریختہ گوئی رسا و با راقم آشنا۔ اشعارش مدوّن است۔''[2]

مرزا علی لطف نے فدوی کی خاصی تعریف کی ہے۔ اس کا اختصار اس طرح ہے:

> ''فدوی میرزا محمد علی معروف میرزا بچو، نظم ریختہ میں استاد ہے۔ تلاشِ معنی میں فکر رسا رکھتے تھے اور بیانِ حسن میں دل درد آشنا۔ علم موسیقی ہندی میں مناسبت بہت درست اور تان کی سستی اور چستی کے جاننے میں نہایت چالاک وچست۔ چند روز مرشد آباد میں، آخر شہر عظیم آباد میں سکونت کا اتفاق ہوا تو وضیع وشریف اس شہر کا ان کا مشتاق ہوا۔ اسی شہر میں اس کہن رباط مسافر کش ہستی سے دل اٹھایا۔''[3]

ان سے متعلق ڈاکٹر سید محمد حسنین کا تحقیقی مقالہ دو ضخیم جلدوں میں مدت ہوئی چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ فدوی کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

گر خاک پہ میری کبھی اے یار گذرنا　　مت بھول کے ہرگز مع اغیار گذرنا
کل یار کے کوچے کی طرف گذرے گا فدوی　　مت آج سے تو اس طرف اے یار گذرنا
وہ کافر ہماری شب تار ہے　　جسے دیکھنا مہر کا عار ہے
قتل کر کے مجھ کو حاصل کیا کیا　　اس کو کیا کہتے ہیں قاتل کیا کیا

3۔ عاشق

کلیان سنگھ شاعر نواز ہونے کے علاوہ خود شاعر بھی تھا۔ عاشق تخلص کرتا تھا۔ اختر اور ینوی نے ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔ مختصراً یہ ہیں:

> ''مہاراجا کلیان سنگھ، تخلص عاشق، مہاراجا شتاب رائے کے بیٹے۔ باپ کے مرنے کے بعد ان کا منصب بھی پایا تھا۔ پیدائش دہلی کی ہے مگر کم عمری میں پٹنہ چلے آئے تھے۔ انتظام الملک ممتاز الدولہ مہاراجا کلیان سنگھ بہادر تہور جنگ کے خطابوں سے سرفراز تھے۔ خلاصۃ التواریخ اور واردات قاسمی وغیرہ کے مصنف تھے۔ آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ تہتر برس کی عمر پاکر 26 شوال 1237ھ (1821) کو کلکتہ میں رحلت کی۔ فارسی میں ان کے بہ کثرت دواوین، معدد مثنویاں اور قصائد ہیں مگر اردو میں متفرق اشعار کے علاوہ صرف ایک سہرا اور ایک مثنوی ملتی ہے۔''4

افسوس یہ ہے کہ اختر اور ینوی مرحوم نے متفرق اشعار نقل کیے ہیں۔

4۔ راجا

راجا شتاب رائے کے ایک بیٹے کا ذکر شیفتہ نے اس طرح کیا ہے:

> ''راجہ تخلص، راجا بہادر فرزند راجا شتاب رائے ناظم صوبہ بنگالہ۔''5

اس راجا کا ایک مطلع یہ ہے۔

یہ زخم دل ہمارے مرہم تلک نہ پہنچے　　ہم ان تلک نہ پہنچے وہ ہم تلک نہ پہنچے

سیدھے سادے خیالات، سامنے کی باتیں، روزمرہ کے مضامین بول چال کی زبان میں

جس پر قدامت کا اثر غالب تھا اس خطے میں نظم کیے جا رہے تھے۔ تکلف اور تصنع کو اس وقت کی شاعری میں کچھ زیادہ دخل معلوم نہیں ہوتا ہے۔

(2)

محمد شاہ بادشاہ کی وفات کے بعد دہلی کی بادشاہت پر ادبار آیا تھا۔ اس سے پریشان ہو کر وہاں کے ارباب علم و دانش نے پورب کے علاقوں کا رُخ کیا تھا۔ طرز سادہ گوئی کے بانی مرزا جانِ جاناں مظہر کے بعض شاگرد جو عظیم آباد (پٹنہ) میں آ کر مقیم ہو گئے تھے، ان میں میر باقر حزیں، بیبت قلی حسرت اور محمد فقیہ دردمند خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مہاراجا شتاب رائے کے متوسلوں میں مرتضیٰ قلی فراق، اشرف علی فغان اور ان کے تلامذہ مثلاً وارث علی نالاں وغیرہ ممتاز ہوئے۔ ان سب کے اثر سے علم و شعر کے اس نئے مرکز پر طرز سادہ گوئی کو رواج ہوا۔

شاہ عالم ثانی کے عہد میں عظیم آباد میں اردو شاعروں کی خاصی بڑی جماعت موجود تھی چنانچہ بعض نام یہ ہیں۔

اصالت خاں ثابت محمد روشن جوشش غلام یحییٰ حضور محمد عابد دل

غلام حیدر رونق صادق علی خاں صادق غلام حیدر عاجز وغیرہ

اکبر شاہ ثانی کے زمانے کی نئی نسل نے شاہ عالم ثانی کے دور کے جن باکمالوں سے کسب فیض کیا تھا سطور ذیل میں ان میں سے بعض کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے۔

5۔ راسخ

شیخ غلام علی نام، شیخ محمد فیض کے بیٹے[6]، پٹنہ سے متصل موضع سائیں میں 1162ھ (1749) میں پیدا ہوئے اور 20/ جمادی الاول 1238ھ (1823) بروز دوشنبہ فوت ہوئے۔ پٹنہ کے محلہ لودی کٹرہ میں ان کی قبر بتائی جاتی ہے۔ انھوں نے پورب میں مرشد آباد اور کلکتہ اور پچھم کی طرف لکھنو اور دلی تک کا سفر کیا تھا۔ ان کے مقطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے میر اور فدوی سے کسب فیض کیا تھا۔

راسخ کو ہے میر سے تلمذ یہ فیض ہے ان کی تربیت کا

اور۔

شاگرد ہیں گے حضرت فدوی کے بے شمار راسخ ہوں ایک میں بھی، ولے کس شمار میں

ان کا کلیات خیر المطابع عظیم آباد سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ اس میں قطعات اور رباعیات کے علاوہ آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر وغیرہ کی مدح میں قصیدے بھی شامل ہیں۔ چند مثنویاں بھی ہیں۔ ان کی غزل کے کچھ شعر یہ ہیں ۔

مت پوچھیے مجھ سے حال میرا حیرت زدہ کیا بیاں کرے گا

آپ سے ہوگئے ہیں بیگانے جن سے تک آشنا ہوئے ہو تم

ہم مصیبت کشوں کے دن نہ پھرے گو زمانے کو انقلاب رہا

بے مدعا ہوں یہ بھی ہے اک مدعا بے دل اس قید مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا

راسخ کی زبان اور فکر دونوں پر قدامت کا اثر نمایاں ہے۔ ان کا شمار اُن کے وقت کے استادوں میں ہوتا تھا۔ یہاں ان کے صرف دو شاگردوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

6۔ فرحت

''فرحت تخلص، خواجہ فیض اللہ نام عُرف شاہ غلام مخدوم، عظیم آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے ۔

جب کوئی منظور نظر ہوگیا دیدہ و دل اپنا ادھر ہوگیا'' 7

7۔ یاس

''یاس تخلص، مولوی انور علی، باشندہ قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد، مفتی عدالت ضلع مذکور، ولد شیخ محمد حیات مرحوم شاگرد غلام علی راسخ، اٹھارہ اُنیس برس ہوئے کہ انتقال کیا۔ دیوان فارسی و اردو ان کا نظر سے گذرا۔ 8

کیوں کر کہیں میرے تئیں روانہ کریں گے گر دیدہ و دل یہ ہیں تو کیا کیا نہ کریں گے

مرغانِ چمن سب ہی ثنا خوان ہیں گل کے پر یہ نہیں معلوم کدھر کان ہیں گل کے

8۔فرد

مولوی وحیدالدین فرد صوبہ بہار کے معروف شاعروں میں سے تھے۔آخر زمانے میں کانپور میں آکر مقیم ہو گئے تھے اور بہ کثرت شاگرد بنا لیے تھے۔محسن نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''وحیدالدین خاں عرف مولوی خدا بخش خاں فرد، ولد محسن خاں، قوم افغان یوسف زئی، معلم پیشہ باشندہ دربھنگہ حلقہ صوبہ بہار مدت سے کانپور میں مقیم۔اس شہر میں بہت شاگرد ان کے ہیں۔مثلاً علی خاں غم اور بابو خاں دستار بند اور خود مولوی گری اور استادی کا دم مارتے ہیں اور شاعروں میں اپنے تئیں سب سے اونچا جانتے ہیں۔ صاحب دیوان، شاگرد غلام ہمدانی مصحفی، شاعر کو اپنی اس غزل پر ناز ہے۔خصوصاً اس مطلع پر فرماتے ہیں کہ ناسخ کے جواب میں یہ مطلع لاجواب ہے۔

سودائی نہیں پہنے جو زنجیر گلے میں ہے طوقِ غم زلفِ گرہ گیر گلے میں

اس زمین میں ان کی بہت بڑی غزل ہے کہ کوئی پوچ قافیہ باقی نہیں رہا۔مطلع یہ ہے۔

کیوں عشق میں ہو نام نہ موسیٰ مرے دل کا ہر داغ بنا ہے یدِ بیضا مرے دل کا''9

اور سعادت خاں ناصر نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''مولوی وحیدالدین عُرف خدا بخش خاں تخلص فرد، پسر محسن خاں، ساکن دربھنگہ، صوبہ بہار۔باوجود مولویت کے گانجے کے دم خوب لگاتا ہے اور غزلیں پڑھ پڑھ کر ہمدموں کو رجھاتا ہے۔مصحفی کی شاگردی پر فخر و ناز مگر تذکرے سے نام ان کا قلم انداز۔یہ چند شعر کہ اخگر اس کی چلم کے ہیں، لکھے جاتے ہیں کہ رند شربوں کو اس سے حظ آئے۔

وصف ہو سکتا نہیں ہے اس کے حُسنِ پاک کا بند حیرت سے ہے دم آئینہ ادراک کا

بند ہونا دم کا طوطی بلبل کے واسطے ہے۔آئینے کا دم بند ہونا اس کا ایجاد ہے۔''10

مولوی فرد کے احوال اور کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر چہ ابتدا میں بہار کے شعر و ادب پر دہلی کا اثر غالب تھا۔وہاں سے بُعد مکانی کے نتیجے میں بتدریج وہ کم ہوتا گیا اور لکھنویت کی طرف میلان زیادہ ہونے لگا۔پھر وہاں کی فکر، زبان اور طرز بیان پر مقامی اثرات (تلفظ اور لب ولہجہ رہ) نمایاں ہونے لگے۔اس ارتقائی عمل میں ان تینوں مراکز کے جغرافیائی حالات اور پیداوار

وغیرہ کو بھی دخل رہا ہے۔ اس سلسلے میں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ دہلی میں شراب (بہ شمول بادۂ معرفت) کا ذوق وشوق تھا۔ لکھنؤ میں افیون کا چسکا عام ہو گیا تھا اور بہار میں بھانگ اور گانجے کے دم لگائے جاتے تھے اور ان تینوں کے خواص ان علاقوں کی تحریروں میں بھی نمایاں ہو رہے تھے اور یہ خواص بھی ان کے مابین فرق و امتیاز کا سبب بنتے چلے گئے ہیں۔

9۔ محترم:

سعادت خاں ناصر کے تذکرے میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

''معزز اور مکرم خواجہ محترم علی خاں تخلص محترم، ساکن عظیم آباد شاگرد شاہ گھسیٹا عشق۔''11

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

اے محترم اتنی اشک باری کھل جائے ہے ابر بھی برس کر
پیغام پھر جنوں کے آنے لگے ہیں مجھ تک شاید بہار کے دن نزدیک آن پہنچے

مرثیہ

بہار کے علاقوں میں شروع شروع میں جن بزرگوں نے مرثیہ کی صنف کو رواج دیا، سب کے سب سُنّی مسلمان تھے چنانچہ شاہ آیت جوہری، غلام جیلانی محزوں، مفتی غلام مخدوم ثروت، شاہ نورالحق طپاں وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ توجہ ہیں۔ اس زمانے میں مرثیہ کی ہیئت متعین نہیں ہوئی تھی اور ہر شاعر جس طرح مناسب خیال کرتا تھا مرثیے کہہ لیتا تھا۔ جوہری نے مربع اور مسدس کی صورت میں مرثیے لکھے تھے۔ محزوں کے یہاں غزل کی ہیئت میں مرثیے ملتے ہیں۔ ثروت اور طپاں کے جو مرثیے دستیاب ہوئے ہیں بیشتر مربع کی شکل میں ہیں۔ یہ صورت بہت بعد تک بھی جاری رہی ہے۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے کے بعض مرثیہ گو شاعر یہ تھے۔

1۔ ترقی:

"شاہ امان علی نام تھا، بھلواری کے رہنے والے تھے اور شاہ آیت اللہ جوہری کے شاگرد تھے۔ ان کے جس مرثیہ کے تین بند پروفیسر اختر اورینوی نے نقل کیے ہیں وہ مسدس کی صورت میں ہے۔ پہلے چار مصرعے اردو میں ہیں اور ہر بند میں پانچواں چھٹا مصرع فارسی میں ہے۔ ایک بند یہ ہے۔

شب عاشور جو کی شہ نے عبادت میں بسر غم فرقت سے ہوئی چاک گریبانِ سحر

کہا سجاد کتنیں سرور دیں نے روکر آج ہووے گا جدا تن سے ہمارا یہ سر

نقد جاں را بر رہ دوست فدا خواہم کرد

سر خود گوئے بہ میدان رضا خواہم کرد" 1

کلہ گریبان متفقہ طور پر مذکر ہے۔ دوسرے مصرعے میں مونث نظم کیا ہے۔ تیسرے مصرعے کا مضمون توجہ طلب ہے کہ جان کو فدا کر دینے کا حوصلہ کرنے والا سر کے جدا ہونے کے غم سے رو رہا ہے۔ مرثیے عقیدت سے لکھے جاتے تھے اور عقیدت ہی سے پڑھے اور سنے جاتے تھے۔ ان پر گرفت یا اعتراض کرنا آداب کے خلاف تھا۔

2۔ ظہور

"یہ پھلواری کے رہنے والے شاہ نورالحق طپاں کے بیٹے تھے۔ شاہ ظہورالحق نام اور ظہور تخلص تھا۔ ان کے مرثیے عموماً مربع کی صورت میں ہیں اور زبان بھی اکثر مقامی ہے۔ ایک بندان کے مرثیہ کا ہے۔

کہیں سکینہ ہائے رے بابل، گیلو سو گیلو، گیلو ہے گیلو

دیس برانا بھو اور جنگل، گیلو سو گیلو، گیلو ہے گیلو

بیچ دیو نگری اپور کھول، گیلو سو گیلو، گیلو ہے گیلو

بال سورا جوگی راول، گیلو سو گیلو، گیلو ہے گیلو" 2

خانقاہ عمادیہ پٹنہ کے کتب خانہ میں ایک قلمی مجموعہ مراثی شاہ ظہورالحق ظہور کا محفوظ ہے 3 جس میں ان کے کچھ بیٹوں کا کلام بھی شامل ہے۔ اس مجموعہ کی کتابت خود مصنف نے کی ہے اس لحاظ سے یہ بہت [illegible] مقبول ہوا اس کا پہلا مصرع یہ ہے۔

[illegible]

کہوں میں ایک سخن اور خدائے غافر ہے

3۔ فرد:

ابوالحسن نام، عرف فردالاولیا۔ نام کی مناسبت سے فرد تخلص اختیار کیا تھا۔ شاہ محمد نعمت اللہ [illegible] سجادہ نشین پھلواری کے بیٹے اور نورالحق طپاں کے شاگرد تھے۔ فارسی میں ان کے دو دیوان تھے۔

ڈاکٹر اختر اورینوی نے لکھا ہے کہ:

''24 محرم 1265ھ (1848) کو انتقال کیا۔ مجھے فرد کے تیس پینتیس اردو مرثیے ملے ہیں۔ ایک مسدس کی ہیئت کا مرثیہ ہے۔''4

اس مرثیہ مسدس کا ایک بند یہ ہے۔

اس طرح قافلے پھرتے ہوئے کم ہو جاتے ہیں　　جس طرح آج کے دن اہل حرم جاتے ہیں
کفِ افسوس سبھی ملتے ہیں بہم جاتے ہیں　　تر بہ تر اشک سے سرتا بہ قدم جاتے ہیں

کاروانند　ونمدارند　درا　وجرسے
نہ رفیقے ، نہ ایسے ، نہ کسے ہمسفر

غلام علی راسخ کے ساتھ فرد کے اچھے روابط تھے۔ دونوں کے مابین خط و کتابت رہی ہے۔ ایک فارسی مکتوب

''غلام علی راسخ عظیم آبادی بہ نام شاہ ابوالحسن فرد بھلواروی''5

کی موجودگی اس حقیقت پر دال ہے۔

عظیم آباد میں مختلف بیٹھوں میں مرثیے لکھے تو گئے تھے لیکن زبان و بیان ہی نہیں مضامین اور مطالب کے اعتبار سے بھی ان کا معیار کچھ بلند نہیں تھا۔ بسا اوقات شعرا نے ایسے مضامین بھی نظم کیے ہیں جو بزرگانِ کربلا کے شایانِ شان ہرگز نہیں ہیں۔

مثنوی

اکبر شاہ ثانی کے زمانہ بادشاہت میں بہار کے علاقوں میں غزل کے بعد اردو شاعری کی سب سے زیادہ مقبول صنف مثنوی رہی ہے۔ بیشتر شاعروں نے اپنی اپنی پسند کے مطابق مثنویاں لکھی ہیں۔

1-راسخ:

غلام علی راسخ کے حال میں اختر اورینوی مرحوم نے لکھا ہے کہ ان کے مطبوعہ کلیات کے۔

"آخر میں پندرہ مختلف مثنویاں ہیں۔ قلمی نسخہ میں ان کے علاوہ اور تین مثنویاں بھی ہیں۔ یہ غیر مطبوعہ مثنویاں ہزلیات پر مشتمل ہیں۔ بعض مطبوعہ مثنویوں کے نام یہ ہیں:

1۔حسن وعشق	2۔ناز ونیاز	3۔نورالانظار	4۔گنجینۂ حسن
5۔سبیل نجات	6۔جذب عشق	7۔اعجاز عشق	8۔مکتوب شوق
9۔مراۃ الجمال	10۔شرح حال	11۔کشش عشق	12۔نیرنگ محبت
13۔شہر آشوب	14۔مثنوی مدحیہ		

اکثر مثنویوں میں عشق کی داستانیں نظم کی گئی ہیں۔ صرف نورالانظار ایک اخلاقی مثنوی ہے۔"1

ڈاکٹر ممتاز احمد نے بھی غیر مطبوعہ مثنویوں کو شامل کر کے اپنے مرتب کردہ مجموعہ ''مثنویاتِ راسخ'' میں سترہ مثنویاں شائع کی ہیں۔ بیشتر مثنویوں میں شاعر نے اپنی پریشان حالی کا ذکر کر کے کسی صاحب دولت سے صلے کی طلب کی ہے۔ مثنویاں عموماً حمد، نعت وغیرہ کے علاوہ توصیفِ عشق سے شروع کی ہیں اور ان میں ممدوح کی شجاعت، اس کے اسپ و تیغ وغیرہ کی ستائش بھی کی ہے۔ مثنویوں میں جن عشقیہ واردا توں کا بیان ہوا ہے، وہ عموماً راسخ کی آپ بیتی جیسی معلوم ہوتی ہیں۔

الف۔ حسن و عشق: شروع میں اس کا نام معدن فصاحت تھا۔ اس میں میر شیر علی افسوس کی تعریف کر کے اسے کمپنی بہادر کی نذر کیا تھا۔ پھر نظر ثانی کے بعد اس میں نواب غازی الدین حیدر کی مدح شامل کر کے اس کا نام حسن و عشق مقرر کیا ہے۔ اس میں اپنے بارے میں کہتے ہیں ۔

آرام کا عرصہ بس کہ ہے تنگ　　دل تنگی سے ہے عجب مرا رنگ
اس دائرہ فلک میں مجبور　　ہوں نقطے کی طرح آہ محصور

ب۔ ناز و نیاز: یہ مثنوی کتابی صورت میں کانپور میں 1267ھ میں الگ سے چھپ گئی تھی۔ اس میں دو سو سے زیادہ اشعار ہیں۔ شروع کے اسّی سے زائد شعروں میں ''توصیفِ عشق'' نظم کی ہے۔ ان کی زبان اور طرزِ بیان میں میر کا انداز جھلکتا ہے۔ شاید یہ راسخ کی ابتدائی مثنویوں میں سے ہے۔ اس کا قصہ عربی سے ماخوذ ہے۔

ج۔ نور الانظار: یہ راسخ کی سب سے طویل مثنوی ہے۔ اس میں کوئی سوا ہزار شعر ہیں۔ اس میں جامی کی سبحۃ ابرار کی تقلید کی گئی ہے اور پیری اور پیرانہ سالی کا ذکر کیا گیا ہے۔ بہ گمانِ غالب یہ راسخ کی آخر عمر کی تصنیف ہے۔ اپنے مطالب کی توضیح کے لیے شاعر نے بیچ بیچ میں حکایتیں نظم کی ہیں۔ یہ مثنوی انیس فصلوں پر منقسم ہے اور ہر فصل کو شاعر نے ''منظر'' کہا ہے اور اسی مناسبت سے مثنوی کا نام نور الانظار مقرر کیا ہے۔

د۔ گنجینۂ حُسن: اس مثنوی میں ایک سو اسّی سے زیادہ شعر ہیں۔ نعت و منقبت کے بعد شاعر نے عظیم آباد کی تعریف کی ہے۔ دعویٰ یہ ہے کہ یہاں کی برابر حسین جگہ موجود نہیں ہیں۔ اس مثنوی میں شاعر نے اپنی کسی معشوقہ کا سراپا نظم کیا ہے۔ اس سراپا میں اس نے بعض نئے عنوان قائم کیے ہیں۔

ہ۔ سبیلِ نجات: یہ راسخ کی سب سے مختصر مثنوی ہے۔ اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔

و۔ جذبِ عشق: اس مثنوی کی ابتدا توصیفِ عشق سے ہوتی ہے۔ اس حصہ کے چند شعر یہ ہیں۔

دل کے کاشانے کا دیا ہے عشق　　شمعِ ایوانِ کبریا ہے عشق
آبِ گوہر ہے اور آتشِ سنگ　　ہر جگہ اس کا اک نیا ہے رنگ
خون ہو برسا ابرِ مژگاں سے　　ٹپکا آنسو ہو چشمِ گریاں سے
تپِ غم ہو کے استخواں میں رہا　　ضعف ہو جانِ ناتواں میں رہا
گاہ رسوا کہیں رہا اک عمر　　کہیں پردہ نشیں رہا اک عمر
گاہ محفل نشینِ ناز ہوا　　کہیں سر تا قدم نیاز ہوا

اس مثنوی میں کسی حسینہ کے عشق میں مبتلا ہو کر ایک نوجوان کے قتل کیے جانے اور پھر اس کے غم میں اس حسینہ کے بھی جان دینے کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے یہ مثنوی قابلِ قدر ہے۔

ز۔ مکتوبِ شوق: یہ کوئی ڈیڑھ سو شعروں پر مشتمل ایک عشقیہ مثنوی ہے۔ اس میں شاعر نے جذباتِ عشق کو ایک مکتوب کی صورت میں نظم کیا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ اس میں مبالغہ کا عنصر کم سے کم ہے۔

ح۔ اعجازِ عشق: اس مثنوی میں بھی ایک عشقیہ کہانی نظم کی گئی ہے لیکن اس میں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی ہے۔ شاید یہ ابتدائی زمانے کی تصنیف ہے۔

ط۔ مراۃ الجمال: یہ اسی قسم کی مثنوی ہے جیسی گنجینۂ حُسن ہے۔ اس میں راسخ نے کلکتہ شہر اور وہاں کے حسینوں کی تعریف کی ہے۔ ایک رقاصہ پر خود اپنے عاشق ہو جانے کا واقعہ نظم کیا ہے اور اسی سلسلے میں اس کا سراپا بھی بیان کیا ہے۔ سراپا نگاری سے راسخ کو بہت دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔

ی۔ شرحِ حال: راسخ اپنے سفر کے زمانے میں مہاراجا جگرناتھ بہادر کے مقروض ہو گئے تھے۔ راجا نے ان کو قید کر دیا۔ اس موقع پر انھوں نے اپنی بدقسمتی کے بیان میں یہ مثنوی لکھی تھی۔ اس میں راجا کی تعریف کر کے اس سے رہائی کی درخواست کی ہے تاکہ اپنے وطن جا سکیں۔

ک۔ کششِ عشق: یہ راسخ کی ابتدائی مثنویوں میں سے ہے۔ حمد، نعت وغیرہ کے بعد

شاعر نے اس میں نواب آصف الدولہ اور ان کے شہر لکھنو کی تعریف کی ہے اور پھر ایک عشقیہ کہانی نظم کی ہے۔ نظرِ ثانی اور ترمیم اور اضافے کے بعد راسخ نے یہ مثنوی سرکار کمپنی بہادر کی خدمت میں پیش کی تھی۔ بصورتِ موجودہ یہ ان کی کامیاب عشقیہ مثنویوں میں سے ہے۔

ل۔ نیرنگِ محبت: یہ راسخ کی عشقیہ مثنویوں میں سے ایک ہے لیکن جس طرح قصہ کا بیان کیا گیا ہے۔ اسے کامیاب نہیں کہا جا سکتا ہے۔ قصہ کم و بیش وہی ہے جو مومن کی مثنوی شعلۂ آتشیں میں ہے۔

م۔ شہر آشوب: اس مثنوی کا عنوان اس طرح قائم کیا گیا ہے:

''در بیان انقلابِ زمانہ و شکایتِ فلک و مجملاً احوالِ مقیمان بلدۂ عظیم آباد۔''

اس مثنوی میں پٹنہ کے روؤسا، مشائخ، سپاہی، اطبا اور تجار وغیرہ مختلف طبقوں کے لوگوں کی بدحالی کا بیان کیا ہے۔ راسخ کے زمانے کے حالات کو سمجھنے کے لیے یہ مثنوی ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

س۔ مثنوی مدحیہ: اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے البتہ ممدوح کا نام شاعر نے ظاہر نہیں کیا ہے۔ غلام علی راسخ کی مذکورہ مثنویوں کے علاوہ تین حکایات ہزل اور بھی ہیں اور وہ سب نہایت فحش ہیں:

راسخ کی دستیاب مثنویوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ پروفیسر اختر اورینوی نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

''بلخی نے پندرہ کی تعداد لکھی ہے اور حمید عظیم آبادی نے چودہ کی۔''[2]

چنانچہ اوپر بھی چودہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ پندرھویں کا حال کچھ معلوم نہیں۔ تین حکایتیں جن کا مذکور ہوا، غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور مثنوی کا تعارف قاضی محمد سعید نے اس طرح کرایا ہے:

''ایک اردو مثنوی، جابجا فارسی اشعار بطور عنوانات مختلف بحر میں، آغاز مثنوی ؎

الٰہی دل کو سرگرمِ جنوں کر''

ایک شعر۔

پہنچ ساقی پہنچ اے جانِ راسخ تمنائے دلِ ویرانِ راسخ" 3

اس پر مشعر ہے کہ مثنوی راسخ کی ہے اور اس کے سوا کہ یہ کلیاتِ راسخ (غلام علی) کے مطبوعہ یا خطی نسخوں میں نہیں۔ کوئی بات ایسی نہیں جو یہ سمجھنے سے مانع ہو کہ صاحبِ کلیات کی تصنیف ہے۔ اس کے متعلق تبصرہ مثنویاتِ راسخ شائع کردۂ ہماری زبان میں لکھا جا چکا ہے۔

مثنوی ناقص الآخر۔

"ایک جگہ ضمناً "نامۂ راسخ" کے نام سے ایک مثنوی کا ذکر آیا ہے۔ شاید یہ وہی ہو جس کا ذکر اوپر "مکتوبِ شوق" کے نام سے کیا جا چکا ہے۔ واللہ اعلم" 4

ان تفصیلات سے ظاہر ہے کہ راسخ کو مثنوی کی صنف سے غیر معمولی دلچسپی تھی اور ان کا شمار اردو میں سب سے زیادہ مثنویاں لکھنے والے چند شاعروں میں کیا جانا چاہیے۔ ان کی بعض مثنویاں یقیناً اردو کی بہترین مثنویوں میں سے ہیں۔

2-عاشق:

راجا کلیان سنگھ عاشق کا ذکر گذشتہ اوراق میں کیا جا چکا ہے۔ ان کی ایک مثنوی کا پتہ چلتا ہے۔ 5 یہ مثنوی بھی دستور کے مطابق حمد، نعت وغیرہ سے شروع ہوتی ہے۔ نعت کے تین متفرق شعر یہ ہیں۔

محمدؐ سزاوارِ دیدار ہے کہ تیرا وہ یارِ وفادار ہے
محمدؐ ہے محبوبِ پروردگار محمدؐ ہے مطلوب پروردگار
محمدؐ کی سب سے بڑی شان ہے محمدؐ کا چاکر سلیمان ہے

اس مثنوی میں بھی رواج کے مطابق ایک عشقیہ داستان نظم کی گئی ہے۔ شاہزادے کی عشرت سامانیوں کا بیان اس طور پر کیا ہے۔

حریم اس کے تھے نازنینوں سے پُر گھر اس شاہ کا مہ جبینوں سے پُر
شب و روز عشرت سے تھا اس کو کام بے خرمی سے تھا لبریز جام
قمر طلعتوں سے ہم آغوش تھا صراحیِ عشرت سے مے نوش تھا

پھر اسی مثنوی میں شاعر نے ہجر میں اس کی محبوبہ کی کیفیت کو اس طرح نظم کیا ہے۔

سلگنے لگی غم سے وہ دل جلی ہوئی اس کے دل کو عجب بیکلی
گیا دل سے آرام اور جی سے چین ہوئے مثلِ اشک ریز اس کے نین

بطور مجموعی یہ ایک اچھی مثنوی کہی جاسکتی ہے۔

راجا کلیان سنگھ عاشق کے متوسلوں میں بعض شاعر بھی تھے۔ ان میں سے کسی نے ایک مثنوی لکھی تھی۔ اس کا تعارف قاضی محمد سعید نے اس طرح کرایا ہے:

''مثنوی ایک سو چھبیس اشعار مجہول المصنف، کلیان سنگھ کے زمانہ نیابت کی تصنیف۔ کہوں حمد میں پاک پروردگار'' [8]

یہ بات توجہ طلب ہے کہ حمد و نعت وغیرہ کے مضامین اس زمانے میں مسلمانوں کی طرح جوش و خروش کے ساتھ غیر مسلم بھی نظم کرتے تھے، اس لیے محض ان سے کسی شاعر کے عقیدے کا تعین نہیں ہوسکتا ہے۔

3- کم و بیش اسی زمانے کی ایک اور مثنوی کا قاضی محمد سعید نے پتا دیا ہے، لکھا ہے:

''مثنوی گلگلو بہ محبت از راجا درگا پرشاد شاد عظیم آبادی
۔ لائق حمد ہے وہ بے ہمتا
تصنیف 1227ھ ظاہراً نسخہ مطبوعہ کی نقل۔'' [9]

عظیم آباد کی مثنویوں کی تلاش و تحقیق اور پھر ان کے مطالعہ و تجزیہ کا کام جیسا کہ چاہیے تا حال نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرف توجہ کی ضرورت ہے۔ توقع ہے کہ خذف ریزوں کے ڈھیر میں بعض جواہر آبدار بھی سامنے آجائیں گے۔

تاریخ گوئی

1۔ عاشقی

تذکروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ بہار کو فنِ تاریخ گوئی سے خصوصی شغف رہا ہے۔ اکبر شاہ ثانی کے ابتدائی زمانے میں آقا حسین قلی خاں عظیم آبادی نے اردو اور فارسی کے شاعروں کا ایک تذکرہ نشترِ عشق کے نام سے لکھا تھا۔ اس تذکرہ کے آغاز کی تاریخ اس نے ''نشترِ رگِ جاں'' سے نکالی تھی۔ پروفیسر عطا کاکوی نے اس تذکرے کے بارے میں لکھا ہے:

1224ھ

''اور تذکرہ نگاروں کی بہ نسبت مؤلف نے حالات کی فراہمی، سنین ولادت ووفات اور دیگر ضروری معلومات کے بیان کرنے میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔''[1]

واقعہ یہ ہے کہ اس شخص کو تاریخیں کہنے کا نہایت شوق تھا چنانچہ اس نے خود اپنی پیدائش کا قطعۂ تاریخ بھی اس طرح لکھا ہے:

''یہ ناچیز عظیم آباد معروف بہ پٹنہ میں 1194ھ میں پیدا ہوا۔ خود راقم نے اپنی ولادت کی تاریخ کہی۔

جمعہ و ہفتمِ محرم را کردم از عالمِ نہفتہ طلوع

چوں بجستم سنِ ولادتِ خویش گفت ہاتف کہ اے بخجستہ طلوع"2

1194ھ

اس تذکرے میں کئی واقعات کی تاریخیں بھی خود مولف نے کہہ کر درج کی ہیں۔

2۔قمر علی

خطۂ بہار میں تاریخ گوئی کا شوق اس حد تک عام ہو گیا تھا کہ وہاں کے بعض غیر معروف شاعر بھی تاریخیں کہنے لگے تھے۔ڈاکٹر سید شاہد اقبال نے قصبہ مہدانواں کے ایک گمنام شاعر کے تعارف میں لکھا ہے۔

"قاضی قمر علی مہدانوی،شاہ رمضان علی (متوفی 7۔شوال 1231ھ/1816) کے فرزندِ اصغر تھے اور اپنے وقت کے مشہور بزرگ تھے۔وہ اردو اور فارسی میں عمدہ شعر کہتے تھے اور مادّہ تاریخ نکالنے میں ان کو مہارت تھی۔مولانا عبدالرحیم صادق پوری کا بیان ہے کہ انھوں نے خود اس گلستاں کو دیکھا ہے جو قاضی قمر علی نے ایک شب میں لکھی تھی.....قاضی قمر علی کا انتقال 1249ھ(1853) میں ہوا اور مہدانواں میں مدفون ہوئے۔3 حکیم مولوی شاہ محمد واعظ نے تاریخ وفات لکھی

قطعہ تاریخ رحلت

قمر چوں رفتہ زیں دارِ پُرآشوب رسیدہ درمقام قرب ابرار

بواعظ گفت ہاتف سالِ موتش بایوان ارم رفتہ ازیں دار

شوال 1249ھ(1853)3"

قابل توجہ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر شاہد اقبال نے قمر علی کا تخلص بھی نہیں لکھا ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ باقاعدہ شاعر نہیں تھے۔افسوس اس بات کا ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے ان کی تاریخ کا کوئی نمونہ بھی پیش نہیں کیا ہے۔

ان کے علاوہ بہار کے اس دور کے سبھی قابلِ ذکر شاعروں نے اِکّا دُکّا قطعاتِ تاریخ کہہ کر اپنی خوش فکری کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

واسوخت، ہجو وغیرہ

بہار کے خطے پر بہت پہلے انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ کامیابی اور فتحیابی کے زعم میں ان کی طرف سے اکثر بے اعتدالیاں اور زیادتیاں سرزد ہوتی رہتی تھیں۔ وہ ہندوستانیوں کو حقارت سے نیٹیو (Native) کہتے تھے۔ بنارس تک کی تحریروں میں اس لفظ کا استعمال دیکھا جا سکتا ہے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ملک کے گوشے گوشے میں ہندستانیوں کے دلوں میں ان کے خلاف جذبات پیدا ہونے لگے تھے۔ اس زمانے کی اردو شاعری میں اس قسم کے جذبات کا خاصی صراحت کے ساتھ اظہار ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس پہلو کی طرف اہلِ تحقیق کو کما حقہ توجہ نہیں ہوئی ہے۔ یہاں صرف دو واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔

(الف) میاں یحییٰ جونپوری محمد شاہ بادشاہ کے زمانے کے ایک شاعر تھے۔ انصاف تخلص کرتے تھے۔ ان کے حال میں امراللہ الٰہ آبادی نے یہ لطیفہ نقل کیا ہے:

> ''انگریزوں کی عمل داری کی ابتدا میں ان (انگریزوں) کے بعض ملازمین نے ان (میاں یحییٰ انصاف) کے باغیچہ میں گھس کر زبردستی چند درختوں کو اکھاڑ پھینکا۔ انھیں (انصاف کو) خبر ملی تو چند شعر فی البدیہہ کہے۔ ایک یہ ہے۔
>
> جا کہو عیسیٰ سے کیا تم مر گئے اپنے گدھے باندھو، کھیتی پڑ گئے'' 1

(ب) عظیم آباد میں یورپی اقوام نے بہت پہلے قدم جمانے شروع کر دیے تھے۔ انھوں نے عیسائی مذہب کی ترویج واشاعت میں بہت محنت کی تھی۔ جگہ جگہ اپنی عبادت گاہیں جن کو گرجا کہتے تھے تعمیر کرنی شروع کر دی تھیں۔ داؤد بیگ دہلوی نے جو اپنے نام کی مناسبت سے داؤد تخلص کرتے تھے اور میاں شرف الدین مضمون کے شاگرد تھے، ان کے حالات میں کہا ہے کہ:

"جب عظیم آباد میں گرجا کی تعمیر ہوئی تو (انھوں نے) یہ شعر کہا۔

دانا یہی کہے گا گو اس میں اس کا سرجا معبد فرنگیوں کا یارب تمام گرجا" 2

بہار کا علاقہ شاہ عالم ثانی کے ابتدائی زمانے میں ہی براہ راست انگریزوں کے عمل میں آ گیا تھا۔ وہاں کے باشندے ان کے تسلط سے بہ شدت متاثر ہو رہے تھے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس خطہ کے شاعروں نے شہر آشوب، واسوخت اور ہجو وغیرہ اصناف شعری کو بھی اپنی فکر وطبّاعی کی جولانگاہ بنایا تھا۔

شاہ آیت اللہ جوہری کے حالات میں مذکور ہے کہ انھوں نے شہر آشوب لکھا تھا۔

شاہ محمد علی سجاد نعمتی پھلواروی کے دیوان میں ایک واسوخت بہ صورت مثمن موجود ہے۔ 3

یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ دوسرے شاعروں نے شہر آشوب اور واسوخت نہیں لکھے تھے۔ اس زمانے کے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر اہل بہار نے انگریزوں اور ان کی بستیوں وغیرہ کی مذمت بھی کی تھی۔ بعض ہجویات جن کا مذکور مل سکا، یہ ہیں:

(الف) "ہجو 4 نوشۂ راست گو

ع دے جو حکوم نصاریٰ بن گئے

(ب) "کارخانہ قضا کا۔ 232 شعر۔ مثنوی، جس میں ہجو کلکتہ و فرنگیان ہے۔

مصنف رسائی (یہ شخص) دہلی سے مرشد آباد اور وہاں سے کلکتہ گیا تھا۔" 5

(ج) "در سنہ دوازدہ صد و پنجاہ ہجری مسٹر ہارن ٹین صاحب جج و میری صاحب مجسٹریٹ در عظیم آباد کہ بودند، چناں ستم رانی کردند کہ از آہ بیکساں ہر دو..... آخر کار مردود گشتند و منشی سکھن لعل پیشکار محکمہ جج از کثرت رشوت ستانی سزائے اعمال رسیدہ، موقوف از روزگار گردیدہ و خلق اللہ بہ ایں مضمون فریاد برآوردند، ایں است

مصرع.....اے نکان لندن مسیحی دقار

اگر تم سے چھوٹے گا ہندوستان یہ بسکٹ نفن حاضری پھر کہاں

ولایت کااحوال تو ہے عیاں نہ یہ چائے پانی نہ مکھن وہاں

اس ہجو کا مصنف بصیر.....مولوی خیرات علی ضلع گورکھپور راخاک سیاہ فرسودہ روبہ ضلع عظیم آباد آوردند قتال جہاں شدند..... ان کی ہجو میں ایک رباعی۔ یہ ڈپٹی (Deputy) تھے۔ ہجو فضل الحق ساکن بنگالہ صدر اعلیٰ چھپرہ۔ مدح مولوی گوہر علی ساکن ڈیانواں سرشتہ دار بورڈ ضلع عظیم آباد، ہجو علی بخش 1251ھ (1835) میں ایڈیشنل صدر الصدور آرہ۔ ہجو منشی امداد علی ساکن سرائے پسورہ صدر الصدور دوم پٹنہ، ہجو مولوی اظہار تھانیدار پیر بہوڑ پٹنہ 50ھ، ہجو منشی افضل علی سرشتہ دار، مولوی واجد حسین متوطن سگریچہ ضلع پٹنہ، ڈپٹی مولوی سیف اللہ صدر امین ضلع سارن۔"[6]

ہجویات دوسرے مراکز پر بھی لکھی گئی تھیں اور ان میں معاشرے کی خرابیوں کی کم وبیش نشاندہی کی گئی تھی لیکن عظیم آباد میں سرکار کمپنی بہادر کے کارکنوں اور اعلیٰ انگریز افسروں کی جو ہجویات لکھی گئی تھیں ان کی تواریخی نقطہ نظر سے بھی اہمیت ہے۔ ان ہجویات سے پتا چلتا ہے کہ انگریزی عمل داری کے قیام کے زمانے میں ہندوستانی رعایا پر کس طور سے ظلم وزیادتی کی گئی تھی اور رشوت ستانی وغیرہ کا کس حد تک زور تھا۔ اس سلسلے میں ہندوستانی باشندوں خصوصاً مسلمانوں کے رویہ اور معاملات کو سمجھنے کے لیے ان ہجویات کی افادیت ظاہر ہے۔

نثر

اردو نثر کے فروغ میں بہار کے خطّے کو اہمیت حاصل ہے۔ کئی برس ہوئے جب جناب تمنا عمادی مجیبی نے عمادالدین قلندر چلواروی سے منسوب ایک نثری رسالہ پیش کیا تھا جس کا نام: ''رسالہ صراطِ مستقیم معروف بہ سیدھا رستہ'' تھا۔ اس کا سالِ تصنیف 1081ھ بتایا گیا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر اختر اورینوی کو اس دعوے کی صحت پر اصرار تھا، قاضی عبدالودود وغیرہ محققین نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ بہرنوع یہ امر واقعی ہے کہ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں بہار کے علاقوں میں اردو نثر نویسی کا چلن ہو چکا تھا اور اکثر صاحبانِ قلم اس طرف مائل ہو چکے تھے۔ بعض کا یہاں تعارف کرایا جاتا ہے۔

1۔ ظہورالحق ظہور

پروفیسر اختر اورینوی کی تحریر کے مطابق شاہ ظہورالحق ظہور عظیم آبادی کا زمانہ 1185ھ سے 1234ھ تک کا ہے اور ان سے جو نثری رسالے منسوب ہیں ان کے نام اس طرح ہیں:

1۔ رسالۂ نماز 2۔ فضائلِ رمضان 3۔ فیض عام 4۔ کسب النبی

کتب خانہ خانقاہ عمادیہ، منگل تالاب، پٹنہ میں ایک قلمی ''مجموعۂ قطعات تاریخ'' محفوظ ہے جس سے شاہ ظہورالحق کے بارے میں بہت سی مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں مثلاً:

شاہ ظہور الحق کا فارغ التحصیل ہونا	1200ھ
ان کا خلافتِ پدر پر فائز ہونا	1211ھ
ولادت پسران شاہ ظہور الحق	(چھ بیٹے)

وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ ظہور نے تصنیف و تالیف کا کام کب شروع کیا تھا البتہ قیاس چاہتا ہے کہ خلافتِ پدر پر فائز ہونے کے بعد عقیدت مندوں کے فائدہ کے لیے مذہبی امور سے متعلق انھوں نے چھوٹے چھوٹے رسالے لکھنے شروع کیے ہوں گے۔ کیفیت ان کی اس طرح ہے:

''تیسر الصلوٰۃ جسے اوپر رسالہ نماز کہا گیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ یہ بیس صفحوں کا رسالہ ہے۔ اس کا سالِ تصنیف معلوم نہیں۔ شاید یہ مصنف کا ابتدائی رسالہ ہوگا۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے۔

اللہ کا رحم بنی آدم پر نہایت ہوا کہ اس کی ہدایت کے واسطے ایسا رسول مقبول بھیجا کہ جب وہ معراج سے مشرف ہوئے تو نماز پنجگانہ پر تو معراج کا رکھتی ہے.....الخ ''3

اور ان دعائیہ کلمات پر مصنف نے اس رسالے کو ختم کیا ہے:

اے پروردگار ہمارے دے ہم کو بیچ آخرت کے بھلائی اور بچا ہم کو عذاب سے آگ کے۔''

یہ رسالہ مفید مطبع احمدی مدراس سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

فضائل رمضان۔ یہ بھی کم و بیش اُسی ابتدائی زمانے کا رسالہ ہے۔ اس کے مباحث بھی اس کے نام سے ظاہر ہیں۔

رسالہ فیض عام۔ اس کا سالِ تصنیف 1228ھ (1813) بتایا گیا ہے اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:

''بیس سال پہلے ہجرت کے کتنے واقعے درپیش ہوئے۔ پہلا تو مسلمان ہونا عبداللہ بن سلام یہودی کا کہ مدینہ میں رہتے تھے اور اپنی قوم میں تھے۔ یہ محمد مشاہدہ کرنے شواہد کے خود اور چند یار اُن کے دولتِ اسلام سے مشرف ہوئے۔''

کسب النبی۔ اس نام کے دو رسالے شاہ ظہور نے لکھے تھے۔ ایک رسالہ جو ضخیم ہے اس کا

موضوع اخلاق النبی ہے۔4

دوسرا رسالہ مواعظ پر مشتمل ہے۔اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے 5 اور وہ صرف بارہ صفحوں پر محیط ہے۔اس میں اہلِ حرفت کے فضائل کا بیان کیا گیا ہے اور قرآن، حدیث اور فقہ سے ثابت کیا ہے کہ جو کوئی کھیتی کرنے، کپڑے سینے اور بُننے اور حرفت کرنے والے کو بُرا سمجھتا ہے وہ مردود ہے۔

رسالے کا آغاز اس طرح کیا ہے:

اَلحَمدُلِلّٰہ الّذی قَالَ فی القُرآن اناجعلناکم قبائل وشعوباً...اَمّابَعد

عاصی ظہورالحق عظیم آبادی عفی اللہ عنہ نے.....ن

حمد اس کو جو ہے پاک ومستطاب　　اس نے فرمایا ہے یہ اندر کتاب

تم نے ناٹے اور کوٹے کردیے　　معرفت کے واسطے نہ فخر کے

اور اختتام اس شعر پر اس رسالے کا ہوا ہے۔

ہے نام اس رسالے کا کسب النبی　　موافق کتاب اور سنت جلی

اس کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:

بات یہ ہے کہ لوگ ناواقف کاری کے سبب اکثر کسب وحرفت کر کے جس کو نیبوں نے کیا ہے ذلیل اور حقیر سمجھتے ہیں۔اس کا حال مختصر سا یہاں پر بیان کیا جاتا ہے کہ لوگ واقف ہو جائیں اور اس کے حرفت کر کے دکھلاویں اور خوب سیکھیں اور سکھلادیں۔

یہاں قابل توجہ امر یہ ہے کہ اُس زمانے میں معیشت اور معاشرت کو مذہب سے متعلق سمجھا جاتا تھا اور مذہبی جذبات اور اصول کے ساتھ صنعت وحرفت کے میدان میں ترقی چاہتے تھے۔

2۔محمد تقی بلخی فردوسی

شاہ محمد تقی بلخی بھی اسی زمانے کے ایک صاحب علم بزرگ تھے۔ان سے اردو نثر میں ایک رسالہ منسوب ہے جس کا ترقیمہ اس طرح ہے:

تمام ہوئی یہ کتاب ترجمہ ہندی تصنیف شاہ محمد تقی بلخی فردوسی مدظلہ کی، خطِ خام سے

عاصی حقیر سراپا تقصیر شیخ برات علی ولد شیخ نجیب علی انصاری رہنے والے محلہ عالم گنج

متعلقہ شہر عظیم آباد، حال سکونت موضع ارندہ ضلع شہر مذکور بیچ تاریخ دوازدہم شہر ذیقعدہ 1248 فصلی۔"5

اس رسالے کا نام "احکام اسلام" بتایا گیا ہے[6] اور یہ لکھا ہے کہ "یہ 1283ھ میں ٹیابرج کلکتہ میں مرزا مہدی حسن کے اہتمام سے طبع ہوئی ہے۔ صفحہ 216 پر کتاب تمام ہوئی ہے۔" اس کے بارے میں خود مصنف کا بیان ہے کہ:

"مسایلات چند کہ جاننا اس کا ضروریات دین سے تھا، کتابیں معتبر سے چن کر زبان ہندی میں ترجمہ کیا گیا اور خوف درازی کلام سے سندلاناں ان کتابوں کا ترک ہوا.....اور نام اس کتاب کا 'احکام' رکھا گیا اور یہ ترجمہ میں تین کتاب ہے باب باب اور فصل فصل۔

کتاب پہلی بیچ بیان ایمان کے اور یہ باب پانچ فصل ہے۔ فصل پہلی بیچ بیان حقیقت ایمان کے، فصل دوسری بیچ بیان ایمان لانے کے ساتھ خدا کے، فصل تیسری بیچ ایمان لانے ساتھ فرشتہ کے، فصل چوتھی بیچ ایمان لانے ساتھ کتابیں خدا کی اور پیغامبرین اس کے، فصل پانچویں بیچ بیان ایمان لانے ساتھ موال منکر نکیر اور قیامت وغیرہ کے۔"7

اس میں دوسری کتاب شرح اعمال اور تیسری تفصیل شریعت سے متعلق ہے۔ بطور مجموعی اسلامی عقاید سے متعلق یہ ایک قابل قدر کتاب ہے۔

3۔ ولایت علی:

اپنے زمانے کے صاحب قلم مذہبی بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے ایک سے زیادہ مذہبی رسالے دستیاب ہیں جو دور دراز علاقوں تک میں مقبول و مروج تھے۔

"ایک رسالہ تیسیر الصلاۃ نماز کے مسائل و آداب سے متعلق ہے جو ان کی زندگی میں 1250ھ میں مطبع احمدی شہر پنڈوہ متعلقہ ضلع ہوگلی میں چھپا تھا، اس مطبوعہ نسخہ کی ایک نقل ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ یہ نقل بمقام سیتا بنڈہ، قریب شہر ناگپور کامٹی میں سپاہی محمد رسول کے مطالعہ کے لیے تیار کی گئی تھی۔[8] اس کے آخر میں

لکھا ہے:

اس رسالے کے مصنف کا نام مولوی ولایت علی سلمہ اللہ تعالیٰ عظیم آبادی ہے۔ یہ تین باتیں خاتمے کی فقیر ہیچمدان خیر خواہ خلق اللہ سید عبداللہ عفا اللہ عنہ وعن والدیہ اس رسالے کے مصحح کی طبع زاد ہیں۔

الٰہی تو دے اس مصنف کو نیکی　　بھلائی ہمیں جس نے یہ بات اچھی
عمل جو مسلمان اس پر کرے گا　　بفضلِ الٰہی وہ مقبول ہوگا
نہ چھوٹے یہاں اس کی اس سے نماز　　بہشتی کرے وہاں اسے کارساز

رسالہ تیسر الصلوٰۃ کی ابتدا درج ذیل کلمات سے ہوئی ہے:

''اللہ کا رحم بنی آدم پر نہایت ہُوا کہ اس کی ہدایت کے واسطے ایسا رسول مقبول بھیجا کہ جب وہ معراج سے مشرف ہوئے تو نماز پنجگانہ کہ پر تو معراج کا رکھتی ہے ہمارے واسطے بھی حصہ لیتے آئے۔''

اور اس کے آخر کے فقرے اس طرح ہیں:

''جو مردہ دفن ہو چکا ہے تو نماز اس کی قبر پر جا کر پڑھے اور جو کوئی ایک بھی مسلمان قبر پر کسی طرح حاضر نہ ہو سکے تو دور ہی سے پڑھے۔ یہ حدیثیں اس رسالے کی مشکوٰۃ شریف میں موجود ہیں۔''

یہ پندرہ ورقی رسالہ ہے اور ہر صفحہ پر تیرہ سطریں ہیں۔ تعجب ہے کہ یہی رسالہ مولوی ظہور الحق ظہور سے بھی منسوب ہے چنانچہ وہاں اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ وہ انتساب صحیح نہ ہوگا اور یہ رسالہ مولوی ولایت علی ہی کا تصنیف کردہ ہے۔

مولوی ولایت علی عظیم آبادی کا ایک اور رسالہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں موجود ہے۔ یہ کل سترہ صفحوں پر محیط ہے اور اس کے بھی ہر صفحہ پر تیرہ سطریں ہیں۔ ترقیمہ میں مصنف کا نام اس طرح آیا ہے:

''ایں رسالہ نکاح ثانی تصنیف مولوی ولایت علی واعظ ساکن عظیم آباد بہ یدِ محمد شرف الدین۔''[9]

ہندوؤں کے اثر سے مسلمانوں میں بھی بیوہ عورتوں کے عقدِ ثانی کو معیوب خیال کیا جانے لگا تھا۔ اس قبیح خیال کو دور کرنے کے لیے مولوی ولایت علی نے یہ رسالہ تالیف کیا تھا۔ اس کی ابتدا مولف نے اس طرح کی ہے:

"سب خوبیاں اللہ ہی میں ہیں اور اللہ کے ہوتے دوسرے کی تعریف کرنا اللہ کی قدر دانی سے بعید ہے اور درود محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعد ان کی آل واصحاب کو کہ سوائے ان کی پیروی کے کسی طرح نجات نہیں اور اس کی التماس یوں ہے۔ اوّل تو انسان کو لازم ہے دنیا کی حقیقت کو سمجھے کہ اگلے لوگ دنیا سے کیا لے گئے۔"

جیسا کہ رسالے کے نام سے ظاہر ہے اس رسالے میں نکاح ثانی کے فوائد اور احکام بیان کیا گیا ہے۔ اس کے خاتمے کے کلمات اس طرح ہیں:

"رحم کر اپنی جوان بیٹی پر کسی کو ڈھونڈ کر اس کا نکاح جلدی کر، وگرنہ دیکھیو مستی میں جس دن آوے گی ضرور گھر میں تیرے آگ وہ لگا دے گی۔"

زبان ان دونوں رسالوں کی صاف اور سلیس ہے۔ باوجودیکہ موضوع ان کا عقیدہ و مذہب ہے، مولف نے عربی فارسی کے نامانوس اور ثقیل الفاظ کا استعمال کم سے کم کیا ہے۔ تعقید کے عیب سے بھی اس نے اپنی تحریر کو بحدِ امکان بچانے کی کوشش کی ہے۔

4۔ ذوالفقار علی:

یہ اپنے وقت کے فارسی کے عالموں میں سے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان میں فارسی کے ایک مذہبی رسالے کا ترجمہ کیا تھا۔ اس ترجمے کے قلمی نسخہ کے تعارف میں قاضی محمد سعید مرحوم نے تحریر کیا ہے:

"وسیلۃ النجات نثر، ترجمہ سبیل النجات مصنفہ احمد اصفہانی جو 1224ھ میں پٹنہ میں وارد ہوئے۔

مترجم ذوالفقار علی رضوی عظیم آبادی، سال ترجمہ 1234ھ (=1819)

آغاز: حمد اور احسانش بے پایاں.....10

کتب خانہ خدا بخش کی اردو مخطوطات کی فہرست میں بھی "وسیلۃ النجات" کے نام سے

ایک کتاب کا مذکور ہے۔ اسے مجہول المصنف بتایا گیا ہے۔ مرتب فہرست عابد امام زیدی نے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ملا محمد باقر مجلسی کی کتاب جلاء العیون کا ترجمہ ہے۔ مترجم کا نام کتاب میں کہیں نہیں ہے۔''11

غالباً یہ وہی کتاب ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

پٹنہ یونیورسٹی کے کتب خانہ میں بھی ذوالفقار علی رضوی عظیم آبادی کی ایک قلمی کتاب ''حفیظ المؤمنین'' کے نام سے موجود ہے۔ ظاہراً یہ ذوالفقار علی اپنے زمانے کے معروف مذہبی عالموں میں سے تھے اور ان کی تحریریں اس علاقے میں مقبول تھیں۔

بہار کے علاقے میں بعض قصے، کہانی اور سوانحات بھی لکھے گئے تھے۔ یہ شاید کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کی علمی سرگرمیوں کا اثر رہا ہوگا۔ بہار میں لکھے جانے والے ایک نثری رسالے کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

''رسالہ نثر، ناقص الاول، آخر میں لکھا ہے: راقم سید محمد وحید''12

مالکِ کتاب نے لکھا ہے کہ ''سید شاہ عبدالوحید وحید ساکن محی الدین پور ضلع پٹنہ نے آخوند عبدالغفور ساکن سوات کے حالات اس رسالے میں تحریر کیے ہیں:

اس قسم کی اور بھی ایک دو تحریروں کا ذکر ضمناً ملتا ہے جن سے اہل بہار کی علمی دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس خطّہ کے علمی آثار کی تلاش کر کے ان کے مطالعہ اور تجزیہ کا کام کیا جانا ہے تا کہ صحیح صورت حال کا علم حاصل ہو سکے۔

حواشی

غزل

1۔ گلشن سخن	ص117
2۔ ایضاً	ص189
3۔ گلشن ہند	ص183
4۔ بہار میں اردو زبان وادب	ص338 تا345
5۔ گلشن بے خار	ص85
6۔ بہار میں اردو زبان وادب	ص300 تا305
7۔ سخن شعرا	ص363
8۔ ایضاً	ص567
9۔ سراپا سخن	ص163، 202، 286
10۔ خوش معرکہ زیبا جلد1	ص415
11۔ ایضاً جلد1	ص309

مرثیہ

1۔ بہار میں اردو زبان وادب	ص ص338 تا345
2۔ ایضاً	ص //

3۔مخطوطات نمائش پٹنہ ص62

4۔بہار میں اردو زبان وادب ص304

5۔مخطوطات نمائش پٹنہ ص62

مثنوی

1-2-بہار میں اردو زبان وادب ص304

3۔مخطوطات نمائش پٹنہ ص62

4-5-ایضاً ص4

6۔ایضاً ص6

7۔ایضاً ص109

تاریخ گوئی

1۔نشترعشق ص6

2۔ایضاً ص100

3۔تذکرہ مہدانواں ص31تا32

واسوخت وہجو

1-مسرت افزا ص45

2-تذکرہ شورش ص56

3-مخطوطات نمائش پٹنہ ص10

4-ایضاً ص4

5-ایضاً ص6

6-ایضاً ص79

نثر

1۔ بہار میں اردو زبان وادب	ص348 تا353
2۔ ایضاً	ص353 تا357
3۔ اردو مخطوطات آصفیہ ج1	ص151
4۔ قاموس الکتب ج1	ص764
5۔ اردو مخطوطات آصفیہ ج2	ص351 تا352
6۔ بہار میں اردو زبان وادب	ص357 تا361
7۔ قاموس الکتب ج1	ص203
8۔ تذکرۂ مخطوطات ج5	ص153
9۔ آصفیہ ج2	ص134
10۔ مخطوطات نمائش پٹنہ	ص13
11۔ مخطوطات اردو خدا بخش	ص17
12۔ مخطوطات نمائش، پٹنہ	ص78

(5) بنگال اور مضافات

1-مرشدآباد	202
2-کلکتہ	211
3-ہوگلی	253
4-ڈھاکہ	257
5-سلہٹ	263
حواشی	267

(الف) مرشد آباد

1۔عیش	مرزا محمد عسکری	206
2۔مجنوں	حمایت علی	206
3۔منشی	عجائب رام	207
4۔والہ	میر مبارک علی	207
5۔ہمدم		208
6۔فصیح	حکیم فصیح العالم	208

عالمگیر اورنگ زیب کی وفات کے بعد ہی ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تھا۔ صوبیدار اپنے اپنے علاقے میں بتدریج خودمختار ہونے لگے تھے۔ بنگال میں مرشد قلی خاں نے اپنے نام پر ایک نیا شہر مرشد آباد بسا کر اسے دارالامارت کا درجہ عطا کر دیا۔ خود اپنی رہائش کے لیے اسی شہر میں اس نے ایک نہایت مستحکم اور عالی شان عمارت ''چہل ستون'' بنوائی جو تادیر نوابین بنگالہ کا مسکن بنی رہی۔

مرشد قلی خاں اور اس کے اخلاف نے اپنے اس نوآباد شہر کو علم و دانش کا گہوارہ بنا دینے کی بھی کوشش کی جس کے نتیجے میں لکھنو اور دہلی جیسے مراکز سے بھی بعض بعض باکمالوں نے ان کی سرپرستی میں مرشد آباد میں آ کر سکونت اختیار کر لی۔ جلدی ہی اس شہر میں علمی مجلسوں کو ایسا استحکام حاصل ہو گیا تھا کہ پلاسی کی جنگ کے بعد حالات کے دگرگوں ہو جانے کے باوجود ان مجلسوں کے سلسلے جاری رہے۔ شاہ عالم ثانی کے آخر زمانے میں مرشد آباد کے متعدد شاعروں کو دہلی تک شہرت حاصل تھی۔ بعض کے نام یہ ہیں:

1۔ آزاد میر مظفر علی	2۔ امانی میر امانی	3۔ انشا سید انشاء اللہ خاں
4۔ رند شاہ حمزہ علی	5۔ عیش مرزا محمد عسکری	6۔ فراقی کنور پریم کشور
7۔ قدرت شاہ قدرت اللہ	8۔ مجنون حمایت علی	9۔ مخلص۔ مخلص علی خاں

اس زمانے میں مرشدآباد میں مقیم شاعروں کے یہاں پوری طرح خوداعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ کسی بھی شخص سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ حکیم قدرت اللہ قاسم نے اس شہر کے ایک شاعر کے احوال میں لکھا ہے:

"حالی تخلص، میر محب علی است، وے در سلکِ ملازمانِ مرزا محمد تقی خاں کہ یکے از امیرزادہ ہائے مرشدآباد بود، انسلاک داشت گویند کہ سودائے خامِ شاعری در دماغ خود چنداں می پخت کہ سرآمدِ شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا و سخن سنج بے نظیر محمد تقی میر را موزون الطبع می گفت و شاعر نمی دانست تا بہ دیگران خود چہ رسد ۔

ہر کس بہ خیالِ خویش خبطے دارد" 1

مرشدآباد کے اُسی زمانے کے شاعروں میں سید انشاء اللہ خاں انشا بھی تھے۔ ان کے بارے میں قاسم کا بیان ہے کہ:

"گویند در ایام حکومت سراج الدولہ وغیرہ حکام بنگالہ ہیزدہ زنجیر فیل بہ خلیفتہ میر مشارٌ الیہ (حکیم ماشاء اللہ خاں صدر) بود۔ تولّد میر انشاء اللہ خاں سلمہٗ الرحمٰن در ہماں آوان بمرشدآباد اتفاق افتادہ۔" 2

انشا ناز و نعمت میں پلے تھے امیرانہ اور شان سے اپنے والد کے ساتھ پایۂ تخت دہلی میں وارد ہوئے۔ قاسم نے لکھا ہے:

"در عہدِ دولتِ امیر الامرا نواب ذوالفقار الدولہ بہادر میر ماشاء اللہ خاں بادو زنجیر فیلِ از ممالکِ شرقیہ وارد حضرت دہلی شاہ۔ خیلے مرد جوانمرد و جواد و بامروت و فتوت بود۔" 3

کچھ باپ کی دولت و ثروت کا سرور، کچھ اپنی ذہانت اور لیاقت کا غرور اور اس پر جوانی کا جوش و خروش، سید انشا بقول قاسم دہلی میں ہر معاصر شاعر کی "تجہیل و تذلیل" پر کمربستہ ہوگئے۔ 4 دہلی میں نابینا بادشاہ شاہ عالم اور لکھنو میں ان کے بیٹے شاہزادہ سلیمان شکوہ کی نوازشات نے ان کو اور بھی سر چڑھا دیا چنانچہ ان دونوں مراکز پر جو ظہور میں آیا، یہاں اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہے۔

مرشد آباد میں سکونت پذیر اس زمانے کے شاعروں نے غزل کے علاوہ دوسری مروجہ شعری اصناف میں بھی نام پیدا کرلیا تھا چنانچہ امانی، خلیق اور ندیم نے مرثیہ کے لیے شہرت پائی۔ میر محمد سلیم کی مثنوی اُس جوار میں مقبول ہوئی۔ محمد فقیہ دردمند جو دہلی سے مرشد آباد میں آ گئے تھے، ان کا ساقی نامہ پچھم سے پورب تک مشہور تھا۔ بعد میں حمایت علی مجنوں نے بھی ایک ساقی نامہ لکھ کر عمدہ صلاحیتوں کا ثبوت پیش کر دیا تھا۔

انگریزی افواج کے چوکی پہرہ میں شاہزادہ عالی گوہر نے اپنے والد عالمگیر ثانی کی وفات کی خبر ملنے کے بعد:

''ابوالمظفر جلال الدین محمد شاہ عالم بادشاہ غازی''

کے لقب سے تاج شاہی زیب سر کیا اور پھر ان کی خدمات کے صلے میں بہار، بنگال، اڑیسہ کی دیوانی کمپنی کے حوالے کردی۔ بادشاہ کے اس عمل کے نتیجہ میں اس علاقے میں نوابی کے سلسلے کا عملاً خاتمہ ہوگیا۔ مرشد آباد کی رونقیں بتدریج ماند پڑنے لگیں اور وہاں کے حوصلہ مندوں کی طبیعتیں بجھ کر رہ گئیں۔

شاہ عالم ثانی کے عہد میں سید ابوالقاسم سبزواری نامی کسی شخص نے مرشد آباد کے زوال سے متعلق ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے۔

''حسن واختلاط (واقعات خرابی مرشد آباد)

صفحات باون، سال تصنیف 1803 (1218ھ)

مرشد آباد کی تباہی کے حالات میں ایک قلمی کتاب۔''[5]

اکبر شاہ ثانی کے زمانہ سلطنت میں مرشد آباد میں مقیم معروف شاعروں میں سے بیشتر وہ تھے جنھوں نے براہ راست یا بالواسطہ طور پر شاہ قدرت اللہ قدرت سے کسب فیض کیا تھا۔ شاہ قدرت کے تعارف میں حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے تحریر کیا ہے:

''شاہ قدرت اللہ مرحوم، وے از اولاد امجاد حضرت شاہ عبدالعزیز شکر باراست.....

وے شاعرے بود، بسیار خوش فکر، فصیح زبان، نہایت سیر مشق، بلاغت نشاں، زور طبعش از زادہائے طبع بلندش پیداست وقوت فکرش از اشعار آبدار رشحۂ فکار ارجمندش

ہویدا.....درشروع شوق شعر گوئی از دیوان سخن سنجی راد بیر میر شمس الدین فقیر کہ از بنی اعمام وے بود، مشق سخن میکرد و در آخر ہا بہ سخن سنج فیض گستر مرزا جان جاں مظہر توسل جست.....درشورش افاغنۂ ابدالی بہ حضرت دہلی رو دارد، رخت سفر بر جستہ بہ مرشد آباد رحل اقامت انداخت واز ہماں جا بہ جوار رحمت حق جا ساخت۔"6

شاہ قدرت نے 1205ھ (1790-91) میں وفات پائی تھی۔ ان کے بعد ان کے جن شاگردوں نے اکبر شاہ ثانی کا زمانہ پایا تھا، ان کا شمار اس وقت کے استادوں میں ہوتا تھا۔ یہاں ان میں سے بعض کا جو نام برآوردہ ہوئے احوال مختصراً لکھا جاتا ہے۔

1۔ عیش

عبدالغفور خاں نساخ نے ان کا تعارف اِس طرح کرایا ہے:

"عیش تخلص مرزا محمد عسکری خلف مرزا علی نقی، شہر امین جہانگیر نگر عرف ڈھاکہ، باشندۂ دہلی، مقیم مرشد آباد شاگرد قدرت اللہ قدرت۔ جس صاحب تذکرہ نے ان کا تخلص عسکری لکھا ہے غلطی کی ہے۔"7

حکیم قدرت اللہ قاسم نے بھی ان کا ذکر عسکری تخلص کے ساتھ کیا تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"عسکری تخلص مغل زادے است، خوبی القیام مرزا محمد عسکری نام، شعرش با کیفیت وندرت، شاگرد شاہ قدرت اللہ قدرت۔ گویند کہ مرد خوش طبع و نیکو و مزیو ظریف نہاد و کشادہ رو است۔ بہر کیف ایں مطلع از وست۔

کہنے کو ادھر ادھر گئے ہم تجھ تیری طرف جدھر گئے ہم"8

امکان ہے کہ شروع میں نام کی مناسبت سے عسکری تخلص کیا ہو۔ پھر عیش ہو گئے ہوں۔ ان کے کلام میں تصوف کا اثر نمایاں ہے۔ زبان قدیمانہ لیکن صاف اور بول چال کے مطابق ہے۔ طرز بیان بھی سادہ اور عام فہم ہے۔

2۔ مجنوں

علی ابراہیم خاں خلیل کے جاننے والوں میں سے یہ مجنوں بھی تھے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"مجنوں، حمایت علی، اصلش دہلی و مسکنش مرشد آباد، از شاگردان شاہ قدرت اللہ

قدرت تخلص است۔ ساقی نامہ بنظم نواب مبارک علی خاں مبارک الدولہ بہادر گفتہ۔
از نظم ریختہ سلیقۂ درستے دارد۔ بارا قم آثم آشنا است۔"9

شاعر کی حیثیت سے معروف تھے لیکن ان کے حالات سے اکثر تذکرہ نویس واقف نہیں تھے۔ نساخ نے البتہ ان کو "باشندۂ اٹاوہ، مقیم مرشد آباد" بتایا ہے۔10

سامنے کے مضامین بہت صاف اور سادہ زبان میں نظم کرتے تھے۔ مشکل زمینوں میں بھی اچھے شعر کہہ لیتے تھے۔ غزل کے علاوہ دوسری اصناف پر بھی قدرت رکھتے تھے چنانچہ نواب نے ان سے ساقی نامہ لکھنے کے فرمائش کی اور انھوں نے بدرجۂ احسن اس کو پورا بھی کر دیا۔ حمایت علی مجنوں کی ایک غزل کا مطلع یہ ہے۔

صاف انکار ہے آنے کا بہانا کیسا　　رنگ لائے ہیں وہ مہندی کا لگانا کیسا

3۔ منشی

یہ کہن سال کہنہ مشق شاعر تھے۔ مشکل زمینوں میں شعر کہنے پر بخوبی قادر تھے۔ ان کے کلام میں کہیں کہیں تعقید کا عیب بھی ملتا ہے۔ محسن نے ان کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے:

"عجایب رام آنجہانی منشی تخلص، مقیم مرشد آباد، شاگرد قدرت اللہ خاں قدرت"11

تعجب ہے کہ نساخ نے ان کے حالات میں کوئی اضافہ نہیں کیا ہے منشی کا ایک شعر یہ ہے۔

تیرے دل سے گر ہ کینہ کو وہ جب کھولے　　غوطہ گر مار سکے آپ گہر میں ناخن

4۔ والہ

علی ابراہیم خاں خلیل نے ان کے بارے میں خاصی مفید اطلاعات قلمبند کر دی ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"والہ دہلوی، میر مبارک علی پسر ارشد شاہ قدرت اللہ قدرت تخلص است۔ از علوم ظاہر اصلا بہرہ مند نیست لیکن بہ محض موزونیت طبع و فیض صحبت شاہ مذکور ریختہ می گوید و در مرشد آباد اقامت دارد۔"12

نساخ نے اپنے تذکرے میں اسی عبارت کا مختصر اترجمہ کر دیا ہے۔13

والہ کہنہ مشق شاعر تھے۔ مشکل ردیف و قوافی میں اچھی غزلیں کہہ لیتے تھے۔ علوم ظاہر سے

بے بہرہ ہونے کے باوجود، ان کا شاعر کی حیثیت سے معروف ہو جانا اس حقیقت کی بھی غمازی کرتا ہے کہ اس شہر میں قدرت کے تلامذہ کے مابین اتفاق واتحاد تھا اور وہ مرشد آباد کے علمی اور شعری ماحول میں موثر حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے۔

ہوئی ہے مشتعل میرے دلِ بیتاب میں آتش　　نہ دیکھی تھی کسی نے اب تلک سیماب میں آتش

5۔ ہمدم

علی ابراہیم خاں خلیل کے دوستوں میں تھے۔ انھوں نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

"ہمدم عظیم آبادی، خلف میر محمد حیات حسرت است۔ اشعارِ خود را از نظرِ شاہ قدرت اللہ قدرت و دیگر موزونانِ مرشد آبادی گزارند و در میانِ بلدہ اقامت دارد۔ از دوستانِ فقیر است۔"14

عبدالغفور نساخ نے ان کا نام میر محفوظ علی لکھا ہے:15

شاہ قدرت کے دوسرے شاگردوں کی طرح ہمدم بھی غزل گو تھے۔ چھوٹی بحروں میں بہت کامیابی سے غزلیں کہتے تھے۔ زبان ان کی صاف اور رواں ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی زندگی میں بھی ہمدم مرشد آباد کے مختلف شاعروں کے مشوروں کو قبول کر لیتے تھے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے۔

اپنی اس راستی کا ہوں عاشق　　ایسے جھوٹے کا اعتبار کیا

6۔ فصیح

اس زمانے کے مرشد آباد کے معروف شاعروں میں سے تھے۔ نساخ نے ان کے بارے میں تحریر کیا ہے:

"فصیح تخلص، حکیم فصیح العالم خلف و شاگرد مولوی صبیح العالم خاں دہلوی۔ مرشد آباد میں نشو ونما پائی تھی۔ وہیں انتقال کیا۔"16

فصیح اپنے وقت کے استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ نساخ نے ان کے ایک شاگرد کا ذکر کیا ہے اور اس کے دو شعر نقل کیے ہیں:

"فدا تخلص، فدا حسین، باشندہ مرشد آباد، شاگرد فصیح العالم فصیح۔

چشم آہو جبیں، خالِ جبیں مشکِ خطا روضۂ طرب، زلفِ سیہ شامِ بلا
گل ایسا بدن، باغ وبہار ایسی ادا گنجرنگہِ چشم ہے، لبِ آبِ بقا" 17

بظاہر یہ دونوں شعر سراپا کے معلوم ہوتے ہیں جو بہ گمانِ غالب شاعر کی کسی مثنوی کا جُزو رہا ہوگا۔

خود فصیح کا ایک شعر یہ ہے ۔

تحفہ نسخہ ہم ہجراں کے لیے رو ودہن قرص گل یہ ہے، تو وہ شربتِ عناب بنا

اس مختصر سے تذکرے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس زمانے میں مرشد آباد میں شعروسخن کی دھوم باقی نہیں رہ گئی تھی۔ شاہ قدرت اور ان کے بعض احباب کے تلامذہ کی کوششوں سے کسی نہ کسی طور پر شعر گوئی کی رسم جاری تھی۔ اس ماحول میں شعرا عموماً غزلیں کہتے تھے۔ اتفاق واتحاد سے رہتے تھے۔ ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی شاعر غزل کے علاوہ دوسری معروف اصناف کی طرف بھی توجہ کر لیتا تھا چنانچہ ڈپٹی کلب حسین خاں نادر نے ایک مرثیہ گو کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"مولوی دل جان صاحب مرشد آباد کے مرثیہ کی ٹیپ ہے۔

تنہا جو اہل شام نے پایا حُسین کو چاروں طرف سے تیر لگایا حُسین کو

اس مقام پر تیر لگائے موزوں کرنا ان کو چاہیے تھا۔" 18

نادر نے دلّی اور لکھنو وغیرہ مراکز کے مرثیوں میں بے احتیاطیوں کا ذکر کرتے ہوئے اہلِ بنگالہ کی مرثیہ گوئی کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

"جب اس طرح کے سراپا اور سلام مشہور ہندوستان ہوئے تو اہل بنگالہ کو بھی حوصلہ مرثیہ گوئی کا پیدا ہوا اور بہت کچھ کہا۔ ایک مطلع ان میں سے یہ ہے۔ بیت

ہمرے امام صاحب پچھوا بھاگی ساں وہ بچہ کافر سبھ کا بگاڑی ساں

قربان اُن خوش اعتقاد رونے والوں کے جو ایسے کلام سُن کر روتے ہیں۔" 19

ان اقتباسوں سے بھی اس علاقے میں مرثیہ بلکہ بطورِ مجموعی شاعری کے معیار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(2) کلکتہ

(الف) نظم

1۔جوان	مرزا کاظم علی	217
2۔عیاں	مرزا ہاشم علی	219
3۔ممتاز	مرزا قاسم علی	219
4۔ رواں	سید جعفر علی	219
5۔حیدری	حیدر بخش	220
6۔ولا	مظہر علی خاں	223
7۔آشنا	مولوی عبدالکریم خاں	225
8۔اثر	نواب حسین علی خاں	226
9۔فصیح	مرزا جعفر علی	226
10۔نادر	ڈاکٹر سید آغا	226
11۔محوی	میر باسط علی عطار	226

12۔طپاں	مرزا احمد بیگ خاں	227
13۔ارشد	مفتی ارشد علی خاں	227
14۔راجا	راجا راج کشن	228
15۔راجا	راجا بہادر	228
16۔مسلم	مبر فرزند علی	228

(ب) مطبعے اور اخبارات 231

(ج) نثر 233

1- سید محمد عبداللہ 235

2- تفضل حسین 242

3- حیدری سید حیدر بخش 242

4- متفرق کتابیں 245

5- داستان 249

فرخ سیر بادشاہ کی عنایت سے انگریزوں کو بنگال کے ساحلی علاقے پر قدم جما لینے کا موقع مل گیا تھا۔ پھر شاہ عالم ثانی سے بہار، بنگال، اڑیسہ کی دیوانی حاصل کر لینے کے بعد وہ ہندوستان کی سیاست میں پوری طرح دخیل ہو گئے تھے۔ وارن ہیسٹنگز نے کلکتہ کو صدر مقام کے طور پر ترقی دینی شروع کر دی تھی۔ رفتہ رفتہ اس شہر نے بھی ہندوستان کے ایک قابلِ توجہ علمی مرکز کا درجہ حاصل کر لیا۔ یہاں 1780 (1194ھ) میں مدرسہ عالیہ قایم ہوا۔ 1784 (1198ھ) میں ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی پھر 1800 (1215ھ) میں فورٹ ولیم کالج شروع ہوا۔

غلام قادر روہیل کے ہنگامے کے بعد انگریز عملاً ہندوستان کے حکمراں بن گئے تھے اور کلکتہ شہر کو دارالامارت کا درجہ مل گیا تھا چنانچہ ذیل کی عبارت سے بھی ظاہر ہے:

> ''مستمند نہال چند لاہور کو کہ اس نحیف کا مولد شاہجہاں آباد ہے، اشرف البلاد کلکتہ میں کہ بالفعل ہندوستان کا دارالامارت ہے، آب و خورش کھینچ کر لایا۔''1

سرکار کمپنی بہادر کی طرف سے شعرا کو خطابات وغیرہ عطا کیے جانے لگے۔ میر قمر الدین منت کے حال میں مذکور ہے:

> ''کلکتے آ کر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہسٹین جلادت جنگ بہادر کی اعانت کے باعث پیشگاہ نظامت سے صوبۂ بنگ کی، خطاب ملک الشعرا کا لیا۔''2

کمپنی کے اقتدار کو ممالکِ غیر نے بھی تسلیم کر لیا تھا اور وہاں سے اس شہر میں سفیر آنے لگے تھے۔ شیخ مصحفی کے تذکرے میں منقول ہے:

"غلام نبی خاں سفیر مخلص کہ از پیش والیِ ایران بہ رسم رسالت بہ کلکتہ آمدہ وصاحب کلانِ کلکتہ رسم استقبالش بجا آوردہ، اور بسیار عزت وتوقیر کردہ از پری چہرۂ قوم خود مجلسِ رقص ترتیب دادہ..... مشارٌ الیہ ایں غزل حسب حالِ خود در شانِ او گفتہ وغلغلۂ فصاحت در علما وفضلا انداختہ..... غزل این است ۔

اشب جمالِ یار من دارد تماشائے دگر یا آنکہ من ی چشم بہتر ز شبہائے دگر" 3

اگر چہ اپنے اداروں کو ترقی دینے کے لیے انگریزوں نے ملک کے علمی مراکز سے باصلاحیت نوجوانوں کو بلا کر کلکتہ میں جمع کرنے کی کوشش کی تھی اور اس باب میں براہِ راست یا بالواسطہ ہندوستانی امرا سے بھی مدد لی تھی، فکر کے انداز اور کارکردگی کی نوعیت کے اختلاف نے معاملات اور نتائج میں نمایاں فرق پیدا کر دیا گیا۔ شیر علی افسوس کے حالات میں مرزا علی لطف نے تحریر کیا ہے:

"ایک مدت سے (میر افسوس) بہ توکل وقناعت ہمراہی میں نواب سرفراز الدولہ بہادر کی دن زندگی کے بسر کر رہے تھے کہ..... بڑے صاحب نے لکھنو کے نام نامی اس معدنِ رافت کا ہر صاحب ہے بہ عزت تمام ان کو بلوا کے اور مشاہرہ دو سو روپیہ کا ٹھہرا کے، پانچ سو روپیہ خرچ راہ دیا اور کلکتے کی طرف روانہ کیا۔" 4

جس ملازمت پر افسوس کا تقرر ہوا تھا، محمد تقی میر بھی اس کے خواہاں تھے۔ مرزا علی لطف نے اس کا بیان اس طرح کیا ہے:

"جس ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کی زباندانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتہ سے لکھنو کو گئی تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر (محمد تقی) کی ہوئی لیکن علتِ پیری سے یہ بیچارے نامقبول کے نامقبول ہوئے اور جوانانِ نومشق مربّی گری سے قوتِ بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبیعتوں سے کبھی نہیں خالی ہے۔ اکثر اہلِ لکھنو پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی چادر خواست حمالی ہے۔

ہندستانی معاشرے میں شاعری اور زبان دانی کو فن شریف کا درجہ حاصل تھا۔"[5]

ہر شاعر اور ادیب فکر و خیال اور زبان و بیان کے معاملات میں پوری طرح آزاد ہوتا تھا۔ نوابین اور اُمرا ان کی ہر نوعیت کی جدت کی قدر کرتے تھے اور وظیفہ اور انعام وغیرہ سے سرفراز کرتے رہتے تھے۔ مستشرقین کا معاملہ مختلف تھا۔ اردو ان کی مادری زبان نہیں تھی۔ اس زبان سے متعلق اپنی ضرورتوں اور شوق سے جو بھی کام کرتے تھے، اس میں ہندستانی زبان دانوں سے تعاون طلب کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ کسی معاون کو ملازم رکھتے تھے اور اس معاون کا انتخاب کرتے وقت اُجرت یا تنخواہ کے علاوہ اس بات پر خصوصیت سے نظر رکھی جاتی تھی کہ وہ شخص اپنے آقا کے ساتھ پوری طرح مخلص بھی ہو اور اس کی منشا اور رایا کے مطابق عمل کر سکتا ہو۔ کوئی کہن سال، پختہ خیال اور باکمال شخص (مثلاً محمد تقی میر) اس معیار پر پورا نہیں اُتر سکتا تھا۔ اس کے لیے تو باصلاحیت لیکن ضرورت مند نوخیز نوجوان شخص ہی مناسب ہو سکتا تھا چنانچہ کلکتہ میں جتنے بھی لوگ اطراف ملک سے لا کر جمع کیے گئے کہن سال کے علاوہ الا ماشاء اللہ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو پہلے سے معروف اور نام برآوردہ بھی رہا ہو اور جس کے فکر و خیال میں انفرادیت کا عنصر نمایاں رہا ہو۔

فورٹ ولیم کالج کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس کے قیام سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز کارپردازوں کو ہندوستان کی بول چال، معاشرت اور فکر و خیال وغیرہ سے واقف کرانا مقصود تھا اور اسی مقصود کے حصول کے لیے یہاں نصابی کتابیں تیار کی جا رہی تھیں، چنانچہ بیشتر کتابیں شاعری، تذکرہ اور افسانہ وغیرہ کی قبیل سے تھیں۔ خالص علمی کاموں کی طرف توجہ کم سے کم تھی۔

(الف) نظم

شاعری اور زبان دانی کو ایک دوسرے کا لازم و ملزوم خیال کیا جاتا تھا چنانچہ فورٹ ولیم کالج میں جن لوگوں کا تقرر ہوا بیشتر شاعر تھے۔ ان میں سے زیادہ نے اکبر شاہ ثانی کا زمانہ بھی پایا تھا اور تقریباً سب اپنے وقت میں کلکتہ شہر کے استادوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ انھیں کے فیض سے اس شہر میں شعر و سخن کے سلسلے جاری تھے۔

1۔ جوان

فورٹ ولیم کالج سے وابستہ رہ چکے تھے۔ ان کے تعارف میں شیخ مصحفی نے لکھا ہے:

''میرزا کاظم علی جوان تخلص، سکنہ شاہجہاں آباد، جوان بسیار خلیق است۔ در مشاعرہ کمتر قدم گذاشتہ۔ چندے رفیق میرزا سیف علی نیز بود۔ چندے بہ فیض آباد بسر بُردہ۔ حالا در کلکتہ رفتہ است۔''[3]

کلکتہ میں اپنے جانے کا ذکر خود انھوں نے اس طرح کیا ہے:

''کرنل اسکاٹ صاحب جو لکھنو کے بڑے صاحب (= ریذیڈنٹ) ہیں انھوں نے حسب الطلب گورنر جنرل بہادر دام ملکہ، کے (10 نومبر) 1800 (1215ھ) میں کتنے شاعروں کو سرکار عالی (کمپنی) کے ملازموں میں سرفراز فرما کر اشرف البلاد

کلکتے کو روانہ کیا۔ انھوں میں احقر بھی یہاں وارد ہوا..... اگر چہ کبھی سوا نظم کے نثر کے مشق نہ کی تھی.....'' ؎

کلکتے کے قیام کے دوران جوان نے ایک بارہ ماسہ نظم کیا تھا۔ اس کے سبب تالیف میں انھوں نے کہا ہے۔

کتابیں کر چکا تالیف جب دو　　کہا اس صاحب والا نے مجھ کو
اجازت تجھ کو یہ دیتے ہیں اب ہم　　بہ خاطر جمع مضموں کر فراہم
تو اپنے بیٹھ کر گھر میں کر اتمام　　سپرد اب ہم نے یہ کیا کام
ولے چھوٹے نہ اس میں کوئی تہوار　　موافق مہر و مہ کے کیجو اظہار

اس بارہ ماسہ کی تکمیل میں چھ مہینے لگے۔ اس کے بعد شاعر نے اس کی تاریخ اس طرح کہی ۔

یہی تو ہند کا دستور رہے گا

1217ھ (1802)

مقصود اس نظم سے یہی تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان کے تمام تہواروں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی رسموں سے واقف کرادیا جائے۔

جوان نے یہ نظم محنت سے لکھی تھی۔ تکمیل کے بعد انھوں نے اسے فیض آباد میں بھی اپنے دوستوں کے پاس بھیجا ہوگا چنانچہ وہاں مقصود نامی ایک شاعر نے بھی اپنی مقامی زبان میں ایک بارہ ماسہ بہت کامیابی سے نظم کیا تھا۔

جوان نے اکبر شاہ ثانی کا زمانہ بھی پایا تھا۔ ان کا سال وفات 1816 (1231ھ) بتایا گیا ہے۔ اس زمانے میں شاعری میں ان کی استادانہ حیثیت مسلّم ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے رفیقِ کار مظہر علی خاں ولا کے دیوان کا مقدمہ فارسی زبان میں لکھا تھا۔ ولا کے دیوان میں ایک قطعہ اس طرح درج ہے:

''مرزا کاظم علی صاحب جوان نے از راہ نوازش و اشفاق جو قطعہ تہنیت غسل صحت میں اس احقر کے کہا ہے یہ ہے۔''

اس میں کُل پانچ شعر ہیں۔ آخری یہ ہے ۔

تو کہہ پائے تپ کا نشاں محو کر ہوئی ہے یہ اب شکر صحت نصیب

2 - 1225=1223ھ

اس سے ولا کے ساتھ ان کے مراسم کا پتا چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے حلقے میں جوان تاریخ گو کی حیثیت سے بھی معروف تھے۔

شاعر کی حیثیت سے جوان کے دو بیٹوں کا ذکر ملتا ہے۔ بظاہر دونوں اپنے والد سے کسب فیض کرتے تھے۔

2۔عیاں

عبدالغفور خاں نساخ کے تذکرے میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

"عیاں تخلص مرزا ہاشم علی ولد مرزا کاظم علی جواں مقیم کلکتہ"[8]

بہ گمان غالب یہ جوان کے بڑے بیٹے تھے۔ ان سے متعلق مظہر علی خاں ولا نے پانچ شعر کا ایک قطعہ کہا تھا:

"قطعہ تاریخ میں برخوردار ہاشم علی کے ختنے کی، جو بیٹا کاظم علی جوان کا ہے"

ولا نے ان شعروں میں تاریخ کہی ہے ۔

تو کر کے قطع سر کفر و جہل کے سر کو نوید دے اُسے، ہیگا یہ جس کا نور نگاہ

جواں تخلص و کاظم علی ہے نام اس کا خدا کے فضل سے افزوں ہو اس کی عزت و جاہ

3۔ممتاز

یہ عیاں کے بھائی تھے۔ ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ کے تذکرے میں ہے کہ:

"ممتاز تخلص مرزا قاسم علی خلف مرزا کاظم علی جوان مقیم کلکتہ "[9]

عیاں کی طرح یہ بھی طرحی مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور اچھی غزلیں کہتے تھے۔ ایک شعر یہ ہے۔

تم کو دیتا ہوں قسم اے حاضران بزم یار بھولے چوکے یاد میری بھی دلایا چاہیے

4۔رواں

یہ جوان کے شاگردوں میں سے ایک تھے۔ نساخ نے لکھا ہے:

''رواں تخلص سید جعفر علی لکھنوی شاگرد کاظم علی جوان، مقیم کلکتہ۔''10

ان کی ایک طرحی غزل کا مطلع یہ ہے ؎

عشق میں لیلا وشوں کے گھر لٹایا چاہیے　　وادیِ مجنوں میں اک تکیہ بنایا چاہیے

5۔حیدری

انھوں نے اپنے مجموعہ گلدستۂ حیدری مولفہ 1217ھ (=1802) میں خود اپنے حالات اس طرح تحریر کیے ہیں۔

''احوال اس سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی کا یہ ہے کہ جس وقت سید ابوالحسن والدِ اس فقیر نے دلّی چھوڑی اور امراہی لالہ سکھدیو رائے کی قبول کی تو بنارس میں تشریف لائے اور مجھے دلّی کے قصداً دل سے بھولائے۔ اس وقت یہ ہیچمدان نہایت خردسال تھا لیکن.....اس سن میں بھی مشتاقِ اہلِ کمال تھا چنانچہ کئی برس قبلہ گاہی نے ساتھ لالہ موصوف کے اوقات بخوبی بسر کی۔ اس عرصہ میں امین الدولہ، عزیز الملک، نواب علی ابراہیم خاں بہادر مرحوم بموجب حکم نواب گورنر جنرل اشٹین صاحب بہادر جلادت جنگ کے حاکمی بنارس کی قبول کر کے ساتھ عزّ و وقار کے مسند عدالت پر بیٹھے.....اس فقیر کو خدمت گزاری قاضی عبدالرشید خاں صاحب، دام اقبالہ، کی پسند آئی اور شاگردی قبلہ و کعبہ کونین مولوی غلام حسین کی بھائی اور صحبت سے تلمیذِ چمن دوستی سید جمعیت علی رضوی کی بھی موافق اپنی فہم کے بہت سی کیفیت اٹھائی.....اب 1215ھ (1808) میں عنایات مسٹر جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ، کے ایک صورت اطمینان کی ہے۔''11

معلوم ہوتا ہے کہ حیدر بخش نے آغاز شباب میں ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور اپنے نام ونسب کی مناسبت سے اپنے لیے تخلص حیدری پسند کیا۔ اس زمانے میں شاعری کو فنِ شریف کہتے تھے چنانچہ حیدری بھی آخر عمر تک اس فن سے دلچسپی لیتے رہے اور اپنے نام کے ساتھ تخلص کو معمولاً شامل کرتے تھے۔ حیدری نے اپنے جو حالات تحریر کیے ہیں ان کی روشنی میں ان کا سالِ ولادت 1141ھ (=1767-68) کے قریب معلوم ہوتا ہے۔ اپنی شعر گوئی کا سبب انھوں نے اس

طرح بیان کیا ہے:

''یہ ضعیف و نحیف، ہیچمداں، آمادۂ بے ہنری حیدر بخش متخلص بہ حیدری ابتدائے جوانی سے ایک نازنین مہ جبیں، دلا رام، نازک اندام، گلعذار، پری دیدار کے دام میں پھنسا.....اسی حالت میں بلبل قفسی کی مانند نالہائے حزیں موزوں کرنے لگا۔ آخر چند روز کے عرصے میں ایک مجموعہ اشعار کا بنا۔''12

کلکتہ پہنچنے کے بعد حیدری نے اپنے کلام کو مرتب کرنا شروع کیا۔ گلدستہ حیدری کے مقدمہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

''خدمت گزاری سے بزرگوں کی اور فرماں برداری سے دوستوں کی اس فقیر کو فرصت اتنی نہ ملی کہ جو کچھ واہیات بکا تھا اسے جمع کرتا۔ اب (عنایات سے جان گلکرسٹ کی) ایک صورت اطمینان کی ہے اور مفارقت میں یاران قدیم اور دوستان صمیم کے..... چند اشعار پریشاں اور کئی مخمس و چند قطعے اور اس ہیچمداں نے تصنیف کیے سوا حافظہ تحریر میں آئے اور اس مجموعۂ بے سر و شتہ و بے محاورہ کو جو اس بے سر و پا نے جمع کیا ہے بنام اس اوراق پریشاں کا گلدستۂ حیدری رکھا ہے۔''13

حیدری خاصے قادرالکلام شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ مولوی کریم الدین نے ان کی منظوم تصانیف کا حال اس طرح لکھا ہے:

''مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ اسی حیدر بخش نے ایک مختصر شاہنامہ اردو میں لکھا ہے14۔ ایک مثنوی بنام ہفت پیکر اس کی تصنیف ہے۔ یہ ایک قصہ وہ ہے جس میں مضمون وہ ہی ہے جو نظامی کی کتاب ہفت پیکر میں ہے۔ اس مثنوی کی تصنیف کی تاریخ مرزا کاظم علی جوان نے اس طرح کہی تھی۔

جان تازہ ہفت پیکر سے ہوئی15

1220ھ

حیدری نے اپنا دیوان بھی مرتب کرلیا تھا۔ اسے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے 1966 کے اواخر میں چھپوا کر شائع کر دیا تھا۔ اس میں غزلوں کے علاوہ مخمس، قطعے، سراپا، دو چھوٹی چھوٹی

مثنویاں اور کئی قصیدے ہیں۔

اس زمانے کے چلن کے مطابق حیدری نے اپنی نثری کتابوں میں بھی جگہ جگہ متفرق اشعار اور منظومات کو شامل کیا ہے۔ ان کی کتاب گل مغفرت میں منظوم "درود و فاتحہ" کے علاوہ ابیات، قطعے، غزل، مثنوی، نوحہ، مستزاد اور نظم وغیرہ سبھی کچھ داخل ہیں۔ اس مقام پر قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ حیدری نے اپنی ایسی غزلوں اور مثنویوں کو جن میں پہلے سے آخری شعر تک کسی ایک موضوع یا واقعہ سے متعلق اشعار کہے گئے ہوں "نظم" کہا ہے۔ اس قسم کی غزلیں کانپور اور مضافات میں بعد کے زمانے میں بھی کہی گئی تھیں۔ پھر انجمن پنجاب کے مشاعروں میں تو نظموں ہی کے پیش کرنے کا چلن ہو گیا تھا۔ یہاں نمونہ کے طور پر حیدری کی ایک نظم کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

تیغ جوہردار کا میں کیا کروں اس کی بیاں
آگ تھی لگنے میں اور چلنے میں جوں آب رواں
کار آتش گاہ کرتی، گاہ کرتی کار آب
آب و آتش ہی سے تھی اس میں سراسر آب و تاب
نعل وہ خارا شکن رکھتا تھا اس کا راہوار
خون سے روئیں تنوں کے دشت کرتا لالہ زار
تیز رو، سچا عناں کا، آہنی سم، خوش خرام
تنگ تھوتھن، گول گردن، مومیان و سبز فام
شیر صولت، پیل پیکر، کوہکن، روشن جبیں
رعد ہیبت، برق سرعت، باد جنبش، تیز بیں
ہے یہ مرکب، ہے یہ اکب، ہے یہ تیغ اور ہے یہ شاہ
آفریں صد آفریں، اے مرد میداں واہ واہ
حضرت شبیرؑ کی تعریف کس سے ہو بیاں
حیدری خامہ اٹھا، کاغذ سے کشتی ہے زباں

کچھ شک نہیں کہ حیدری خوش فکر اور قادر الکلام شاعر تھے۔ وہ تمام متداول شعری اصناف میں

کامیابی کے ساتھ شعر کہہ لیتے تھے۔ان کے دیوان سے متعلق ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے:

''حیدری کے دیوان سے ان کی شخصیت کے بعض دلچسپ پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اس کے ساتھ ساتھ شاعری اور شاعرانہ فنکاری کے لحاظ سے بھی وہ دلچسپ ہے۔اس اعتبار سے بھی وہ اہمیت رکھتا ہے کہ حیدری کی پہلی تصنیف وہی ہے۔''17

6۔ولا

اپنی کتاب جہانگیر شاہی میں انھوں نے اپنے بزرگوں کے اور خود اپنے حالات قلمبند کیے تھے۔ بعد میں ان کے دیوان کے دیباچے میں، ان کے رفیق کار مرزا کاظم علی جوان نے انھیں حالات کو فارسی زبان میں ترجمہ کر کے شامل کر دیا۔ ذیل میں ولا کی تحریر کا اختصار درج کیا جاتا ہے:

''حقیر مظہر علی خاں جو سلیمان علی خاں کا چھوٹا بیٹا اور پوتا آقا محمد حسین اصفہانی کا، جس کا خطاب علی قلی خاں تھا اور پڑوتا آقا محمد صادق ترک کا، یہ بیان کرتا ہے کہ جب وہ دونوں بزرگوار ساتھ ساتھ ولایت اصفہان سے شاہجہاں آباد میں آئے۔ شدہ شدہ آقا محمد حسین نے نواب سعد الدین خان بہادر میر آتش غفراں پناہ کی وساطت سے سنہ احد میں فردوس آرامگاہ محمد شاہ بادشاہ (1131ھ 1719) کا شرف ملازمت اختیار کیا اور اپنی لیاقت وقابلیت سے یہ رسم بہم پہنچائی کہ شہنشاہ گیتی ستاں نے از راہ نوازش ومہربانی حضور کی بائیس خدمتوں سے جیسے خاصہ، بارہ اور کچہری اور کلان باز اور پیادہ کرناٹک اور اکثر حلقوں سے اہتمام کے سوا اور خدمتوں کی داروغگی سے سرفراز کر علی قلی خاں خطاب عنایت فرمایا۔''18

خان مذکور کی رحلت کے بعد (ان کا بڑا بیٹا) سلیمان قلی خاں عرف مرزا محمد زماں وداد (تخلص) کہ کمالات حمیدہ سے متصف تھا، نواب نجم الدولہ محمد اسحاق خان بہادر جو بہ نواب شہید مشہور ہے، اس کے وسیلے سے اور بہ نظر قدامت از راہ نوازش ومہربانی کی ظل سبحانی نے تجویز کر منگل باشی (=منکباشی؟) کے منصب سے سرفراز فرمایا.....شاہ عالم بادشاہ خلد اللہ برہانہ ملکہ، کی ابتدائے سلطنت میں نواب عزت الدولہ صولت جنگ موسوی خان بہادر غفراں پناہ کی رفاقت اختیار کی تھی.....(بہ تاریخ پندرہ جمادی الاولی سنہ گیارہ سو اکیاسی ہجری رحلت کی)

یہ عاصی (مظہر علی خاں متخلص بہ ولا) مدّت تک نواب سیف الدولہ بخشی الملک نجف قلی خان بہادر مظفر جنگ کی رفاقت میں رہا اور کتنے دنوں شہزادہ جہاندار شاہ جنت آرام گاہ کے حضور اشعار گذرانتا.....اتفاقاً بندے کا رہنا لکھنو میں ہوا۔ مہاراج ٹکیٹ رائے بہادر نے اس بندے کی نوکری سررشتۂ نواب وزیرالممالک آصف الدولہ بہادر کی سرکار میں درست کرا اپنا رفیق کیا چنانچہ چھ سات برس تلک اس کے سررشتے میں رہا۔ جب مہاراج کی مختاری کا سررشتہ برہم ہوا راقم کتنے دنوں معطل رہا۔

اتفاق حسنہ سے سنہ اٹھارہ سو عیسوی (=1715) میں مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر (نگین خاتم سلطنت ہفت کشور، تاج بخش سلاطین ہندوایران.....) جو لکھنو سے شاعروں کو بلوایا تھا، بندے نے مرزا جعفر ابن محسن زماں خاں مرحوم کی وساطت ومُربی گری سے ملازمت اسکاٹ صاحب کی حاصل کی اور مارچ کی دسویں تاریخ نوکر ہو کر سنہ مذکور میں وارد کلکتہ ہوا..... جان گلکرسٹ صاحب کی خدمت میں جو زبان ہندی کے مدرّس تھے متعین ہوا (ان کی ایما سے یہ کلیات مدوّن کیا)

صاحب ممدوح (گلکرسٹ) کو ولایت جانے کا اتفاق ہوا اور کپتان جیمس مویت صاحب قائم مقام ان کے ہوئے.....اقبالنامۂ جہانگیری کا ترجمہ بارہ سو چوبیس ہجری مطابق سن 1809 عیسوی میں لارڈ منٹو گورنر جنرل کے عہد میں کیا اور جہانگیر شاہی اس کا نام رکھا اور اس کو کپتان ٹیلر صاحب کہ بالفعل مدرّس مدرسہ ہندی کے ہیں، ان کے وساطت سے حضور والا میں گزرانا۔

ولا کے دیوان میں جسے کاظم علی جوان نے کلیات کہا ہے غزلوں کے علاوہ رباعیات، مدحیہ قطعات، قطعات تاریخ، سلام، واسوخت، مخمس اور نامۂ منظوم اور کئی قصیدے ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ:

> ''ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ ولا غزل کے اعلیٰ درجے کے شاعر تھے۔ اس فن پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی اور انھوں نے شاعری کی دنیا میں اپنا ایک مقام پیدا کرلیا تھا۔''19

بات اتنی ہی نہیں تھی۔ مظہر علی خاں ولا کے دیوان کے مشمولات سے ظاہر ہے کہ وہ تمام مروّجہ شعری اصناف پر قدرت رکھتے تھے اور ہر صنف میں حسب ضرورت طبع آزمائی کرتے تھے۔ ایک قصیدے کے ابتدائی شعر نمونہ کے طور پر درج کیے جاتے ہیں۔

زبان اردو میں سنکر جہاں مری تقریر　　کرے ہے صفحۂ خاطر پہ ہر سخن تحریر
میں وہ محاورہ داں ہوں کہ روز مرّے سے　　کیا ہے ناطقے کا ملک یک قلم تسخیر
مری وہ طوطیِ خوش لہجہ ہے زباں گویا　　کہ سنکے مرغِ چمن بھولے جس کو، اپنی صفیر
جہاں آباد ہے نقدِ سخن کا دارالضرب
ہے وہاں کی خاک مسِ قلب کے لیے اکسیر

یہ افسوس کی بات ہے کہ تا حال جوان اور ولا وغیرہ کی شاعری کی طرف کما حقہ توجہ نہیں کی گئی ہے۔ ان کی منظومات کے تفصیلی مطالعہ کی ضرورت ہے۔

7۔ آشنا

فورٹ ولیم کالج سے وابستہ کم معروف شاعروں میں سے تھے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"آشنا تخلص، مولوی عبدالکریم خاں منشی فورٹ ولیم کالج، باشندہ کشن نگر، کلکتے میں رہتے تھے۔ شعر بہت کم کہتے تھے لیکن جو کہتے تھے نہایت پاکیزہ کہتے تھے۔ سات آٹھ برس ہوئے کہ انتقال کیا۔ راقم کے دوستوں میں تھے۔"20

سیدھے سادے خیال اور سامنے کے مضامین بول چال کی زبان میں نظم کرتے تھے۔ کبھی کبھی مشکل زمینوں میں بھی غزل کہہ لیتے تھے۔ ان کا ایک مطلع یہ ہے ؎

جو قطرہ خوں کا مرے دل کے داغ سے ٹپکا　　تو گویا شعلۂ تر اِک چراغ سے ٹپکا

بندرگاہ ہونے کے علاوہ سرکار انگریزی کے پایۂ تخت کی حیثیت سے بھی کلکتہ کو بہت اہمیت حاصل ہوگئی تھی چنانچہ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش وغیرہ کے بعض تلامذہ کا بھی اس شہر میں آنا جانا رہا تھا۔ وہاں کا علمی اور شعری ماحول ان کی زبان اور طرزِ بیان سے بھی وقتاً فوقتاً متاثر ہوتا رہا تھا۔ یہاں محض ضمناً چند شاعروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

8۔اثر

نواب حسین علی نام تھا۔شیخ امام بخش ناسخ کے ابتدائی زمانے کے شاگرد اور لکھنو کے مقتدر امرا میں سے تھے۔عبدالغفور خاں نساخ نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"اثر تخلص حسین علی خاں لکھنوی خلف امیر الدولہ حیدر بیگ خاں نائب آصف الدولہ بہادر، ناسخ کے شاگرد ہیں۔شعر خوب کہتے ہیں۔صاحب دیوان و مثنوی گذرے۔ لکھنو والے باب میں ان کا حال تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔"21

9۔فصیح

مرزا جعفر علی نام، فصیح تخلص، ناسخ کے نام برآوردہ شاگردوں میں سے تھے۔ایک سے زائد بار کلکتہ گیے تھے۔شیخ مصحفی ناقل ہیں کہ:

"یکبار برائے زیارت ائمہ معصومین رفتہ بود۔ حالا باہمیں قصد بہ طرف کلکتہ رفتہ است۔"22

ان کے حالات اور ان کی شاعری کی کیفیت لکھنو والے باب میں تحریر کی جا چکی ہے۔

10۔نادر

یہ خواجہ آتش کے کم معروف شاگردوں میں سے تھے۔ان کے بارے میں نساخ نے بس اتنا لکھا ہے:

"نادر تخلص، ڈاکٹر سید آغا بناری شاگرد آتش، مقیم کلکتہ کئی سال کا عرصہ ہوا کہ انتقال کیا۔ان میں بہت بڑا عیب تھا کہ دوسروں کے شعر کو اپنے نام سے پڑھتے تھے۔"23

یہاں ان کے صرف دو شعر نمونہ کے طور پر نقل کیے جاتے ہیں۔

نگاہ جب کہ ادھر کی تو دل کے پار ہوئی　　خطا کبھی نہ ترے تیر کا نشانہ ہوا

تقدیر سے الجھا نہ میں تدبیر سے الجھا　　الجھا تو تری زلفِ گرہ گیر سے الجھا

11۔محوی

یہ شیخ ناسخ کے سلسلے کے شاعر تھے۔نساخ نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

"محوی تخلص، میر باسط علی عطار الہ آبادی، مقیم کلکتہ، شاگرد مظلوم شاہ۔کئی برس ہوئے

قضا کی۔"24

محوی چھوٹی بحروں میں بڑی اچھی غزلیں کہتے تھے۔ان کا ایک شعر یہ ہے۔

وصل تیرا چاہتا ہوں ہر طرح پاس تو بھی ہو، تری تصویر بھی

12۔طپاں

یہ دہلی کے رہنے والے تھے۔محسن کے تذکرے میں ان کے بارے میں ہے:

"مرزا احمد بیگ خاں مرحوم طپاں ولد نواب عطاء اللہ خاں، اولاد میں تحسین خاں والیِ دشت قپچاق کی، باشندہ شاہجہاں آباد، مقیم کلکتہ، صاحب دیوان، شاگرد مرزا جان طپش۔"25

عبدالغفور خاں نساخ نے ان کے حالات میں اتنا اضافہ کیا ہے:

"مختار صدر دیوانی کلکتہ۔ دیوان ان کا نظر سے گذرا۔ اٹھارہ سو چونتیس عیسوی (1250ھ) میں فوت ہوئے۔ مرزا احمد بیگ اپنا تخلص حرف 'طا' سے مہملہ سے لکھتے تھے۔"26

مرزا طپاں بھی معمولاً غزلیں ہی کہتے تھے۔ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

رات کو چرخ سے ٹوٹا نہ ستارا ہوگا آہ سوزاں کا مری کوئی شرارا ہوگا

اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں شہر کلکتہ کے رہنے والے شاعروں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتی ہے اور ان میں سے بھی محض چند قابلِ ذکر حیثیت حاصل کر سکے تھے۔

13۔ارشد

یہ نساخ کے دوست تھے اور ان کا بیان اس طرح ہے:

"ارشد تخلص، مفتی ارشد علی خاں بہادر وکیل نواب ناظم مرشد آباد۔ کلکتے میں رہتے تھے۔تھوڑے دن ہوئے کہ انتقال کیا۔راقم کے دوستوں میں تھے۔"27

مفتی ارشد کا ایک شعر یہ ہے۔

نزدیک اپنے یار ہے اور ہے وہ دور بھی ہے قلب میں ہمارے سیاہی بھی، نور بھی

یہ مضمون ہے اور شاعر نے اسے بڑی خوبی سے نظم کر دیا ہے۔

14۔راجا

ان کا ذکر نساخ نے اس طرح کیا ہے:

''راجا تخلص، راجا راج کشن خلف راجا بن کشن بہادر، رئیس کلکتہ، شاگرد مرزا جان طپش، صاحب دیوان گذرے۔''28

لالا سری رام کا کہنا ہے کہ ان کے دیوان کا موجود ہونا مشتبہ ہے۔ انھوں نے یہ ذکر بھی کیا ہے کہ ان کے بیٹے انوپ کشن بہادر بھی شعر کہتے تھے اور اپنے منصب کی مناسبت سے کنور تخلص کرتے تھے۔

راجا کا ایک شعر یہ ہے ۔

گر شب کو نہ تم پاس مرے آؤ گے صاحب　　تو مجھ کو سحر تک نہ یہاں پاؤ گے صاحب

اور ان کے بیٹے کنور کا کلام یہ ہے ۔

نہ پوچھ گذری ہے جو مجھ پہ بیقراری رات　　مثال شمع کٹی روتے روتے ساری رات

15۔راجا

زیادہ معروف شخص تھے چنانچہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بھی اپنے تذکرے میں لکھا ہے:

''راجا تخلص راجا بہادر فرزند شتاب رائے ناظم صوبہ بنگالہ''30

اور نساخ نے ان کے زمانے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اس طرح:

''راجا تخلص، راجا بہادر خلف راجا شتاب رائے دیوان نواب ناظم صوبہ بنگالہ، معاصر اشرف علی خاں غفاں''31

16۔مسلم

نساخ ان سے ذاتی طور پر واقف تھے اور انھوں نے ان کا ذکر قدرے تفصیل سے لکھا ہے:

''مُسلم تخلص میر فرزند علی خلف میر حسین علی محرر عدالت دیوانی صدر کلکتہ، باشندۂ کلکتہ شاگرد حافظ ضیغم۔ شعر ان کے اچھے ہوتے ہیں۔ اپنی شاعری کا بڑا غرور رکھتے تھے۔ راقم کے ملاقاتیوں میں سے تھے۔ عین شباب میں 1276ھ (1859) میں فوت ہوئے۔ راقم نے ان کے انتقال کی یہ تاریخ کہی ہے۔''32

قطعہ تاریخ

مرگیا مسلم حیف یہ غم ہے ہو اس پر اللہ کی رحمت
میں نے یہ تاریخ کہی ہے مسلم ہے اب داخل جنت

1276

اوپر شعرا کے جو حالات تحریر کیے گئے، ان سے ظاہر ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں غزل گوئی کی حوصلہ افزائی نہیں کی جارہی تھی۔ جوان، حیدری، ولا نے باوجود یکہ اپنے دیوان مرتب کر لیے تھے، کسی ایک کے دیوان کے بھی چھپنے کی صورت نہ ہوسکی۔ بعض شاعر جو بہ ضرورت کلکتہ کی طرف جاتے تھے، وہاں کے ماحول پر کوئی دیرپا اثر نہیں چھوڑتے تھے۔ ایسے میں مقامی شاعروں کی تخلیقات کا معیار کچھ زیادہ بلند نہیں ہو پاتا تھا۔

کلکتہ میں غزل کے بعد سب سے زیادہ مقبول صنف غالباً مثنوی تھی۔ جن شاعروں کا اوپر ذکر کیا گیا ان میں سے کئی نے بڑی چھوٹی مثنویاں لکھی تھیں۔ وہاں کے مخصوص ماحول کا ہی یہ اثر تھا کہ بعض نوجوان، نومشق بھی اس صنف کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ حافظ اکرام احمد ضیغم نے جو بعد کے زمانے میں اس علاقے کے مسلم الثبوت استادوں میں شمار ہوتے تھے۔، نومشقی کے زمانے میں ایک مثنوی لکھی تھی۔ حکیم حبیب الرحمان نے اس کے بارے میں لکھا ہے۔

''مثنوی چندن۔ چھوٹی سی اردو مثنوی ہے جس میں چندن لکڑہارے کا قصہ نظم کیا گیا ہے۔ بہ قرائن معلوم ہوتا ہے کہ امام الشعرا حافظ اکرام احمد ضیغم مغفور کی یادگار ہے۔

آٹھ صفحات۔ مطبوعہ مطبع محمد کلکتہ 1245ھ (=1829-30)

اولہ۔

پس از حمد اللہ و نعت نبیؐ کہانی میں لکھتا ہوں یارو نئی'' 3 3

اس زمانے میں بعض ایسی اصناف سخن کی طرف بھی توجہ کی گئی تھی جن کا رواج نسبتاً کم تھا۔ مثلاً ساقی نامہ اور بارہ ماسہ وغیرہ۔ حکیم حبیب الرحمان نے ایک کتاب گلدستۂ نشاط کے تعارف میں لکھا ہے:

''گلدستۂ نشاط۔ اساتذۂ قدیم وحال کے متحد المضامین فارسی اشعار کا بہترین مجموعہ لیکن باب نہم میں متحد المضمون اردو اشعار، رباعیات، چیستان، کہہ مکرنیاں بھی موجود ہیں جسے بابو مغو لال نے حسب فرمائش بابو بلرام داس خلف کاشی ناتھ رئیس کلکتہ دیوان کمپنی بہادر لکھا اور مسٹر ہنری تھوبی پرنسپ صاحب بہادر کے نام ممنون کیا ہے۔

چار سو تریسٹھ صفحات مطبوعہ کلکتہ 1252ھ(=1816)

ابتدا، بہ بسم اللہ بود بال ہمایر فرق عنوانہا

اولہ من الاشعار:

گلدستۂ نشاط خوش ایجاد کردۂ

اے حکمت آفریں زغم آزاد کردۂ "34

اردو میں چیستان اور کہہ مکرنیوں وغیرہ کے مجموعوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے اس لحاظ سے یہ مجموعہ خصوصاً قابلِ توجہ ہے۔

(ب) مطبعے اور اخبارات

سید مقیت الحسن کی تحقیق کے مطابق سر1 چارلس ولکنس نے پادری ولیم کیری بانی مطبع سیرامپور کے مطبع سے منسلک ہونے کے بعد عربی، فارسی خط میں ٹائپ کے حروف پہلے پہل 1780 (=1194ھ) میں وضع کیے تھے۔ لیکن انھیں جلدی ہی انگلینڈ واپس جانا پڑا اور ان کا ٹائپ بالآخر نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گیا۔

جنوری 1802 (=1216ھ) میں گلکرسٹ نے ایک خط میں یہ ذکر کیا ہے کہ میں نے ''کلکتے کے تمام چھاپے خانوں کو'' ضروری کتابیں چھاپنے کے کام پر لگا دیا ہے2 اس سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت اس شہر میں کئی چھاپے خانے موجود تھے۔ بعض یہ ہیں:

ہرکارہ پریس　　کلکتہ گزٹ پریس　　ٹیلی گراف پریس

اسی زمانے میں گلکرسٹ نے بھی اپنا ہندستانی پریس قائم کر لیا۔3

اکبر شاہ ثانی کے زمانۂ سلطنت میں شہر کلکتہ میں کئی نئے اور نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ مطبعوں کا قیام عمل میں آ گیا تھا۔ ان میں سے چند درج ذیل4 ہیں:

1۔ مطبع شکر اللہ 1812/1227ھ　2۔ مطبع کلکتہ اسکول بک سوسائٹی 1819/1234ھ

3۔ مطبع مشن 1822/1237ھ　4۔ مطبع جام جہاں نما 1828/44-1243ھ

5۔ مطبع احمدی 1834/50-1249ھ 6۔ مطبع لیتھوگرافک 1835/51-1250ھ

اہل بنگال کو اخبار بینی اور اخبار نویسی سے بہت دلچسپی رہی ہے چنانچہ بیشتر مطبعوں سے انھیں کے نام کا اخبار شائع ہوتا تھا۔ وہ زمانہ تھا جب اُس علاقے میں فارسی کا چلن زیادہ تھا اس لیے بیشتر اخبار بھی فارسی زبان میں، اور ہفتہ وار ہوتے تھے مثلاً

نام مطبع	نام اخبار	نام مالک
1۔ مطبع آئینہ سکندر	ہفتہ وار آئینہ سکندر	مالک مولوی سراج الدین
2۔ مطبع ماہ عالم افروز	ہفتہ وار ماہ عالم افروز	مالک وہاج الدین
3۔ مطبع سلطان الاخبار	ہفتہ وار سلطان الاخبار	مالک رجب علی حسینی لکھنوی

بعض اخباروں کا نام مطبع کے نام سے مختلف بھی ہوتا تھا مثلاً:

مطبع ٹھاکر منی رام ہفتہ وار شمس الاخبار

اخبار نویسی کے چلن کا فائدہ یہ ہوا کہ 27۔ مارچ 1822 (=1237ھ) کو مطبع مشن سے جام جہاں نما نامی اردو کا پہلا ماہنامہ جاری ہوا۔ اس کے مالک ولیم ہوپ کنس پیرس اور مہتمم ہری دَت تھے۔ بعد میں اخبار کے نام کا پریس قائم ہوا اور اس مطبع جام جہاں نما سے جو محلہ کولوٹولہ میں واقع تھا، 3 ستمبر 1828 (=1243-44ھ) سے یہ اخبار چھپنے لگا۔

ج۔ نثر

لارڈ ولزلی نے جان گلکرسٹ کی سربراہی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدے داروں کو ہندوستان کی بول چال، معیشت ومعاشرت وغیرہ سکھانے کے لیے ایک مدرسہ اورنٹل سیمنری (Oriental Seminary) جنوری1799(= 14-1213ھ) میں قائم کیا[1]۔

بعد میں10 جولائی1800(= 17۔صفر1215ھ) کواس کی جگہ فورٹ ولیم کالج نے لے لی[2]۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس کالج کو ٹیپو سلطان کی شکست اور شہادت کی یادگار کی حیثیت بھی دی گئی تھی۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام کے مقاصد کے حصول کے لیے نظم کے مقابلے میں نثر زیادہ موزوں اور مناسب تھی اور نثر کی جگہ اصناف سے زیادہ افسانوی تحریریں مفید اور کارآمد تھیں چنانچہ گلکرسٹ کی سرپرستی میں داستانیں، نقلیں، حکایتیں، لطیفے اور مختصر کہانیاں لکھے جانے کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دی گئی۔ بے شک تذکرہ، لغت، قواعد وغیرہ سے متعلق بھی کام کے سلسلے کو کم وبیش جاری رکھا گیا۔

وہ زمانہ تھا جب نثر نویسی کا چلن عام نہیں تھا اس لیے اس کالج میں تقرر کے لیے نثر لکھنے والے نہیں مل سکتے تھے چنانچہ جتنے لوگوں کے تقرر ہوئے تقریباً سب شاعر تھے۔ انھیں نوعمر لیکن عموماً

پریشان حال شاعروں سے گلکرسٹ نے کامیابی کے ساتھ نثر نویسی کا کام لے لیا۔

فورٹ ولیم کالج کے علاوہ اردو نثر کے فروغ میں اہلِ مذہب کے کارنامے بھی بہت زیادہ قابل توجہ ہیں۔ سرکار کمپنی بہادر کو استحکام حاصل ہوا تو عیسائی مذہب کی تبلیغ و تلقین کا سلسلہ نہایت سلیقہ اور پوری گرم جوشی کے ساتھ جاری ہوا۔ اس مقام پر سید مقیت الحسن کا یہ بیان لائق توجہ ہے:

> ''مضافات کلکتہ کے معروف اردو مطابع میں ایک سریرامپور پریس بھی تھا جسے کبھی کبھی شیرامپور پریس بھی لکھتے تھے۔ اس پریس کی باقاعدہ تاریخ ملتی ہے اور وہ طویل ہے۔ مختصراً یہ ہے کہ چند انگریز کی پادریوں نے ہندوستانی زبانوں میں انجیل اور دیگر عیسائی لٹریچر کی اشاعت کے لیے اسے 1799 (=14-1213ھ) میں قائم کیا۔ پادری ولیم کیری (William Carey) اس کا روحِ رواں تھا جو فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ بنگالی و سنسکرت سے بھی منسلک تھا۔''3

کلکتہ اور مضافات کے مطبعوں سے یکے بعد دیگرے متعدد کتابیں عیسائی مذہب سے متعلق چھپ کر شائع ہوتی رہیں۔ یہاں ان میں سے بعض کا نام لکھا جاتا ہے:

طریقۂ عبادت از ایچ مارٹن (ترجمہ ہندوستانی) مطبوعہ 1814 کلکتہ 4

ترجمۂ بائبل از ہنری مارٹن مطبوعہ 1814-1819 سریرامپور 5

داود کی زبور مطبوعہ 1825 سریرامپور 6

یہ کتاب بہ اعانت بائبل سوسائٹی، اصل عبرانی سے ترجمہ ہوئی۔

ناشر: پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی، لاہور

نمونۂ عبارت ''کیا مبارک آدمی ہے جو گنہگاروں کی رائے پر نہیں چلتا اور خطا کاروں کی روش پر کھڑا نہیں رہتا اور ٹھٹھا کرنے والوں کی محفل میں نہیں بیٹھتا۔''

اس کتاب کے بارے میں سید مقیت الحسن نے اطلاع دی ہے کہ:

> ''زبور داودی کی طباعت نستعلیق ٹائپ کی ہے اور صاف ستھری ہے۔ یہ 1825 (41-1240ھ) میں چھپی۔ اردو ترجمہ (253 صفحوں پر) سیدھے عبرانی زبان سے کیا گیا ہے۔''7

عیسائی مذہب سے متعلق کتابوں کی طباعت واشاعت کا سلسلہ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں بھی جاری رہا چنانچہ زبور داودی اسی زمانے کی ہے۔اس کے علاوہ ذیل کی کتابیں بھی توجہ کے لائق ہیں:

ہی مانس برائے عیسائیان ہند مطبوعہ 1826 کلکتہ 8

نیو ٹسٹامنٹ یا وثیقۂ جدید 386 صفحے ٹائپ مطبوع 1829 سیرامپور 9

یہ اصل یونانی سے اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔

ترجمہ احسن المواعظ گئے جان (راجا کالی کرشنا بہادر) مترجم مطبوعہ 1836 کلکتہ 10

جب اس قسم کی اور کتابیں چھپ کر اطراف ملک میں مشتہر ہوئیں تو دوسرے مذہبوں کے ماننے والوں کو بھی خیال ہوا اور انھوں نے بھی اپنے مذہب کے اصول ومسائل وغیرہ پر مشتمل کتابیں لکھ کر شائع کرنی شروع کیں۔اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ملک کے مختلف علمی مراکز پر لکھی جانے والی بعض بعض کتابوں کا ان کے مواقع پر ذکر کیا جا چکا ہے۔اب اس زمانے میں کلکتہ میں چھپنے والی چند کتابوں اور ان کے مصنفوں کا احوال مختصراً قلمبند کیا جاتا ہے۔

1۔ سید محمد عبداللہ حُسینی

یہ فورٹ ولیم کالج کے نہایت معروف اور موثر ومقتدر صاحب قلم میر بہادر علی حُسینی کے بیٹے تھے۔ان کے حالات میں مذکور ہے کہ:

> ''سوانا ایک بستی کا نام ہے شہر تھانیسر کے تیرہ کوس دکھن، دلی سے پانچ منزل مغرب جس کو اس خاکسار کے اجداد میں سے حضرت زید شہید سالار لشکر نے لاہور سے مع اپنی برادری وہاں آکر وہاں کے ہندو راجا سے جہاد کر کے فتح کیا تھا۔پھر وہیں شہید ہوئے اور برادری اور اولاد ان کی اس کے گرد وپیش کئی بستیوں پر عمل کر کے وہاں بسی۔
>
> بڑے بڑے سید بزرگ ان کے سلسلے میں ہوئے جیسے
>
> =سید شاہ میر سید نظام الدین سید اعزاز الدین نوبہار
>
> سید شاہ محمد حاجی اور سید شاہ بھیکہ
>
> ان بزرگواروں کا سلسلہ حضرت امام علی اصغر سے جو حضرت امام زین العابدین کے چھوٹے بیٹے تھے جا ملتا ہے۔''11

سید عبداللہ اپنے والد کے ساتھ کلکتہ پہنچے۔ پھر وہیں رہ پڑے۔ سید احمد شہید سے وہیں پر خلافت حاصل کی۔ انھیں کے ساتھ 1237 تا 1239ھ (1822 تا 1824) میں حج کے لیے گئے۔ وہاں سے واپس آ کر نواح کلکتہ (سیرامپور) میں انھوں نے اردو ٹائپ کا ایک چھاپہ خانہ مطبع احمدی کے نام سے قائم کیا جس میں سید احمد شہید کی تحریک اور مختلف مذہبی مسائل سے متعلق متعدد کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں۔ سید عبداللہ نے 1265ھ (1848) میں فات پائی۔

سید عبداللہ حسینی کو اردو زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی۔ ان کی دستیاب کتابیں تقریباً سب اردو نثر میں ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس زمانے کے چلن کے مطابق یہ بھی شعر کہہ لیتے اور تاریخ گوئی سے ان کو زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔

(الف) داب الآخرت۔ مترجم سید عبداللہ حسینی نے اس کتاب کے تعارف میں تحریر کیا ہے کہ:

"حد سے باہر ہینگے انعام خدا کس سے ہوسکتا ہے شکر اس کا ادا

.....ایک روز خاکسار بندہ ارمحمد عبداللہ عفی عنہ کی خاطر میں یوں گذرا کہ یہ قیامت نامہ جس کو مولانا شاہ رفیع الدین مبرور دہلوی نے عبارت فارسی میں تالیف کیا ہے بزبان ریختہ ہندی میں ترجمہ ہو تو ہر ایک خاص و عام کی سمجھ میں آوے اور جسے خدا تعالیٰ توفیق بخشے وہ قیامت کے حال سے واقف ہو کر راہ راست کی پاوے۔ ہر چند اس کم استعداد کو محاورۂ ہند میں مہارت تام نہیں لیکن خدا کی توفیق و اعانت پر نظر کر کے موافق اپنے حوصلہ تمام وفہم کے لکھا ہے۔"

کتاب کو انھوں نے ذیل کی عبارت پر ختم کیا ہے:

"اللہ تعالیٰ جمیع مومنین و مومنات اور مسلمین و مسلمات کا خاتمہ بالخیر کرے اور عذاب قبر و غدغۂ حشر سے محفوظ رکھکر جنت میں پہنچاوے اور وہاں دیدار لایزل رکۂ الابصار سے مشرف کر کے مقام رضا میں ابدالآباد مستقر و برقرار رکھے صدقہ صاحب لولاک اور اس کی آل پاک کا۔"

کتاب کی تاریخ تکمیل کا قطعہ انھوں نے اس طرح کہا ہے۔

جب ہُوا تعمیر سے اس قصر کی فارغ قلم جس میں ہر جانب کو ہے مفتوح باب الآخرت

عقل نے دیکھا اس میں آئینِ قیامت آشکار رکھ دیا نام اس کا با تاریخ داب الآخرت 12

1239ھ

اس سے معلوم ہوا کہ ترجمہ کا یہ کام 1239ھ (1823) میں مکمل ہوا تھا اور مترجم نے اس کا نام تاریخی رکھا تھا۔ یہ کتاب مترجم عبداللہ حسینی کے مطبع احمدی میں 1254ھ (1838-39) میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ بعد میں یہ دوسرے مطبعوں سے بھی چھپی تھی۔

(ب) تنبیہ الغافلین۔ یہ بھی فارسی کی ایک کتاب کا اردو ترجمہ ہے جس کے بارے میں شہرت ہے کہ وہ شاہ رفیع الدین کی تصنیف ہے۔13 لیکن ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا اس سلسلے میں کہنا ہے کہ:

''کسی تذکرہ نگار نے شاہ رفیع الدین کی مولفات میں تنبیہ الغافلین کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اگر یہ شاہ رفیع الدین کی مولفہ ہے تو بھی یہ یقینی بات ہے کہ یہ سید احمد شہید کی درخواست پر تالیف نہیں ہوئی۔''14

مترجم سید محمد عبداللہ حسینی نے اپنے ترجمے میں بیان کیا ہے کہ:

''احوال اس کتاب کا یوں ہے کہ پہلے کسی شخص نے اس کو، جس میں بیس باب تھے، فارسی سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا لیکن اکثر الفاظ اس کے بے محاورہ اور نادرست تھے اور .....آیتیں، حدیثیں غلط چنانچہ اس خاکسار خیر خواہ خلق اللہ عبداللہ ولد سید بہادر علی مرحوم نے کئی نسخے جمع کر کے زبانِ ریختہ میں اس کا ترجمہ کیا.....آیتیں اور حدیثیں صحیح کر کے بلکہ کچھ اور بھی آیتیں اور حدیثیں اور بیان اور قصے جہاں جس مقام کے مناسب جانا زیادہ کر کے سنہ 1246ھ (=1830-31) میں چھپوایا.....جس قدر کتابیں چھاپہ ہوئی تھیں سب بٹ گئیں اور پھر بھی اور لوگ خواہشمند باقی رہے اس لیے اس نالائق نے کئی باب اور کتنے فایدے جو اس کتاب میں ضروری جانے بڑھا کر اب بارہ سو انچاس ہجری (1833-34) میں پھر چھپوایا۔''

کتاب مذکور کی پہلی اشاعت میں بیس ابواب تھے، اس طرح

دنیا کی دوستی ، قیامت ، دوزخ ، جنت

ماں باپ اور ہمسایوں کے حقوق، سود ، زکات ، نشہ

نماز ، تلاوت قرآن مجید ، رمضان المبارک، میاں بیوی
جھوٹ اور سچ ، غیبت اور چغل خوری، حسد اور دشمنی ، اخلاق حسنہ
صبر و تحمل ، نیکوں کے واقعات ، ابوشحمہ کا حال ، ماتم و نوحہ کا بیان 15۔

پھر اس کتاب کی دوسری اشاعت میں ابواب کی تعداد چوبیس ہوگئی۔ اس طرح:

1۔ایمان کا بیان 2۔سنت 3۔علم اور عالم 4۔دنیا کی دوستی
5۔قیامت 6۔دوزخ 7۔بہشت 8۔ماں باپ اور ہمسایہ کا حق
9۔سود 10۔زکات 11۔شراب 12۔نماز
13۔قرآن شریف کی تلاوت 14۔روزۂ رمضان 15۔حج 16۔خاوند اور بیوی
17۔جھوٹ اور کذب 18۔غیبت اور چغل خوری 19۔حسد اور دشمنی 20۔تکبر اور غضب
21۔خلق نیک 22۔نیک لوگوں کے قصے 23۔ابوشحمہ 24۔ماتم اور نوحہ 16۔

کتاب کے آخر میں ایک خاتمہ بھی ہے جس میں توبہ کا بیان ہے۔

(ج) موضح الکبائر و البدعات

اس کتاب کو عام طور سے کسی نامعلوم مولف کی تالیف خیال کیا جاتا ہے اور اس کا 1268ھ (1852) کا چھپا ہوا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے۔17 اس کتاب کا مذکور تنبیہ الغافلین میں آیا ہے اس لیے یہاں پر اس کا ذکر مناسب معلوم ہوا۔

(د) تفسیر مقبول۔ حکیم حبیب الرحمان نے اس کتاب کے بارے میں جو اطلاعات قلمبند کی ہیں، یہ ہیں:

> ''زبان اردو، ٹائٹل اور مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف پنج سورہ کی تفسیر ہے لیکن مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ یٰسین، سورہ نوح، سورہ نبا، سورہ واقعہ، سورہ تبارک الذی، سورہ رحمان، سورہ مزمل اور سورہ جن کی تفسیر ہے۔18

حاجی سید عبداللہ مرحوم مالک مطبع احمدی کلکتہ اس کے مصنف ہیں۔ موصوف چنچڑا (ہوگلی) کے باشندے اور میر بہادر علی حسینی کے بیٹے تھے۔ یہ ایک سو ستاون صفحات کی تفسیر تیسری سرتبہ 1267ھ میں چھپی۔ پہلی مرتبہ 1250ھ (1834) میں چھپی تھی۔ مصنف کی نظر ثانی کے ستر ہ

برس بعد پھر چھپی۔ زبان بہت سلیس ہے۔

اوّلہ: سورہ یٰس مکی ہے۔ اس میں ترا سی آیتیں ہیں اور کوفیوں کے نزدیک براسی...الخ "

اس اقتباس میں ایک سے زائد اطلاعات صحیح نہیں ہیں۔ تفسیر مقبول تیسری بار بمبئی میں 1259ھ میں چھپی تھی۔ اس کے خاتمۃ الطبع کی عبارت یہ ہے:

"الحمدللہ کہ یہ کتاب تمام ہوئی۔ دومرتبہ یہ تفسیر 1250ھ اور 1254ھ میں چھپی تھی۔ اب.....اس فقیر نالائق عبداللہ ولد سید بہادر علی عفی اللہ عنہما، اس کے مولف نے اس کو پھر سے تصحیح کر کے اور کہیں کہیں لفظوں کو بدل کے اور کچھ عبارت موقع کی بڑھا کے چھپوادی۔"19

طبع اول کے خاتمہ کی عبارت اس طرح تھی:

"یہ دعا ہے کہ مومنین مخلصین کی کہ بعد پنج وقتی نماز کے دل کو رجوع کر کے باصدق نیت وادب تمام اس خالق ارض وسماوات کے حضور ہمیشہ مانگا کریں.....اور سید احمد شہید ہمارے پیر ومرشد کے مطالب دلی جلد برلا، خصوصاً مقدمہ جہاد میں ان کو اور سلطان روم اور سلطان بخارا کو قوت دے، نصرت دے اور ان کے مراہیوں کو یا اللہ کافروں، فاسقوں، مبتدعوں، معاندوں کو مخذول ومردود ومقہور ومغلوب کر یا ہدایت دے۔"

کتاب کے پہلی مرتبہ مرتب کیے جانے کے زمانے کا اس اقتباس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے:

(ہ) چہل احادیث۔ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے چالیس حدیثوں کا انتخاب کیا تھا۔ سید عبداللہ نے ان کا اردو زبان میں پہلی بار ترجمہ کیا تھا۔20 یہ ترجمہ ان کی تفسیر مقبول کے پہلے ایڈیشن میں شامل ہو کر شائع ہوا تھا۔ صورت یہ ہے کہ حدیث کے اصل عربی الفاظ لکھ کر ان کے سامنے اردو ترجمہ تحریر کر دیا گیا تھا، مثلاً:

اَلْحَرْبَ خدعَۃٌ	لڑائی بن پڑے دغا سے
اَلْمُسلِمُ مِراۃُ الْمُسلِم	مسلمان آئینہ ہے مسلمان کا

(و) مسائل اَربعین۔ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ جو 1265ھ (=1849) کے مطبوعہ نسخہ

کی نقل ہے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں محفوظ ہے۔21 کتاب کا آغاز اس بیان سے ہوتا ہے:

''ان دنوں کہ 1255ھ (1839) ہے سلالہ خاندان عالیشان محمد زماں خاں، منجھلے بیٹے محمد باز خاں مرحوم کے، رہنے والے بھیکم پور، پرگنہ آنولی، ضلع کوئل علی گڑھ کے، دارالحکومت شاہجہاں آباد میں آکر پینتیس مسئلے بطریق استفتا کے جناب ابوسلمان محمد اسحاق ابقاء اللہ، نائی مولانا شیخ عبدالعزیز محدث مفسر دہلوی، کی خدمت میں لکھ کر درپیش کیا اور سید ابومحمد جائیسری عفی اللہ عنہ کہ اس شہر میں چند روز سے رہتے تھے، ان مسئلوں کے جوابوں کے لکھنے کے واسطے مقرر کیا۔ مولانا ممدوح نے معتبر کتابوں سے ان مسئلوں کے جوابوں کو تلاش فرما کے نکال کے لکھوائے کہ ہر ایک مسلمان ان کو اپنا دستورالعمل کرے۔ بعد اس کے کہ سید ابومحمد موصوف نے اور پانچ سوال اس میں بڑھا کر مسائل اربعین فی بیان سنتِ سیدالمرسلین نام رکھا۔''22

اگرچہ اس اقتباس میں سید عبداللہ کا نام کہیں نہیں آیا ہے لیکن اس بنا پر کہ یہ ان کی ایک دوسری کتاب فتاوائے ہندی کے شروع میں شامل ہے، اسے بھی ان کی کتابوں میں شمار کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مدرسہ قادریہ بدایوں کے قلمی نسخہ میں اس بابت یہ تصریح بھی موجود ہے:

''حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی کے رسالہ مفیہ مسائل اربعین فی (بیان) سنتِ سیدالمرسلین کا اردو ترجمہ عالم نبیل فاضل جلیل سید عبداللہ ولد بہادر علی حسینی کلکتہ والے نے کیا اور اس کی نقل مطابق اصل بتاریخ 22 ذی الحجہ ہجری نبوی کہ بیت السلطنت لکھنو میں فقیر عزیز الدین نے اتمام کو پہنچائی۔''

اس کتاب کی طباعت بمبئی کے مطبع محمدی میں 1265ھ میں اور مطبع حسینی میں 1289ھ میں عمل میں آئی تھی۔ گارساں دتاسی نے البتہ یہ اطلاع دی ہے کہ یہ کتاب کلکتہ میں 1843 (1259ھ) میں چھپ گئی تھی۔ ظاہر ہے یہی اس کا پہلا ایڈیشن تھا۔ اس کتاب کی عبارت کا نمونہ یہ ہے:

''ہر مسلمان پر واجب ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے خلفائے راشدین اور ائمہ مجتہدین کے طریقے کو جو اہل سنت و جماعت کی کتابوں میں لکھے ہیں دریافت کر کے اپنی شادی اور غمی کے وقت اس پر عمل کرے۔ کسی

نادان کی ملامت کا اندیشہ نہ رکھے۔"

(ز) فتاوائے ہندی۔ کتاب مسائل اربعین کے ساتھ یہ کتاب بھی شامل ہے چنانچہ کتب خانۂ آصفیہ کے نسخے میں بھی یہی صورت ہے اور بمبئی کے مطبوعہ نسخہ کا بھی یہی حال ہے۔23 پہلی کتاب کی طرح اس میں بھی مذہب سے متعلق بعض سوالات کے جواب قلمبند کیے گیے ہیں چنانچہ اس کے آغاز کی عبارت یہ ہے:

"یہ دے سوالات ہیں جن کو مولوی سراج الدین نے درست کر کے علماے مدرسہ کلکتہ وغیرہ کے دستخط ان پر کروائے تھے۔ اب ان کو حاجی سید عبداللہ صاحب غفراللہ والوالدیہ نے ہندی عبارت میں عوام لوگوں کی سمجھ کے لیے ترجمہ کر کے چھپوا دیے۔"

کتب خانۂ آصفیہ کی فہرست میں اس کی تاریخ تصنیف غلطی سے "مابعد 1300ھ" چھپ گئی ہے جب کہ اسی میں یہ بھی مذکور ہے کہ:

"یہ رسالہ در 1265ھ (1849) مطبع محمدی بمبئی میں طبع ہو چکا ہے۔ اس کی یہ قلمی نقل ہے۔"

اس کتاب کی عبارت کا ایک اقتباس نمونہ کے طور پر درج ذیل ہے:

"ثواب پہنچانا بدنی اور مالی عبادتوں کا اور اعمال نیک کا جس کا ذکر سوال میں آیا ہے، شرعاً درست ہے۔ حلبی میں لکھا ہے کہ جو کوئی عاجز ہو حج کرنے سے اور اس کی طرف سے دوسرا حج کرے تو درست ہے اور اُتر جائے گا یہ عاجز کے سر سے۔ جانو تم کہ اصل اس بات میں یہ ہے کہ پہنچتا ہے انسان کو کہ ثواب دیوے اپنے عمل کا جیسے نماز، روزہ، حج وصدقہ وتلاوت قرآن وغیرہ دوسرے کو اور پہنچتا ہے وہ ثواب میت کو اور نفع بخشتا ہے اس کو۔ بحرالدقایق میں ہے اور ایسا ہی ہے۔ ہدایہ اور درّالمختار کے باب الحج میں جو غیر کی طرف سے کرتے ہیں۔ الخ "24

مولوی سید عبداللہ حسینی کی تحریروں میں ہندوستانی اصل کے ایسے لفظوں کا جو پورب کے علاقوں میں زبان پر جاری ہیں استعمال زیادہ ہے مثلاً:

باسن　　بھیتر　　اور چھور　　جھاڑو بہارو　　دُبدھا

پسارنا　　لکنا　　ناتی　　لتہ　　ناڑا

اسی طرح وے (= وہ سب)، تس، کدھی (= کبھی) وغیرہ کا صَرف بھی توجہ طلب ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ وہ عموماً ایک معنی کے لفظوں کے یکجا کرتے ہیں، جیسے:

رشوت گھوس　　سرکشی اور تکبر　　روتی کلپتی وغیرہ۔

بطور مجموعی سید عبداللہ حسینی کی تحریریں روزمرّہ، بول چال کے مطابق اور عام فہم ہوتی ہیں۔

2۔ تفضّل حُسین

حکیم حبیب الرحمان نے ان کی ایک کتاب کا جو تعارف کرایا ہے، اس کا اختصار درج ذیل ہے:

"تلخیص المسائل، زبان اردو۔ از مولوی حکیم تفضّل حسین مرحوم۔ بڑے عالم اور فاضل تھے۔ کلکتہ میں مطب کے علاوہ ان کا مطبع بھی تھا جس کا نام مطبع طبّی تھا۔ یہ فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ طب سے متعلق تھے۔ طب پڑھاتے تھے اور طبّی تصانیف شائع کرتے تھے۔ قانونچہ کی شرح بھی ان کی چھپ چکی ہے۔ دیباچہ میں ہے ...ایام سابق سے مجھے یہ خواہش تھی کہ اگر کوئی کتاب علم فقہ کی جس میں معاملات ضروری کے ہوتے تالیف کرتا تاکہ بیچارے عوام الناس مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچتا اور سب اس کے امور نامشروع سے کہ بالفعل اس میں مبتلا ہیں بچتے اور اجر اس کا ملتا.... پھر کہتے ہیں۔ ایک کتاب دیکھنے میں آئی جس کا نام خلاصۃ المسایل ہے اور حقیقت میں یہ کتاب نہایت معتبر اور بہتر ہے مگر اکثر مسائل ضروری اس میں بہ سبب اختصار کے مصنف نے اس کتاب کے ترک کیا ہے بلکہ اکثر فصلیں اس میں متروک ہیں چنانچہ لعان و کفالت و حوالت وغیرہ اور لکھنا ان مسئلوں کا اہل مارب تھا۔"25

مصنف نے بہت اضافہ کر کے تلخیص المسائل نام رکھا اور اب صحیح خلاصۃ المسائل کے نام سے ملتی ہے۔

424 صفحات، مطبوعہ مطبع احمدی کلکتہ بار دوم 1875"

افسوس ہے کہ اس کتاب کے بارے میں مزید کوئی اطلاع حاصل نہیں ہو سکی۔

3۔ حیدری

''سید حیدر بخش نام، حیدری تخلص تھا۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد لالہ سکھ دیو کے ملازم تھے اور ان کے ساتھ بنارس آ گئے تھے۔ حیدری بھی ساتھ تھے۔ بعد میں حیدری نے لالہ کی ملازمت اختیار کر لی اور بنارس کی تعریف میں ایک مختصر سی مثنوی لکھی جس کا پہلا شعر یہ ہے۔

بنارس شہر ہے آباد و خوشتر چراغِ دودمانِ ہفت کشور''26

حیدری کے دیوان میں چار شعروں کا ایک قطعہ کسی لالہ موتی رام کی مدح میں بھی ہے۔ مطلع یہ ہے۔

کون ہے وہ جس سے خلقت شاد صبح و شام ہے ہاتفِ غیبی یہ بولا، لالہ موتی رام ہے

ممکن ہے کہ یہ موتی رام سکھ دیو کے اعزا میں سے ہوں۔ واللہ اعلم

معلوم ہوتا ہے کہ بنارس میں حیدری نے شاعروں کے حلقے میں اپنی جگہ بنالی تھی اور ضرورت اور موقع محل کی مناسبت سے وہ شعر بھی کہتے تھے۔ اس زمانے کے اپنے حالات میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

''اس سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہجہاں آبادی کو بارہ سو چودہ ہجری میں یہ ضمیر فیض اثر پہنچی کہ صاحبان عالی شان گفتگوے اردوے معلّٰی کو مرغوب طبع رکھتے ہیں اور اہل سخن کو از راہ قدر دانی کے زیادہ بزرگی دیتے ہیں..... خصوصاً والا مناقب..... مسٹر جان گلکرسٹ..... اس واسطے یہ دلِ مضمحل اس قصہ مہر و ماہ کو باغ فصاحت و بلاغت سے تیار کر کے واسطے نظرِ پُر نور اس صاحب موصوف والاشان کے لایا ہے۔''27

معلوم ہوتا ہے کہ خبر سنتے ہی حیدری نے نثر نویسی کی طرف توجہ کی اور قصہ مہر و ماہ کو اردو نثر میں لکھ ڈالا۔ کلکتہ پہنچے اور کسی واسطے سے گلکرسٹ تک رسائی حاصل کی۔ قصہ کے دیباچے میں نثر کے علاوہ ایک قطعہ بھی گلکرسٹ کی مدح میں شامل کر دیا۔ ایک شعر یہ ہے۔

ہے اس کا نام نامی گلکرسٹ ، اب جہاں ہے مہر جود اس کے سے تاباں

غرض حیدری کی کوشش کامیاب ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج میں ان کو نوکری مل گئی۔ وہاں میر بہادر علی حسینی نے دستگیری کی۔ ان کے ''دل مضمحل'' کی کلفت دور ہوئی۔ اور:

''جان گلکرسٹ صاحب بہادر نے..... فرمایا کہ تو اس قصۂ پرسوز (لیلا مجنوں) نظم ہندی کو بیچ زبان ریختہ اردوے معلّٰی کے ساتھ فصاحت شیریں سخنی کے نثر کر اور احاطۂ

تحریر میں لا۔'' 28؎

معلوم ہوتا ہے کہ اب حیدری نے موقع بہ موقع گلکرسٹ کی مدح کی تھی۔ ان کے دیوان میں بھی ایک قطعہ ہے جس کے دو شعر یہ ہیں۔

گلکرسٹ صاحب وہ ہے عادل زماں　　خوشہ چیں ہو اس کا اب نوشیرواں

زیرِ دست اس کے ہوانبارِ طلا　　گر ہو اک ذرّہ کسی پر مہرباں

نظم ونثر کی ان تحریروں سے اندازہ کیا جانا چاہیے کہ حیدری وغیرہ کی نظر میں گلکرسٹ (اور اس کے جانشینوں کی بھی) کیا قدر و منزلت اور بلند حیثیت تھی۔

اکبر شاہ ثانی کے زمانہ سلطنت میں حیدری کہنہ مشق اور معروف نثر نگاروں میں شمار ہوتے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے اردو نثر میں کئی کتابیں لکھی تھیں۔ بعض کے نام یہ ہیں:

تاریخ نادری۔ یہ مرزا محمد مہدی استر آبادی کی تاریخ جہاں کشائے نادری کا ترجمہ ہے۔ یہ کام حیدری نے 1224ھ (=1809) میں مکمل کیا تھا۔ یہ کتاب ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

گل مغفرت: اس کتاب کے مقدمے میں حیدری نے لکھا ہے:

''اس حیدر بخش حیدری نے کتاب گلشن شہیداں سے جس کو پہلے کتاب روضۃ الشہدا سے زبان ریختہ میں ترجمہ کیا تھا، اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ سنہ بارہ سو ستائیس ہجری (= 4 فروری 1812) میں جناب فیض مآب مولوی سید حسین علی صاحب جونپوری زاد الطافہ، کے ارشاد کرنے سے، جن کی خدمت فیض درجت میں اس ہیچمداں کو ایک رسوخ دلی دنیاز باطنی ہے اس نسخہ دہ مجلس کو انتخاب کیا اور نام اس کا گل مغفرت رکھا۔ اس لیے کہ ہر ایک خاص و عام کی نظر اشرف سے گذرے، مقبول خاطر عاطر ہووے۔ بحق محمد و آلہ الامجاد۔'' 29؎

اس سے کتاب کے مطالب وغیرہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے لیکن باوجود یکہ خود حیدری نے اسے دہ مجلس کہا ہے۔ یہ دہ مجلس نہیں ہے۔ اس میں بارہ مجلسیں ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار دارالامارات کلکتہ کے ہندوستانی چھاپہ خانہ میں طبع ہوئی تھی۔ سرورق پر 1226ھ مطابق 1812 چھپا ہے۔ وجہ اس کی غالباً یہ ہوئی کہ پختہ قلم حیدری نے تالیف کا کام شروع کرنے کے فوراً بعد مسودہ کو چھاپے جانے کے لیے دے دیا تھا۔ واللہ اعلم۔

متفرق کتابیں

مستشرقین نے ملک کی مختلف بولیوں اور علوم وفنون کی تدریس واشاعت کے لیے اردو زبان میں جو کوششیں کی تھیں ان کی طرف ابھی مزید توجہ کی ضرورت ہے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں انھوں نے ان مقاصد سے جو کتابیں لکھی تھیں یہاں ان میں سے صرف بعض کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے:

1۔ **قاعدۂ زبان پنجابی**۔ حکیم حبیب الرحمٰن نے اس قاعدے سے متعلق جو اطلاع فراہم کی ہے، یہ ہے:

> ''اردو زبان میں منشی کالی راج نے حسب ہدایت ڈاکٹر ولیم ہنٹر سکرٹری فورٹ ولیم کالج، اس قاعدہ کو 1811 (1226ھ) میں لکھا۔ منشی کالی راج پہلے مسٹر برج کمشنر حسن پورہ؟ کے منشی تھے اور غالباً پنجابی تھے۔ (یہ کتاب) قلمی ہے اور اب تک غیر مطبوعہ (انڈیا آفس لائبریری)۔''30

2۔ **دولتِ ہند**۔ اس کتاب کا بھی حکیم حبیب الرحمٰن نے تعارف کرایا ہے اور اپنی مدلل رائے بھی تحریر کی ہے۔

> ''فن زراعت وباغبانی پر اردو زبان میں میرے خیال میں یہ سب سے پہلی کتاب

ہے زبان قدیم، رنگانت اور تشبیہ واستعارہ کی وجہ سے سلیس نہیں ہے، لیکن جب مصنف چاہتا ہے تو اپنی تحریر میں سلاست پیدا کر لیتا ہے۔ مسٹر ہنری فنوک اس کے مصنف ہیں۔ میرے پاس دولتِ ہند کا جو نسخہ ہے وہ مطبع مصطفائی کانپور (1266ھ) کا چھپا ہوا ہے اور یہ مطبوعۂ کلکتہ کی نقل ہے۔ کتاب باتصویر ہے اور تصویریں اصول فن کے موافق نہیں ہیں۔"31

بائیس باب میں نہایت کارآمد اور مفید باتیں اس فن کی اور متعلقاتِ فن کی بیان کی ہیں۔ غالباً یہ (نسخہ) ہنری فنوک نے ہارٹی کلچرل سوسائٹی کلکتہ کے لیے لکھا تھا اور شروع اُنیسویں صدی میں کلکتہ میں چھپا۔ زبان اگرچہ رنگین ہے کہیں کہیں بنگال کے اردو محاورے لکھ جاتے ہیں۔ سو برس اوپر ہوئے کہ یہ کتاب لکھی گئی لیکن آج بھی اردو زبان میں بمشکل اس سے اچھی کتاب ملے گی۔

اس کتاب کے دیباچے کا ایک اقتباس یہ ہے:

"یہ لفظ بسم اللہ سب سے افضل ہے ذکر اللہ۔ گلدستہ حمد بے شمار اور ثنائے ہزار در ہزار باغبان گلزار ہمیشہ بہار کے واسطے ہے کہ جس نے ابوالبشر کو پہلے چمنستانِ رضواں کے مبزہ زاروں اور رنگین روشوں کو عشرت اور عسرت کی آنکھوں سے دیکھا یا اور طرۂ شکرو سپاس لائق اس آرایش دینے والے حدیقہ گیتی اور تازگی بخشنے ہارے گلشنِ ہستی کے ہے کہ جس نے بنی آدم کو مرغزار بہشت سے نکالکر واسطے انتظامات کاینات کے پیچھے تخت زمرّدیں پر خاک کے بٹھا کر زراعت کے آئین کو ان کے بخیۂ اقتدار میں سپرد کیا اور رفعت بے پایاں تمام پیغمبران صلوٰۃ اللہ علیہم کے لیے ہے کہ جن کے قدم میمنت لزوم کی برکت سے گلشنِ دہر نے رونق تازہ پائی اور درخت وجود (امت) بھی کے پھلوں سے بارور ہوا۔"

مسٹر ہنری فنوک کے نام سے شائع ہونے والی اس کتاب کی عبارت خود بول رہی ہے کہ ۔

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

اس کتاب کے مطبوعہ نسخہ کے بارے میں قاموس الکتب اردو میں جو اطلاعات قلمبند کی گئی ہیں درج ذیل ہیں:

'' کانپور مطبع مصطفائی، 1266ھ (= 1850) باردوم، صفحات 138 کیفیت بیس ابواب پر مشتمل فنِ زراعت و باغبانی اور اس کے لوازمات اور ضروریات پر مشتمل کتاب۔ مختلف غذائی اجناس، پھلوں اور ترکاریوں کی کاشت پر اس اعتبار سے اہم ہے کہ یہ اردو زبان میں اس فن پر اوّلین کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ نیز ہنری فنوک نے جو زبان استعمال کی ہے اگر وہ فی الواقع انھیں کی ہے تو ادب و زبان کے طالبعلم کے لیے خصوصی اہمیت اور توجہ کی حامل ہے۔

پہلی بار کلکتہ میں شایع ہوئی۔ یہ اسی کا نقش ثانی ہے۔''32

تعجب ہے کہ یہاں ابواب کی تعداد بیس لکھی ہے۔ صحیح بائیس ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے پہلے ایڈیشن کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ ثلاثۂ غسالہ کے مرتّب نے ''تعلیقات'' کے تحت اس کتاب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ قابلِ اعتنا نہیں معلوم ہوتا۔

3۔ اخوان الصفا۔ یہ کتاب اصلاً عربی میں تھی۔ مولوی محمد اکرام علی نے فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہو جانے کے بعد کپتان جان ولیم ٹیلر کی فرمائش سے اس کے ایک مُجوّزہ اردو زبان میں 1225ھ (= 1810) میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کتاب کا اسی سال کا لکھا ہوا ایک مخطوطہ دہلی میں محفوظ ہے، جس پر وزیرالدولہ محمد وزیر خان کی 1223ھ کی مہر ثبت بتائی گئی ہے۔34

آغاز: ''سپاس بیقیاس اس واجب الوجود کو لائق ہے جس نے اجسام ممکنات میں باوجود وحدت، ہیولا کے، مختلف صورتیں بخشیں اور ماہیتِ انسانی کو جنس و عقل سے ترکیب دیکر ایک فرد کو علاحدہ علاحدہ قوتیں عطا کیں۔''

اختتام: ''بادشاہ نے فرمایا کہ سب حیوانات انسانوں کے تابع اور زیرِ حکم رہیں اور ان کی فرمانبرداری سے تجاوز نہ کریں۔ حیوانوں نے بھی قبول کیا اور راضی ہو کر سب نے بہ حفظ واماں وہاں سے مراجعت کی۔ ''35

مولوی اکرام علی کے حالات کچھ معلوم نہیں ہوتے اور ان کی یادگار یہی ایک کتاب اخوان الصّفا ہے۔ اس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ بہ ضرورت شعر کہہ لیتے تھے چنانچہ اس کتاب میں بھی موقع بہ موقع اشعار شامل کیے ہیں۔ حمد کے بعد جو ابیات لکھے ہیں ان میں سے

ایک یہ ہے۔

بیاں حمد اس کی ہم سے کیاادا ہو جہاں قاصر زبانِ انبیا ہو

دیوانِ جہاں۔ بنی نرائن نام، جہاں تخلص، مہاراجا لکشمی نرائن کے بیٹے اور کھیم نراین رند تخلص کے چھوٹے بھائی، اصلاً لاہور کے رہنے والے تھے۔36 غریب الوطن ہوکر گھر سے چلے اور کلکتہ پہنچے۔ حیدر بخش حیدری کی سفارش سے فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔

فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی زمانے میں علی ابراہیم خاں خلیل کے تذکرے (گلزار ابراہیم) کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ اس روایت کو بنی نرائن نے باقی رکھا اور کپتان روبک کی ایما سے اردو شاعروں کا ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا۔ ترتیب ابجد والی رکھی ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد نے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے نسخے کے متن کو مدت ہوئی چھپوادیا تھا۔ اس کے آخر میں اس کا سالِ اتمام اس طرح تحریر ہے:

"تمام شد بتاریخ سی ام ستمبر 1812 (1227ھ) بتوفیق اللہ۔"37

بنی نرائن نے اس تذکرے کا نام دیوانِ جہاں رکھا تھا۔ اس میں شاید اپنے تخلص جہاں کے لغوی معنی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے صحیح لکھا ہے کہ:

"دیوان جہاں حقیقتاً بیاض ہے۔ اسے تذکرہ صرف اس لیے کہہ لیجیے کہ اس میں منتخبات کلام سے پہلے شاعر کا نام اور تخلص دیا ہوا ہے۔ کسی جگہ بھی نثری ترجمہ ایک یا نصف سطر سے زیادہ نہیں ہے۔"

داستان

کہا جا چکا ہے کہ سرکار کمپنی بہادر کے مقاصد سے سب سے زیادہ مطابقت داستانوں کو تھی چنانچہ اس زمانے کے تقریباً سبھی لکھنے والوں نے اردو نثر کی اس صنف کی طرف توجہ کی تھی۔ بینی نرائن جہاں نے بھی چند داستانیں لکھ کر اپنے زمانے میں شہرت حاصل کی تھی۔

بینی نرائن جہاں کی پہلی داستان چار گلشن ہے جو انھوں نے 1225ھ (1810) میں منشی امام بخش کی ایما سے سلیس اور سادہ، بول چال کی زبان میں لکھی تھی۔ جہاں کی دوسری داستان بہار عشق ہے جس کے بارے میں خود ان کا بیان ہے کہ:

''بعد اس (چار گلشن) کے قصہ دلارام کو..... تصنیف کر کے شہر میں رواج دیا اور نام اس کا بہار عشق رکھا۔''

یہ داستان فیضی کی فارسی مثنوی نلدمن کے قصے پر مبنی ہے۔ بینی نرائن سے پہلے ان کے ایک معاصر سید نور علی نے بھی اسے اردو میں لکھا تھا لیکن اس کا ترجمہ کالج کونسل نے پسند نہیں کیا۔ بینی نرائن کا ترجمہ مقبول ہوا چنانچہ اس کامیابی سے ان کا حوصلہ بہت بڑھ گیا اور انھوں نے بہت تیزی سے قصے لکھنے میں خود کو مصروف کر لیا۔

بینی نرائن جہاں کا تیسرا قصہ یوسف زلیخا ہے۔ اس کا نام انھوں نے گلزار حسن مقرر کیا تھا۔

چوتھا قصہ گل وصنوبر یعنی نو بہار ہے جو انھوں نے اپنے پرانے رفیق منشی امام بخش کی تحریک سے صرف دو ہفتے میں فارسی سے اردو میں منتقل کر دیا۔ اس کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے:

> ''بالفعل اب 1240ھ اور 1824 ہیں، عہد دولت میں لارڈ امرس صاحب بہادر کے ایک دن منشی امام بخش کہ پچیس برس کے عرصے میں اس خاکسار کے ساتھ رابطۂ محبت دلی رکھتے ہیں فرمانے لگے کہ سابق میں قصہ گل وصنوبر کو منشی باسط خاں نے تصنیف کیا تھا، ظاہراً نامربوطی اور بے محاورگی الفاظ کے باعث صاحبان کالج کونسل کی نظر مبارک میں پسند نہ پڑا بلکہ انھیں کو واپس ہوا۔ حق تو یہ ہے کہ اس زمانے میں مدرسۂ کمپنی انگریز بہادر یعنی کالج دارالظفر ب عالموں اور فاضلوں کا ہے، جو کتاب کہ وہاں کے صاحبوں کو پسند نہ پڑے اور نامنظور ہو کر نکالی جاے پھر اسے کون پوچھتا ہے۔ تم کو حق تعالیٰ نے ذہن رسا عطا فرمایا ہے اور کئی ایک کتابیں تیری شہر میں مشہور ہیں بلکہ بہت سے لوگ خوش ہو کر بہ طریق تحفہ ملک بہ ملک لے گئے۔ اب تجھ کو لازم ہے کہ اس قصۂ رنگین کو نثر و نظم سے آراستہ کر کے کانوں کو زیب و زینت بخشو.....اس بات کو پاس خاطر منشی صاحب ممدوح کے قبول کیا اور دو ہفتے میں تمام قصہ گل وصنوبر کو کتاب فارسی سے ترجمہ کیا۔''

بینی نرائن کا دعویٰ جو بھی ہو، کوئی وجہ اس بات کی موجود نہیں ہے کہ انھوں نے منشی باسط خاں کے ترجمے سے استفادہ نہیں کیا تھا۔ ان کے ترجمہ کا (جو نقش ثانی کی حیثیت رکھتا ہے) بہتر ہونا قدرتی اور لازمی تھا۔

بینی نرائن جہاں کی اس سلسلے کی آخری تالیف غالباً باغ عشق ہے۔ اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

> ''اب کہ ایک ہزار (آٹھ سو) بیس و چار عیسوی اور بارہ سو (چالیس ہجری) نبوی ہیں، ایک دن اس خاکسار کے گوش زد ہوا کہ قصہ لیلا و مجنوں جو مولانا عبدالرحمان جامی رحمتہ اللہ علیہ نے فارسی زبان سے نظم میں تصنیف کیا تھا، ہر چند کہ وہ قصہ سماعت میں شہرہ کمال رکھتا ہے اور فی الحقیقت چنداں لطف نہیں رکھتا، ظاہراً کسی شخص نے اس قصے

کو فارسی سے زبانِ ریختۂ ہندی میں ترجمہ کیا ہے لیکن اب تک دیکھنے میں کسی کے نہیں
آیا، صرف نام ہی سُنا جاتا ہے۔"

بینی نرائن نے اُس زمانے کی روش کے مطابق اس قصے کو بھی نظم آمیز نثر میں لکھا ہے چنانچہ دیباچے کے بعد کے ان کے اشعار یہ ہیں۔

الٰہی جو کہ اس نسخے کو دیکھے دعا دے مجھ کو اور تحسین بھیجے
پڑھے جو کوئی یہ نادر کہانی تو دیکھے یہ مری گوہر فشانی
پڑھے اور آفریں مجھ کو کہے وہ ہمیشہ عشق میں ڈوبا رہے وہ
اگر مجنون ولیلا جیتے رہتے حدیثِ عشق اس دفتر سے لکھتے
ہے باغِ عشق جو اس کا رکھا نام
خدا کے فضل سے یہ ہوئے اتمام

ان شعروں سے ظاہر ہے کہ یہ لیلا مجنوں کا قصہ ہے اور موضوع کی مناسبت سے مولف نے اس کا نام باغِ عشق رکھا ہے۔

تنبیہ الغافلین۔ آخر زمانے میں بینی نرائن جہاں نے مذہب سے متعلق ایک کتاب کا بھی اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ حکیم حبیب الرحمان نے اس ترجمے کا تعارف اس طرح سے کرایا ہے:

"مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ نے فارسی میں یہ رسالہ (تنبیہ الغافلین) لکھا تھا اور اسی زمانے میں اس کا اردو ترجمہ بھی شایع ہو گیا تھا مگر وہ ترجمہ بھی صاف اور سلیس نہ تھا اس لیے منشی بینی نراین متخلص بہ جہاں نے 1814 (1299ھ) میں پھر سے یہ ترجمہ کیا۔ جہاں قوم کے کھتری اور لاہور کے باشندے تھے۔ کلکتہ میں آئے اور بارہ برس تک رہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہیں انتقال بھی ہوا۔ مسلمان ہوئے تھے اور سید احمد بریلوی مشہور مجاہد کے مرید بھی تھے۔ کلکتہ میں وہ فورٹ ولیم کالج کے صیغۂ تالیف میں ملازم تھے۔ حیدر بخش حیدری نے کیپٹن ناس ریوبرک سیکرٹری کالج مذکورہ کی خدمت میں ان کو پیش کیا تھا۔ ان سے بہت سی کتابیں یادگار ہیں۔"38

اس اقتباس میں کئی کتابیں صحیح نہیں ہیں۔

تنبیہ الغافلین کا پہلا اردو ترجمہ اس کتاب کی تصنیف کے فوراً بعد ہو گیا تھا۔ یہ بات بہت صحیح نہیں ہے۔ ترجمہ ہوا تو ضرور تھا لیکن اس سے متعلق تا حال کوئی بات معلوم نہیں ہے۔

بنی نرائن کے ترجمے کا سال 1814 نہیں ہے۔ قیاساً کہا گیا ہے کہ یہ ترجمہ 1245ھ (1829-30) میں ہوا تھا۔

بنی نرائن جہاں کے قیام کلکتہ کی مدت بارہ برس نہیں تھی۔ وہ 1215ھ میں کلکتہ پہنچ گئے تھے اور کم سے کم تیس برس تک وہاں ضرور مقیم رہے تھے۔

بنی نرائن نے اپنے دوستوں کی فرمائش سے رسالہ تنبیہ الغافلین کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ان کے ترجمے میں اصل کے مطابق بیس ابواب ہی تھے۔ سید عبداللہ حسینی نے ضرور اپنے ترجمے میں نظر ثانی کے وقت چار ابواب کا اضافہ کر دیا تھا۔ بنی نرائن کا ترجمہ ان کلمات سے شروع ہوتا ہے۔

"اچھی اچھی صفتیں اور تعریفیں اللہ تعالیٰ کو ثابت ہیں کہ خدا تعالیٰ پیدا کرنے والا اور پالنے والا تمام خلق و عالم کا ہے اور درود بنا محمود اس کے پیغمبرؐ کے اوپر"

رسالہ تنبیہ الغافلین کے اردو ترجمے پر مشتمل ایک ایسے مخطوطے کا بھی تعارف کرایا گیا ہے جس پر مترجم کا نام درج نہیں ہے۔ اس نسخے کے آخر میں سال تکمیل:

الف "دوازدہم محرم الحرام 1246ھ مطابق نہم ماہ فروری 1237 فصلی موافق 1830 عیسوی"39

لکھا ہے ممکن ہے کہ یہ بنی نرائن اور عبداللہ حسینی کے علاوہ کسی اور کا کیا ہوا ترجمہ ہو۔ واللہ اعلم۔

3۔ہوگلی

1۔واثق	نواب واثق علی خاں	255
2۔اختر	قاضی محمد صادق خاں	256

کلکتہ سے متصل ہونے کی وجہ سے ہوگلی کو علمی مرکز کی حیثیت سے ترقی نہیں ہوسکی البتہ کاروباری ضرورتوں سے یہاں پر اٹھارھویں صدی کے ربعِ آخر میں طباعت کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ سید عبداللہ حسینی کا مطبعِ احمدی بھی ہوگلی کے محلہ چیچڑہ میں واقع تھا اور وہاں سے کتابوں کی طباعت کا سلسلہ جاری تھا۔

1۔ واثق

ہوگلی کی قابلِ ذکر قدیم علمی شخصیتوں میں سے تھے۔ سید علی حسن خان بہادر نے ان کے ذکر میں لکھا ہے:

''واثق۔ نواب واثق علی خاں خلف الصدق نواب یار بیگ خاں، دررو سائے شہر ہوگلی سرعز و امتیازی افراشت و قاضی محمد صادق خاں اختر بالذسبتِ دامادی داشت۔ در اکثر علوم و فنون ماہر و در نظم تلمیذ قاضی سراج الدین علی خاں موجد موہانی بود و در اواسطہ مأیۃ ثالث عشر و ثوتے بر این دار فانی نہ کردہ طریق آخرت پیمود۔

بہ مزارم اگر بر سد مہ من ز دردِ من مزار نظارہ کنم
بشکون قدوم مسیح خودم چہ عجب کہ حیات دوبارہ کنم'' 1

واثق بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔ ممکن ہے کہ اردو میں بھی شعر کہہ لیتے ہوں لیکن تا حال ہمیں ان کا اردو کا کلام دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔

2-اختر

اوپر ان کا ذکر آیا ہے۔ نساخ نے ان کا احوال اس طرح قلمبند کیا ہے:

''اختر تخلص قاضی محمد صادق خاں بہادر مرحوم ولد قاضی محمد لعل مرحوم، باشندۂ ہوگلی شاگرد مرزا قتیل۔ لکھنو واطراف لکھنو میں ہمیشہ عہدۂ عمدہ پر مامور رہے۔ تذکرہ آفتاب عالمتاب وبحار حیدری ودیوان فارسی وریختہ وگنج نیرنج وغیرہ بہت سی تصانیف ان کی مشہور ہیں۔ زبان فارسی خوب جانتے ہیں۔ فن شعبدہ میں کمال تھا۔ کیمیا گر مشہور تھے اور بہت سے فنون میں دخل رکھتے تھے۔ بہت سی تصنیفات ان کی نظر سے گذریں۔ تھوڑا عرصہ گذرا کہ انتقال کیا۔''2

ان کا سال ولادت کلمہ اختر سے 1201ھ (1786) برآمد ہوتا ہے۔ 1275ھ (1858) میں انھوں نے بمقام اٹاوہ وفات پائی۔ واجد علی شاہ بادشاہ نے ان کو تخلص خوشتر عنایت کیا تھا۔ بیشتر اپنے وطن سے دور دور رہے اس لیے ان کے کلام میں تنوع کی صورت پائی جاتی ہے۔ مشکل زمینوں میں غزلیں خوب کہتے تھے۔ قطعے بھی اکثر کہے ہیں لیکن اپنی مثنوی سراپا سوز کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ حکیم حبیب الرحمٰن نے لکھا ہے:

''یہ اردو مثنوی ساڑھے چھ سو اشعار کی قاضی محمد صادق خاں اختر نے تصنیف کی ہے مطبع مسیحی لکھنو میں چھپی تھی۔''3

سال تصنیف اور مثنوی کے موضوع کا بیان نور شاگرد اختر نے اس شعر میں کیا ہے۔

اس کی چاہے اگر کوئی تاریخ ہے بیان شہادت عاشق

1244ھ(1828-29)

اس مثنوی کے قلمی نسخے بھی اکثر کتب خانوں میں محفوظ ہیں اور یہ کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔

ہوگلی میں، قاضی محمد صادق خاں اختر کے وہاں سے چلے جانے کے بعد کوئی موثر اور نام برآوردہ ایسا شاعر نہیں رہ گیا تھا جس کے فیض سے وہاں شعروادب کی سرگرمیاں جاری رہ سکتیں۔

4-ڈھاکہ

1- طپش مرزا محمد اسماعیل 260

2- آتش مرزا غلام حسن 261

3- محشر عبداللہ خاں 262

جہانگیر نگر عرف ڈھاکہ بنگال کے اہم مقامات میں سے ہے۔ حکیم حبیب الرحمٰن نے تاریخ ڈھاکہ لکھنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، اس کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے:

''آسودگانِ ڈھاکہ سلسلۂ تاریخ ڈھاکہ کی پہلی کڑی ہے۔ دوسری کڑی مساجدِ ڈھاکہ اور تیسری کڑی ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے اور چوتھی کڑی شعرائے ڈھاکہ ہے۔''1

آسودگان ڈھاکہ ایک سو اٹھاون صفحات کا رسالہ اکتوبر 1946 میں منظر پریس ڈھاکہ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ سرورق کی عبارت یہ تھی:

''ہندوستان کے مشرقی گہوارۂ تمدن اور بنگال کے مرکز تہذیب و معاشرت یعنی ڈھاکہ اور اس کے ملحقات کے قبور مسلمین کے حالات

آسودگان ڈھاکہ

جس میں تلاش و تحقیق کے گراں مایہ نتائج پہلی بار پیش کیے گئے ہیں اور بنگال کی ضمنی تاریخ پر ایسی روشنی ڈالی گئی ہے کہ ہر زاویہ مستور جگمگا اٹھا ہے۔''2

ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے بھی حکیم صاحب کی وفات کے بعد شائع ہوئی لیکن مساجد ڈھاکہ اور شعرائے ڈھاکہ کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ اتنا معلوم ہے کہ بقول حکیم صاحب:

''مساجد ڈھاکہ کے بارے میں ایک رسالہ تیار ہے جو اس رسالہ (آسودگانِ

ڈھاکہ) کے متصل بعد ہی اشاعت پائے گا۔ انشاءاللہ"

لیکن افسوس ہے کہ وہ چھپ نہ سکا اور پھر غالباً ضائع ہوگیا۔ اگر یہ سب رسالے چھپ جاتے تو بہت علمی فوائد حاصل ہوتے۔

1۔ طپش

ڈھاکہ میں اردو شاعری کو رواج دینے والوں میں سب سے زیادہ اہم نام مرزا جان طپش کا معلوم ہوتا ہے۔ نساخ نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"طپش تخلص مرزا محمد اسماعیل عرف مرزا جان ولد مرزا یوسف بیگ۔ سید جلال الدین بخاری کی اولادوں میں تھے۔ مولد و مسکن ان کا دہلی۔ وہاں سے آکر لکھنؤ میں مرزا جہاندار شاہ بہادر کی رفاقت میں تھے اور ان کے حکم سے اپنے دیوان کو مرتب کر کے نام تاریخی اس کا گلزار مضامین رکھا تھا۔ بعد ازاں 1199ھ بنگالہ میں آکر مدت تک شہر ڈھاکہ میں نواب شمس الدولہ بہادر کی رفاقت میں رہتے تھے۔ سنسکرت میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ کسب سخن حضرت خواجہ میر درد سے کیا تھا۔ شعر اچھا کہتے تھے، خصوصاً مقطعات ان کے لاجواب ہوتے ہیں۔ کلیات ان کا نظر سے گذرا۔" 3

آخر عمر میں طپش نے بہار دانش کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ حکیم حبیب الرحمٰن نے لکھا ہے کہ:

"ترجمہ بہار دانش از مرزا محمد اسماعیل عُرف مرزا جان طپش دہلوی۔ طپس جن دنوں نواب شمس الدولہ نایب ناظم ڈھاکہ کے ساتھ کلکتہ میں قید تھے، یہ مثنوی اسی عہد میں لکھی تھی۔" 4

بعد میں طپش نے اس مثنوی میں لارڈ منٹو، ہارڈنگ اور کپتان ٹیلر وغیرہ کی مدح شامل کر دی تھی اور نتیجہ کے طور پر پانچ سو روپیہ کا انعام پایا تھا۔ 5 یہ مثنوی پہلی بار مطبع محمدی کلکتہ سے ٹائپ میں 1255ھ (18=) میں چھپی تھی۔ 1963 میں جناب خلیل الرحمٰن داودی نے اس کو اپنے مقدمے کے ساتھ مرتب کر کے مجلس ترقی ادب لاہور کی طرف سے چھپوا دیا تھا۔

رواجِ زمانہ کے مطابق طپش نے اس اپنی مثنوی بہارِ دانش کو بھی حمد و نعت سے شروع کیا ہے، اس طرح ۔

بیاں کیا کروں حمد پروردگار کہ عجزِ بیاں سے ہوں بس شرمسار
کہ طاقت کہاں اس قدر نطق کو جو تحمید اس کی سرانجام ہو

اس کے بعد ''درتعریف عہد صاحبان عالی شان'' کے تحت مختلف انگریزوں کی تعریف نظم کی ہے۔ پھر داستان کا آغاز اس شعر سے کیا ہے۔

سنو اب جہاندار کی داستاں ہوئی جس طرح فارسی میں بیاں

داستان کا اختتام اس عنوان سے کیا گیا ہے:

''انسان شدنِ جہاندار شاہ از قالبِ طوطی''

ترا جس میں جی بہلے وہ ہی ہے خوب وہی بازیوں بیچ بازی ہے خوب
یہ کہہ کر منگا ایک آہو کے تئیں گیا مار کر اس کے گھٹا دہیں

طپش نے اپنی اس مثنوی کو میر حسن کی سحر البیان کا جواب بنانا چاہا تھا لیکن اس مقصد میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔

طپش متداول سبھی شعری اصناف پر قادر تھے۔ ان کی استادانہ حیثیت مسلّم تھی۔ ڈھاکہ اور دوسرے شہروں میں ان کے شاگرد موجود تھے۔ ان میں سے طپاں زیادہ معروف تھے۔

2۔ آتش

مرزا طپش کے ایک اور شاگرد آتش ڈھاکے ہی میں مقیم تھے۔ ان کے بارے میں نساخ نے لکھا ہے:

''آتش تخلص، مرزا غلام حسین ولد مرزا کریم اللہ بیگ، باشندۂ ڈھاکہ، شاگرد و داماد میرزا جان طپش۔ عدالت دیوانی ڈھاکہ میں وکالت کرتے تھے۔''[6]

یہ معمولاً غزل کہتے تھے اور نادر مضامین نظم کرتے تھے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے۔

آپ تو محو فنا تھے، جس طرح کانٹے کی اوس جنبشِ بادِ صبا کا اک بہانا ہو گیا

3۔ محشر

یہ ریختی گو شاعر تھے اور ڈھاکے میں آ کر کچھ مدت مقیم رہے تھے۔ نساخ نے لکھا ہے:

''محشر تخلص، عبداللہ خاں، باشندۂ رامپور۔ ریختی پڑھنے میں کمال رکھتے ہیں یعنی ریختی پڑھنے میں اس طرح پر ہتلاتے ہیں کہ دیکھنے سے علاقہ رکھتا ہے، بیان سے باہر ہے۔ دہلی سے ڈھاکہ تک بیشتر شہروں میں رہے ہیں اور ہر جگہ کے لوگ ان کو پہچانتے ہیں۔ ان میں ایک بڑا عیب ہے کہ اوروں کے شعر اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ راقم کے ملاقاتی ہیں۔ ریختی میں خانم جان تخلص کرتے ہیں۔''[7]

ہجر میں تسکین دیتا میں کہ سر کو پیٹتا ایک دل پر ہاتھ تھا میرا، جگر پر دوسرا

(5) سلہٹ

1-	عبدالقادر	265
2-	ریاض علی	266
3-	بیخود مولوی فرجام علی	266

میر شیر علی افسوس نے ''سرکار سلہٹ'' کے عنوان سے جو لکھا ہے، مختصراً یہ ہے:

''آبادی اس کی پہاڑوں میں ہے۔ گینڈے کی ڈھال وہاں کی مشہور ہے۔ فی الواقع ہندوستان کے کسی ملک میں ایسی سپر نہیں بنتی۔ میوے بھی وہاں کے اکثر خوش ذائقہ..... چوب چینی اور اگر کے درخت بھی بہتایت سے وہاں کے پہاڑوں میں ہوتے ہیں اور خوابہ سراوں کی افراط اس دیار میں (ہے)۔''1

غرض یہ خطہ ہر اعتبار سے پُر نعمت تھا۔ آبادی بھی اس علاقے کی بہت اچھی تھی۔ فارسی زبان سے اکثر لوگ دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ وہاں کی تصانیف بیشتر اسی زبان میں تھیں۔ یہاں ضمناً دو ایک کا ذکر کیا جاتا ہے:

1۔ عبدالقادر

حکیم حبیب الرحمٰن نے ان کے حالات میں لکھا ہے:

''مولوی عبدالقادر بن مولوی ابوالقصر محمد ادریس بن مولوی ابوسعید محمد محمود، رئیس وزمیندار سلہٹ، مولوی محمد ناظم بنگال کے مصاحب تھے اور مرشد آباد میں رہتے تھے۔ ان کے والد مولوی محمد کلیم حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ تھے۔ مولوی عبدالقادر باوجودیکہ بہت بڑے زمیندار تھے، انھوں نے شغل درس وتدریس کو موقوف نہیں کیا تھا۔''2

مولوی عبدالقادر کی دو کتابوں کا ذکر ملتا ہے: رسالہ ردِ معقول اور ماٴ خذ العرفان من

صنع السبحان۔

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ سلہٹ میں شاہ عالم بادشاہ کے وقت سے ہی اہل علم آ کر سکونت اختیار کرنے لگے تھے۔

2۔ ریاض علی

ان کا تعارف حکیم حبیب الرحمٰن نے اس طرح کرایا ہے:

''مولوی ریاض علی ابن سید قمبر علی ابن سید محمد اشرف متوطن ضلع سلہٹ۔ بخلاف تمام کتابوں کے خاتمہ میں شارح نے بعد حمد و نعت کے بیان کیا ہے کہ گلستاں کی عربی شرح اور دیگر کتب لغت اور مدرسہ کے کتب خانوں کی دوسری ضروری کتابوں کی امداد سے سات مہینے کی شبانہ روز محنت سے یہ شرح (گلستاں) لکھی ہے۔ متن کے لیے گلستاں مصححہ مولوی اللہ داد مرحوم پر شارح نے اعتبار کیا ہے۔..... میرے پاس جو نسخہ ہے یہ 1268ھ (1852) کا مطبع محمدی کلکتہ کا مطبوعہ ہے لیکن خاتمۃ الطبع سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا ایڈیشن خود شارح نے چھپوایا تھا اور یہ پانچواں ایڈیشن ہے۔''3

سلہٹ کا علاقہ تمام معروف علمی مراکز سے دور تھا۔ یہ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کے بھی زیر اثر نہیں تھا۔ اس کے باوجود یہاں شاہ عالم ثانی کے زمانے میں ہی اردو شعر و سخن سے دلچسپی لی جانے لگی تھی۔ شاید اسے مرزا مظہر جان جاناں کے عقیدت مندوں کا فیض کہا جا سکتا ہے۔

کسی قدر بعد کے زمانے میں اس خطے میں اردو شاعری کو رواج دینے کا سہرا مرزا جان طپش اور ان کے تلامذہ کے سر معلوم ہوتا ہے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے ان کے ایک شاگرد کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''بیخود تخلص مولوی فرجام علی باشندۂ بینا چونک ضلع سلہٹ شاگرد مرزا جان طپش۔ صاحب دیوان گزرے۔''4

ان کے دیوان کا قلمی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگلہ دیش کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ اس کی ضخامت چوراسی صفحات کی ہے۔ مولوی سید مبارک علی اور مولوی محمد عبدالسبحان نے اس کی کتابت 17۔ شوال 1292ھ (= 1865) کو مکمل کی تھی۔

حواشی

1۔مرشدآباد

1۔مجموعۂ نغز	حصہ 1	ص194
3,2۔ایضاً	حصہ 1	ص80
4۔ایضاً	حصہ 1	ص82
5۔قاموس الکتب	ج2	ص428
6۔مجموعۂ نغز	حصہ 2	ص123
7۔سخن شعرا		ص338
8۔مجموعۂ نغز	حصہ 1	ص384
9۔گلزار ابراہیم		ص235
10۔سخن شعرا		ص414
11۔سراپا سخن		ص232
12۔گلزار ابراہیم		ص253
13۔سخن شعرا		ص540

14۔گلزار ابراہیم ص259
15۔سخن شعرا ص414
16۔ایضاً ص368
17۔ایضاً ص358
18۔تلخیص معلا (علی گڑھ) ص173
19۔ایضاً ص92

(2) کلکتہ

1۔گل بکاؤلی ص5
2۔گلشن ہند ص238
3۔ریاض الفصحا ص131
4۔گلشن ہند ص57 تا 58
5۔ایضاً ص209
الف۔نظم
6۔ریاض الفصحا ص71
7۔سکندر نامک ص3
8۔سخن شعرا ص338
9۔ایضاً ص455
10۔ایضاً ص196
11۔دیوان حیدری، مقدمہ ص12 تا 13
12۔ایضاً، پیش لفظ ص3
13۔ایضاً مقدمہ ص13

14۔طبقات شعرائے ہند ص270

15۔دیوان حیدری ص58

16۔گل مغفرت ص187

17۔دیوان حیدری مقدمہ ص28

۱۸۔دیوان ولا، مقدمہ ص11 تا 13، 19 تا 28

19۔ایضاً ص11

20۔سخن شعرا ص32

21۔سخن شعرا ص10

22۔ریاض الفصحا ص253 تا 254

23۔سخن شعرا ص488

24۔ایضاً ص426

25۔سراپا سخن ص124

26۔سخن شعرا ص302

27۔ایضاً ص21

28۔ایضاً ص174

29۔خمخانہ جاوید جلد۳ ص298

30۔گلشن بے خار ص85

31۔سخن شعرا ص174

32۔ایضاً ص434

33۔ثلاثۂ غسالہ ص88

34۔ایضاً ص81

ب۔ مطبع، اخبار

1۔ کلکتہ کے مطابع		ص12
2۔ گلکرسٹ اور اس کا عہد		ص144
3۔ ایضاً		ص36
4۔ ہندستانی پریس		ص268تا270

ج۔ نثر

1۔ گلکرسٹ اور عہد		ص41
2۔ ایضاً		ص137
3۔ کلکتہ کے مطابع		ص67
4۔ قاموس الکتب جلد1		ص1089
5۔ ایضاً	جلد1	ص1082
6۔ ایضاً	جلد1	ص1076
7۔ کلکتہ کے مطابع		ص68
8۔ قاموس الکتب جلد1		ص1095
9۔ کلکتہ کے مطابع		ص158
10۔ قاموس الکتب جلد1		ص1054
11۔ اردو مخطوطات رامپور		ص57تا59
12۔ علما کا حصہ		ص
13۔ اردو مخطوطات بمبئی		ص43
14۔ علما کا حصہ		
15۔ اردو مخطوطات بمبئی		ص43

16۔اردو مخطوطات آصفیہ جلد 2 — ص137 تا 138

17۔مخطوطات رامپور — ص59

18۔ثلاثۂ غسالہ — ص25

19۔علما کا حصہ — ص218 تا 220

20۔ایضاً — ص220 تا 221

21۔اردو مخطوطات آصفیہ جلد 2 — ص151

22۔علما کا حصہ — ص222 تا 225

23۔اردو مخطوطات آصفیہ جلد 2 — ص152

24۔علما کا حصہ — ص226 تا 227

25۔ثلاثۂ غسالہ — ص24

26۔گلشن ہند، مقدمہ — ص12 تا 15

27۔دیوان حیدری، مقدمہ — ص14 تا 15

28۔ایضاً ایضاً — ص16

29۔گل مغفرت، مقدمہ — ص6

30۔ثلاثۂ غسالہ — ص66

31۔ایضاً — ص35

32۔قاموس الکتب جلد 3 — ص252

33۔ثلاثۂ غسالہ — ص235 تا 236

34۔دہلی کے مخطوطات — ص140 تا 141

35۔اردو مخطوطات آصفیہ جلد 1 — ص337 تا 337

36۔تاریخ ادبیات مسلمانان جلد 3 — ص83

37۔اردو شعرا کے تذکرے ص253

38۔اردو مخطوطات سمینار 1987 ص15تا131

39۔ثلاثہ غسالہ ص25

40۔اردو مخطوطات سمینار 1987 ص120

41علما کا حصہ ص304تا305

3۔ہوگلی

1۔صبح گلشن ص577

2۔سخن شعرا ص17

4۔ڈھاکہ

1۔ثلاثہ غسالہ ص50

2۔ثلاثہ غسالہ ص6

3۔ثلاثہ غسالہ،تعلیقات ص224

4۔سخن شعرا ص5

5۔ایضاً ص420تا421

5۔سلہٹ

1۔آرائش محفل ص201

2۔ثلاثہ غسالہ ص150

3۔ایضاً ص160

4۔سخن شعرا ص74

(6)

صوبۂ متوسّط

صوبۂ متوسط کی تشکیل برطانوی حکومت کے قیام کے بعد عمل میں آئی تھی، ملک کی آزادی کے بعد حدود میں تبدیلیوں کے ساتھ صوبہ کا نام بھی بدل گیا، اور اب یہ مدھیہ پردیش کہلاتا ہے۔ بھوپال کی ریاست بھی اسی صوبہ میں ضم ہوگئی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہر ریاست کا سربراہ اپنے علاقے کی ترقی اور خوشحالی کے لیے کوشاں اور خواہاں رہتا تھا۔ لیکن ریاستوں کے مابین آویزشوں اور مقامی خانہ جنگیوں کے نتیجے میں بسا اوقات تعمیری کوششوں کی رفتار سست ہو جاتی تھی اور نتائج دیرپا ثابت نہیں ہوتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے دور میں صوبۂ متوسط بطور مجموعی غیر ترقی یافتہ اور پسماندہ تھا۔ بلاشبہ بھوپال کی ریاست خوشحال تھی اور اسے ایک علمی اور ادبی مرکز کا درجہ حاصل تھا۔

الف۔ برار	277
1-جنرل نواب نامدار خاں	280
2-جانباز منشی حشمت رائے	281
3-احسن شیخ شاہ محمد	282
ب۔ برہانپور	283
1-حافظ شجاع الدین	285
ج۔ بھوپال	291
(الف) شاعری	
1-دولھا-نواب جہانگیر محمد خاں	291
2-اخگر-حکیم اصغر حسین	293
3-رویت-مولوی حبیب احمد	293
4-مقدور-میر محمد ابراہیم	294
5-مسکین-سید عبدالواحد خاں	295

6-کرم-منشی غلام ضامن	296
7-واصل-سید واصل علی	296
(ب)نثر	299
احمد یار خاں	299
(د)جبل پور	301
علی اکبر	301
(ہ)ناگپور	303
غمگین غلام رسول	303
حشمت محمد ناصر خاں	304
حواشی	306

1 - برار:

برار کے علاقے کا معاملہ بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ وہاں کے ناظموں نے اپنے اپنے وقت میں اس خطہ کو ترقی دے کر بارونق بنانے کی کوشش کی ہوگی لیکن اب اس سلسلے کے زیادہ آثار باقی نہیں رہ گئے ہیں۔ نواب صلابت خاں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انھیں تعمیر کا شوق تھا لیکن براہ راست ان کی ایما سے وجود میں آنے والی عمارتوں کا کچھ حال معلوم نہیں ہوتا۔ ان کے آخر زمانے کے ایک امام باڑے کا کتبہ اس طرح نقل کیا گیا ہے۔

بنا کرد قصرے بہ نذر امام　　بخوبی محمد فتح جنگ خاں
ندا داد ہاتف زاداب گاہ　　حریم بزرگی زیارت مکاں

1226ھ(1811)

نواب نامدار خاں نواب صلابت خاں کے صاحبزادے تھے۔ اپنے والد کے زمانے میں جنرل کے عہدے پر فائز تھے، ان کی وفات کے بعد ان کی جگہ مسند نشیں ہوئے۔ شاعر نواز .....اور خود بھی شعر کہتے تھے۔ اپنے منصب کی مناسبت سے جنرل تخلص کرتے تھے۔ ان کے زمانے کے کئی کتبے دستیاب ہیں مثلاً

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعمیر باغ سرکار

جنرل محمد نامدار خاں

بہادر پنی سنہ 1229ھ

اسی باغ کا دوسرا کتبہ منشی حشمت رائے جانباز ایلچ پوری کی کہی ہوئی اس رباعی پر مشتمل ہے۔

جنرل نے کیا جب گلستاں بنیاد　　مخلت دہ کشمیر وارم نو ایجاد

جانباز نے تاریخ جو چاہا اس کی　　ہاتف نے کہا باغ بہاری آباد

1229ھ(1814)

(2) محلہ اشرف پورہ کے کنویں کا کتبہ:

بسم　اللہ　الرحمٰن　الرحیم

تیاری چاہ آب از سرکار فیض آثار

نواب محمد نامدار خاں بہادر پنی

ولد نواب محمد صلابت خاں پنی

درسنہ 1240ھ مطابق سنہ 1234

فصلی(1875)

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ نامدار خاں اپنے والد کی وفات کے بعد ان کی جگہ 1240ھ(1824) میں مسند نشیں ہوئے تھے۔

(3) نواب نامدار خاں کے آئینہ محل کا کتبہ:

بسم　اللہ　الرحمٰن　الرحیم

تیاری مکاں آئینہ محل سرکار فیض آثار

نواب محمد نامدار خاں بہادر ولد نواب

محمد صلابت خاں بہادر ابن نواب محمد

اسماعیل خاں بہادر پنی افغان سلیمان زئی

مہدوی بتاریخ یازدہم ماہ ربیع الثانی
سنہ 1238ھ مطابق 1232 فصلی (1823)

(4) بارہ امام باڑہ کا کتبہ:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
بانی این مکان جنت نشاں زیارت گاہ
خاص و عام بہ نذر امام علیہ السلام اضعف
العباد محمد نامدار خاں بہادر خلف
محمد صلابت خاں بہادر افغان پنی
سلیمان زئی مہدوی فدوی
نواب نظام الملک آصفجاہ بہادر
شروع بنا در سنہ 1236ھ
مطابق سنہ 1230 فصلی (21-1820)

(5) بے بہا باغ کا جو نوابین برار کا خاندانی قبرستان ہے کتبہ:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعمیر دروازہ و فصیل مقبرہ کہ محمد سلطان خان بہادر پنی افغان سلیمان زئی مہدوی بر طبق فرمان قدر جریاں نواب محمد نامدار خان بہادر ولد محمد صلابت خان بہادر بن محمد اسماعیل خان بہادر شہید بن محمد سلطان خان بہادر مرحوم ممدوح بتاریخ ہفتم شہر شوال المکرم سنہ 1256ھ مطابق سنہ 1250 فصلی روز چہارشنبہ (1840)

(6) نواب اسماعیل خان کے مزار کا کتبہ:

لا الہ الا ھو الحی القیوم

جوہر شمشیر شجاعت و دلیری معرکہ آرائے شیر مردی و شیر رستم زماں محمد اسماعیل خان بہادر پنی بن محمد سلطان خان بہادر پنی افغان سلیمان زئی مہدوی فدوی نظام الملک آصف جاہ بتاریخ دہم ماہ ربیع الاول 1189ھ بدرجۂ شہادت رسید، متوجہ بہشت بریں گردید (1775)

(7) نواب صلابت خاں کے مزار کا کتبہ:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ رحلت نواب محمد صلابت خان بہادر ولد نواب محمد اسماعیل خان بہادر پنی افغان سلیمان زئی مہدوی متوطن بلدہ ایلچپور وفدوی نظام الملک آصف جاہ بہادر مدظلہ العالی بہ دوازدہم ربیع الاول سنہ 1240 مطابق سنہ 1234 فصلی بہ وقت یکپاس و چہار گھڑی باقی شب پنج شنبہ از عالم فانی بہ عالم جاودانی پیوستند (1824)

نواب نامدار خاں نے وفات پائی تو ان کے مزار پر یہ عبارت لکھوائی گئی:

اللہ باقی من کل فانی

نواب مستطاب معلّی الالقاب امارت وایالت پناہ فدوی نظام الملک آصف جاہ پشت پناہ نبرد آزمایان شیر افگن استظہار غازیان لشکر شکن، نیر اعظم سمائے فانی، رایت افراز جنود افغانی نواب محمد نامدار خان بہادر ولد نواب محمد صلابت خان بہادر بن نواب محمد اسماعیل خان بہادر پنی افغان سلیمان زئی مہدوی مسند آرائے بلدہ ایلچپور بتاریخ نہم ماہ محرم 1260ھ بوقت چاشت روز پنج شنبہ ازیں دار فانی بسوے عالم جاودانی متوجہ گردید (1844)

ان کتبوں سے ظاہر ہے کہ علاقہ برار میں معمولاً زبان فارسی ہی تحریر میں رائج تھی لیکن بعض وقت اردو کی رباعی بھی کتبوں پر لکھی جاتی تھی، اگر چہ برار میں تاریخ گو شعرا بھی موجود تھے، کتبے عموماً نثر فارسی میں لکھے جاتے تھے اور یہ روایت بعد تک بھی جاری رہی تھی۔

1- جرنیل:

نواب محمد نامدار خانجن کا اوپر ذکر آیا ہے۔ شاعر نواز اور خود بھی شاعر تھے۔ 2 کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جرنیل تخلص کرتے تھے، ایلچ پور میں 1205ھ (1790-91) میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ عاشق مزاج شخص تھے۔ تعمیرات اور شیر کے شکار کا ان کو شوق تھا۔ صاحب دیوان تھے۔ ان کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصیدے شہر آشوب وغیرہ مختلف اصناف میں کلام موجود ہے۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتے تھے، اردو کے کچھ شعر یہ ہیں:

یہ نہ معلوم تھا آخر کہ تو اس طورستی　　الفتیں غیر سے اور ہم سے کرے گا پرواز
دل کے تئیں لے گیا کس طرح اُچک کر تو نے　　صید لے جاتا ہے جس طرح جھپٹ کر شہباز
رکھتا ہوں ایک جان جو حاضر ہے آپ پاس　　منظور ہو تو لیجئے، تکرار مت کرو
دلبر کبھی تو ہم کو بھی ٹک یاد کی جیو　　چہرہ دکھا کے دل کو مرے شاد کی جیو

قابل توجہ بات یہ ہے کہ عموماً ردیفیں ان کی آسان اور مختصر ہوتی ہیں بلکہ بعض غزلیں تو غیر مردف بھی کہی ہیں۔ زبان پر قدامت کا اثر غالب ہے۔ اس کے باوجود کلام میں سلاست بھی ہے اور روانی بھی۔

2- جانباز:

منشی حشمت رائے نام تھا۔ نواب نامدار خاں کے جانبازوں میں سے تھے۔[3] اسی مناسبت سے اپنا تخلص جانباز مقرر کیا تھا، نواب کے محکمۂ انشا میں ملازم تھے، شاعر بھی تھے اور خوش نویس بھی۔ انھوں نے نواب کے دیوان کی کتابت بھی کی تھی چنانچہ اس کے آخر میں خود یہ قطعہ کہہ کر شامل کیا تھا۔

کہا جرنیل نے دیوان جس دم طبع عالی سے　　لکھا جانباز نے ہر حرف کو آبِ زلالی سے
بنا دیوان وہ جس کا ہر اک لفظ اور ہر مصرع　　منور کہکشاں سے، درّ مکنوں سے، لآلی سے
ہے تازہ فکر ہر یک اور ہر مضمون نادر ہے　　نہیں کم درد سے، سودا سے، نرگس سے، ہلالی سے
بموجب حکم حشمت رائے جانباز اس کے منشی نے　　لکھا پاکی حشمت، جاہ عالی، اپنے والی سے

نواب نامدار خان کے دیوان کی ترتیب کی تاریخ جانباز نے اس طرح کہی تھی۔

جب کہ دیوان جرنیل از انداز　　جگ میں سارے ہوا بلند آواز
سال تاریخ یوں کہو جانباز　　فکر جادو، خیال راز و نیاز

1237ھ (1822)

جانباز کا سب سے پرانا قطعہ تاریخ 1229ھ (1814) کا کہا ہوا ہے۔ اس کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اکبر شاہ ثانی کے ابتدائی زمانے میں شعر گوئی شروع کی ہوگی اور ان کی ولادت تیرہویں صدی ہجری کے آغاز یا اس سے پہلے کا واقعہ ہوگا۔ جانباز کی ایک غزل کے

دو شعر یہ ہیں۔

دل محبت میں تری جب سے لگایا ہم نے　　چین و آرام ذرا تک بھی نہ پایا ہم نے
خود بخود فاش ہوا ہائے رے جانباز آخر　　عشق کا راز بہت گو کہ چھپایا ہم نے

3-احسن:

شیخ شاہ محمد نام تھا۔ نواب صلابت خان کے ملازم تھے۔ غزل کے علاوہ دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ 21 بند پر مشتمل انھوں نے ایک شہر آشوب بھی لکھا تھا۔ اس کا ایک بند یہ ہے۔

اس تیرہویں صدی کا ذرا سنیے ماجرا　　یعنی عجب طرح کا جہاں پر ہے حادثا
اب کچھ فلک کا دور عجب طرح سے پھرا　　دیکھا نہ تھا کوئی نہ کبھو ہوویگا سنا
آئین التجا کا رہا کچھ، نہ انتہا

اس بارہویں صدی میں کہاتے تھے جو شریف　　اس تیرہویں میں پاجی ہوئے ان کے ہی حریف
طاقت ہی کیا جو بات سے ان سے ہووے خفیف　　جانیں ہیں اہل حرفہ نجیبوں کے تئیں کثیف
اور وہ ہی خود بزور بھلے آدمی، بجا

بارھویں تیرھویں صدی ہجری (اٹھارھویں انیسویں صدی عیسوی) کے تہذیبی اور معاشرتی حالات کے لیے احسن کا یہ شہر آشوب ایک اچھے ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

(ب) برہانپور

مولوی معین الدین ندوی نے شہر برہان پور کے ماضی کا تذکرہ ان لفظوں میں شروع کیا ہے:

''آج بھی جامع مسجد برہانپور کے فلک بوس مینارے سلاطین فاروقیہ کے عظیم الشان مقبرے، شاہنواز خان اور بیگم شجاع کے روضے، شاہی قلعے، اور محلات کے آثار، آہو خانہ کی عمارتیں، مہاراجا جے سنگھ کی چھتری، مہاراجا جسونت سنگھ کا محل، بے شمار مسجدیں، مقبرے، سرائیں، خانقاہیں، مدرسے اور عالی شان محلوں کی شکستہ عمارتیں زبانِ حال سے اس تاریخی شہر کے شاندار دور ماضی کی داستان سنا رہی ہیں''۔

اس میں شبہ نہیں کہ خاندیس کے فاروقی سلاطین نے بڑی دھوم دھام سے فرماں روائی کی تھی، زبان اردو کے نقطۂ نظر سے بھی ان کے علاقے کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی تھی۔ بہاء الدین باجن شیخ سعدی دکنی اور سعد اللہ گلشن وغیرہ کے نام اس سلسلہ میں بڑے فخر سے لیے جاتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس شہر پر بھی ادبار آیا اور ایسا آیا کہ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ تلاش جستجو کے بعد صرف ایک قابل توجہ نام مل سکا اور وہ بھی اس طرح کہ اس سے متعلق ہر قسم کے اختلافات موجود ہیں۔ وہ نام ہے میر شجاع الدین برہانپوری کا، ان کے بارے میں بھی حال یہ معلوم ہوا کہ جب اس لائق ہوئے تو ترک وطن کر کے حیدرآباد میں جا کر

رہنے لگے، وہیں ان کی قابلیت کے جوہر کھلے۔ نصیر الدین ہاشمی نے ان سے متعلق تحریر کیا ہے:

''مولوی حافظ شجاع الدین کے اجداد اکبری عہد میں ہندوستان آئے تھے، آپ کے والد مولانا میر کریم اللہ نے برہانپور میں آکر اقامت کرلی، یہاں کے سادات کے ایک خاندان شاہ ہاشم کی اولاد میں بیاہ کیا، میر شجاع الدین 1178ھ (1764-65) میں یہاں تولد ہوئے، ایک سال کے بعد ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مولوی شجاع الدین نے برہانپور میں اقامت کی، اور اس زمانے کے مشاہیر علما سے علم کی تکمیل کی، ان دنوں برہانپور میں اچھے اچھے قابل علما جمع ہو گئے تھے، تعلیم سے فارغ ہو کر حج و زیارت کے لیے تشریف لے گئے، اور 1211ھ (1796-97) میں حیدر آباد آکر اقامت کرلی، حضرت شاہ رفیع الدین قندھاری سے بیعت کی، موصوف نے خلافت بھی عطا کی، مولوی شجاع الدین نے اولاً جامع مسجد میں اقامت فرمائی، طلبہ کو درس دینے لگی، جب آپ کا شہرہ ہوا تو حیدر آباد کے امرا بھی حاضر ہونے لگے، جامع مسجد کے حجرے طلبہ کے لیے درست کیے گئے، 1245ھ (1829-30) کے بعد بھی یہ مدرسہ موجود تھا، مولانا صاحب تصنیف بھی تھے، آپ کی کئی کتابیں مشہور ہیں، 1256ھ میں آپ کا انتقال ہوا، مناقب شجاعیہ میں آپ کے مفصل حالات موجود ہیں''۔3

اس اقتباس میں برہانپور میں علما کے جمع ہونے کی بات صحیح نہیں معلوم ہوتی ہے، 1245ھ میں جب کہ حافظ شجاع الدین موجود تھے ان کے مدرسے کی موجودگی کا خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ ظاہر نہیں، ان کی کئی کتابوں کے مشہور ہونے کی بات بھی کچھ وزن نہیں رکھتی، اتنی بات صحیح ہے کہ انھوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔

(الف) کشف الخلاصہ - یہ فارسی کی ایک کتاب خلاصۃ الفقہ کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔4 مصنف اور کتاب کے نام کے علاوہ اس کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔5 ایک خیال یہ بھی ہے کہ مصنف کوئی قدیم شاعر تھا جس نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا، یہ بات آخری فصل میں شامل ان شعروں سے ظاہر ہے۔

تھا مصنف اس کا مرد اہلِ دل　　دل بحق مشغول، ظاہر آب وگل
باوجود اس کے کہ تھا عالی مقام　　نام اپنا نہیں لکھا وہ نیک نام

شروع کے اشعار یہ ہیں۔

سب ثنا ہے حضرت رحمٰن کو　　جان وعقل و دین دیا انسان کو
فضل سے اپنے ہمیں قرآن دیا　　اس سے امر ونہی سب روشن کیا
عقل دے کر فقہ سمجھایا ہمیں　　راہ وہ نیکی کی بتلایا ہمیں

یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔ 6 بعض مخطوطوں میں مصنف کا نام حافظ شمس الدین برہانپوری لکھا ہے، علی گڑھ کی آزاد لائبریری میں اس کتاب کا جو نسخہ ہے اس کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

''خلاصۂ احکام اسلام (کشف الخلاصہ) مصنف شجاع الدین اس کا آخری شعر یہ ہے۔

ختم پر گذرے ہے جو ہجرت سے سال　　کہہ دے یہ کشف الخلاصہ سے نکال

اسی لائبریری کے دوسرے نسخہ پر کتاب کا نام ''کتاب مسائل'' تحریر ہے، اس میں آخری شعر یہ ہے۔

ہے شجاع الدین حافظ کا کلام　　تم سنو سب اس خلاصہ کو تمام'' 7

(ب) تفسیر پارۂ عم یتساءلون:

''یہ مذکورہ مصنف کی دوسری کتاب ہے، اس کے شروع کی عبارت اس طرح ہے:

جب پیغمبر ﷺ مکے میں آشکارا لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے لگے۔ سب کافر تعجب سے آپس میں پوچھنے لگے کہ یہ نیا دین اور قرآن کیا ہے؟ کسی نے کہا شعر ہے، کسی نے کہا سحر ہے، کسی نے کہا اگلے قصے ہیں، حق تعالیٰ نے ان کے حال سے پیغمبر ﷺ کو خبردار کیا کہ عم یتساءلون کس چیز سے آپس میں ایک کو ایک پوچھتے ہیں کافر؟ پھر آپ نے فرمایا.....'' 8

خاتمہ کی عبارت یہ ہے:

''وہ شیطان ہیں، حق تعالیٰ سب مؤمنوں کو شیطانوں کے وسوسے سے اپنی پناہ میں رکھے، بحق محمد

وآل محمد صلی اللہ تعالیٰ وسلم تسلیما تفسیر حسینی میں لکھے ہیں کہ حق تعالیٰ نے قرآن شریف کو شروع کیا 'ب' سے اور ختم کیا 'س' پر یعنی بس ہے، مؤمنوں کو جو کچھ کہ اس میں ہے یہ تاریخ سلخ ماہ رجب المرجب 1247ھ (1831-32) تمام شد"۔

اس نسخہ کا ترقیمہ یہ ہے:

"تمت تمام شد تفسیر حضرت مولانا میر شجاع الدین بتاریخ ہشتم محرم الحرام 1257ھ بروز چہار شنبہ یکپاس روز برآمد بود تحریر یافت بخط فقیر حقیر محمد عرف کالے خاں ساکن بلدۂ فرخندہ بنیاد برائے خود قلمی نمود"۔

اس کتاب کا ایک مجہول الحال نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے کتب خانہ میں بھی ہے، اس کے تعارف میں لکھا ہے:

"یہ قرآن پاک کے آخری یعنی تیسویں پارے کی تفسیر ہے، انداز تحریر اور ترکیب الفاظ سے یہ تفسیر تیرہویں صدی (ہجری) کے آغاز کی معلوم ہوتی ہے، اور اس کا مصنف غالباً دکنی ہے، اس تفسیر کا آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے:

جب پیغمبر ﷺ مکہ میں آشکارا ہو کر لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے لگے، سب کافر تعجب سے آپس میں پوچھنے لگے کہ یہ نیا دین اور قرآن کیا ہے؟ کسی نے کہا سحر ہے، کسی نے کہا شعر ہے، کسی نے کہا اگلے قصے ہیں،

اس تفسیر کا اختتام ذیل کے کلمات پر ہوا ہے:

"تفسیر حسینی میں حق تعالیٰ نے قرآن شریف کو شروع کیا 'ب' سے اور ختم کیا 'س' پر یعنی 'بس' تمت تمام شد"۔[9]

ان دونوں کتابوں سے ظاہر ہے کہ حافظ شجاع الدین اردو نظم اور نثر دونوں کے لکھنے پر قادر تھے، بے شک ان کی تحریروں میں بعض لفظ مقامی لب ولہجہ میں ڈھلے ہوئے اور کچھ مقامی الفاظ بھی آئے ہیں۔ ان کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو ان کی زبان خاصی حد تک صاف ستھری اور رواں ہے۔

حافظ شجاع الدین کی کسی تیسری تحریر کا حال فی الوقت راقم کے علم میں نہیں ہے، لیکن اس کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حافظ شجاع الدین کی ابتدائی عمر برہانپور میں گذری تھی۔ اس

لیے حیدرآباد میں قیام کے باوجود ان کی زبان اور طرز بیان پر برہان پور کی بول چال کے اثرات غالب تھے، اور یہی ان کی کتابوں کے اس مقام پر ذکر کے لیے جواز ہے۔

تلاش کے باوجود تا حال راقم کو برہانپور کے عہد اکبر شاہی کے کسی اور صاحب قلم کا حال معلوم نہیں ہو سکا ہے، بظاہر اس شہر میں اس زمانے میں اردو نثر و نظم کے فروغ کے لیے ماحول سازگار نہیں تھا۔

(3) بھوپال

نواب دوست محمد خاں نے بھوپال میں الگ خودمختار ریاست قائم کی تھی۔ ریاست کی توسیع اور استحکام کے لیے ضروری تھا کہ وہاں مؤرخوں اور مصنفوں کے بجائے سپاہی پیشہ اور جنگجو اشخاص کا اجتماع ہو۔ انگریزی حکومت کے روز افزوں اقتدار کو دیکھ کر نواب بھوپال نے ان سے معاہدہ کر کے اپنی ریاست کو مختلف النوع خطرات و خدشات سے گویا مامون کر لیا تھا۔ تاریخ بھوپال میں سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ متواتر تین پشتوں تک عنان حکومت بیگمات ہی کے ہاتھوں میں رہی۔ ان بیگمات نے اپنے زمانے میں بھوپال کی تاریخ لکھنے کا کام بھی کیا۔ ان کی علمی مصروفیتوں کا فائدہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ بھوپال ہر قسم کے علوم و فنون کا مرکز بن گیا، بھوپال کی پہلی رئیسہ نواب سکندر بیگم کے حالات میں یہ بات خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ انھوں نے عورت ہونے کے باوجود اپنی ریاست کا دورہ کیا تھا۔

1 - دولھا:

نواب جہانگیر محمد خان نام اور نظیر الدولہ لقب تھا۔ نواب سکندر بیگم کے شوہر تھے۔ لیکن بیگم سے موافقت نہیں ہو سکی۔ صرف 26 برس کی عمر پا کر 1260ھ (1844) میں رحلت کی، مرزا قادر بخش صابر نے ان کی وفات کے سبب کی طرف بھی اشارہ کیا ہے لکھا ہے:

''دولھا تخلص، مظہر الدولہ نواب جہانگیر محمد خان خلف میاں امیر محمد خان والی بھوپال، جوان اقبال مند، رستم توان، حاتم سخا، از بسکہ طبع موزوں اور فکر نکتہ پسند رکھتا تھا، قدر شناسی کمال سے شعرائے بلند سخن صلہ ہائے نمایاں سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ گاہ گاہ بزم مشاعرہ اس کے در دولت پر آراستہ ہوتی تھی۔ اتفاقاً عین ایام شباب میں اپنی کدبانوے دل پسند کی تزویر و کید سے کوس رحلت کو بلند صدا کیا، سچ ہے زنان حیلہ ساز کے ہاتھ سے مردان صاف طینت نے زہر مہمات چکھا ہے''۔

اس اقتباس میں ان کا لقب مظہر الدولہ آیا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔

نواب جہانگیر محمد خان کا پندرہ برس کی عمر میں سکندر جہاں بیگم کے ساتھ 18 رذی الحجہ 1250ھ مطابق 18 راپریل 1833 کو نکاح ہوا۔ کوئی تین برس بعد غرہ رمضان 1253ھ مطابق 30 رنومبر 1837 کو وہ مسند نشیں ہوئے، اور چھبیس برس کی عمر میں رحلت کر گئے۔ مرنے سے پیشتر انھوں نے نواب سکندر جہاں بیگم کے نام ایک خط میں لکھ دیا تھا کہ:

''ریاست مارا از نسبت آں صاحبہ رسیدہ است، الحال حال ما تباہ است لہٰذا ریاست بھوپال برادر عوض مہر آں صاحبہ دادم، آئندہ شما مالک اند، ہر کہ را خواہید بعد ما بر مسند قرار نمائید''۔

لالا سری رام نے ان کے کلام کے بارے میں لکھا ہے:

''ان کے کلام میں جو ان کی صاحبزادی (شاہ جہاں بیگم) نے 1288ھ (1871) میں اپنے دیوان کے ساتھ چھپوا کر مشتہر کر دیا ہے، عاشقانہ اور معاملہ بندی کے مضامین کثرت سے ہیں اور ان سے ان کے دلی موز و گداز کی جھلک آشکارا ہے، جو کچھ قلب پر گذرتی تھی بیشتر وہی نظم کر دیتے تھے، کلام با مزا اور پُر لطف ہے، چھ جزو کا دیوان ہے''۔5

لیکن ڈاکٹر محمد نعمان نے لکھا ہے کہ:

''نواب دولھا کا کلام دو مختلف مطابع سے دیوان جہانگیری اور دیوان دولھا کے نام سے شائع ہوا۔ پہلا 10 رشعبان 1280ھ کو بھوپال سے اور دوسرا کانپور سے

1288 ہجری میں چھپا تھا"۔6

کلام کا نمونہ یہ ہے:

عبث ہے ساتھ پھرنا غیر کے اس شاہ خوباں کا　　گدا کا ہرزہ گردی ہے ہنر اور عیب سلطاں کا
تیری خاطر پاؤں ان لوگوں کے اب پڑتے ہیں ہم　　جن پر ٹھوکر مارنے سے ہم کو ننگ و عار تھا
اس کے آنے کی نہ ٹھہری سو طرح غم کھا چکے　　جان بھی جائے کہیں قصہ مٹے جھگڑا چکے
آشنا ظاہر میں اور باطن میں بیگانہ صفت　　تم نے در پردہ جلا کر خاک کر ڈالا مجھے

ان کی وفات کے بعد کے معاملات کا بیان کرتے ہوئے نواب سلطان جہاں بیگم نے تحریر کیا ہے:

"بعد انتقال نواب جہانگیر محمد خاں کے سرکار خلد مکاں (سکندر بیگم) جب صدر نشیں ہوئی تھیں تو بہ وجہ ان کی کم سنی کے میاں فوجدار محمد خان نائب الریاست مقرر ہوئے تھے۔ وہ دو سال تک خود مختاری کے ساتھ کام کرتے رہے"۔ جیسا کہ نواب دولھا کے کلام سے بھی ظاہر ہے کہ نواب سکندر بیگم آزاد خیال خاتون تھیں۔ خود بھی صاحب قلم تھیں اور ارباب شعر و سخن کی قدر شناس تھیں۔ ان کے زمانے میں مختلف مراکز سے علما اور شعرا آ آ کر بھوپال میں سکونت پذیر ہونے لگے تھے۔ ان میں بعض یہ ہیں"۔7

2- اخگر

اخگر کے حالات میں ڈپٹی عبدالغفور خان نساخ نے لکھا ہے:

"اخگر تخلص، حکیم اصغر حسین فرخ آبادی ولد منشی غلام غوث وکیل، ملازم نواب سکندر بیگم فرمانروائے بھوپال"۔8

نساخ نے ان کا صرف ایک شعر نمونہ کے طور پر لکھا ہے۔

نہ پڑھا اس نے کبھی مثل خطِ پیشانی　　نامۂ شوق کو تحریر مقدر جانا

3- رویت

ان کا حال بھی نساخ ہی کے تذکرے میں مندرج ہے لکھا ہے:

"رویت تخلص، مولوی حبیب احمد خلف و شاگرد حضرت شاہ رؤوف احمد رافت، تال

بھوپال میں رہتے تھے، شعران کے شیریں و نمکین ہوتے ہیں۔ اشعار عربی و فارسی بھی
خوب کہتے تھے۔ عروض و قوافی میں کمال تھا، شروع جوانی میں انتقال کیا"۔9

ان کے دو شعر نساخ نے اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں۔

کسی پری کی ہے زلف دوتا سے جا الجھا　　یہ دل بلا ہے کہ ایسی بلا سے جا الجھا
کیا غضب ہے مل کے بیٹھوں تو کہیں دور ہو　　اور اگر ہوں دور تو کہتا ہے کیوں مغرور ہو

رویت کی زبان صاف ستھری اور رواں تھی۔ وہ قادر الکلام شاعر معلوم ہوتے ہیں، مشکل ردیفوں اور سنگلاخ زمینوں میں بھی آسانی سے غزل کہہ لیتے تھے۔

مختلف مقامات سے آکر جن شاعروں نے بھوپال میں اقامت اختیار کی تھی ان میں سے بعض نے غزل کے علاوہ دوسری مختلف اصناف میں بھی طبع آزمائی کی تھی، ان میں سے کچھ شاعروں کا ذکر اس طرح آیا ہے:

4-مقدور

محسن کے تذکرے میں مقدور کا ذکر اس طرح سے آیا ہے:

"میر محمد ابراہیم مقدور شاعر نامی چینا پٹن مدراس وہاں کے باشندے ان کو ملک الشعرا جانتے ہیں۔ یہ چھٹے رسالہ انگریزی میں نوکر تھے، ترک روزگار کر کے خانہ نشیں ہوئے۔ شاگرد اور مرید حضرت شمیم اللہ شاہ صاحب قادری کے جو معروف بہ برہنہ شمشیر تھے۔ رہنے والے نتھر نگر کے، ایک مثنوی بھوپال تال کی تعریف میں خوب کہی۔"10

ظاہراً انھوں نے بھوپال تال کو دیکھا تھا اور اس شہر میں کچھ وقت گذارا تھا، بھوپال تال سے متعلق مثنوی کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ ان کی غزل کا ایک شعر یہ ہے۔

نازک ادائی تو دیکھو گدگدی سے ہنس دیے　　بوسے کو میرے لبوں نے جب کیا آہنگِ پا

رفتہ رفتہ بھوپال میں شعر و سخن کا رواج زیادہ ہوا۔ وہاں کے شاعروں کو دہلی لکھنؤ وغیرہ کے اساتذہ سے بھی کسب فیض کا شوق ہوا اور یہ صورت اس امر کی غماز ہے کہ بھوپال کے شاعر خوشحالی میں بسر کر رہے تھے۔

5-مسکین

یہ نسبتاً پرانے شاعر تھے۔ شیفتہ نے ان کے بارے میں تحریر کیا ہے:

''مسکین تخلص، سید عبدالواحد خان، جوانے حریف وظریف است، ہنگام ورود دہلی کہ می گفت بر مومن خاں می خوانند ونیز با فقیر ربطے پیدا کردہ بود، اکنوں بہ اندور بسر می برد''۔11

معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے حلقوں میں ان کو شہرت نہیں ملی تھی۔ چنانچہ محسن نے ان کے بارے میں مختصراً اتنا لکھا ہے:

''سید عبدالواحد خان مسکین، باشندہ بھوپال، صاحب دیوان، اور کچھ حال معلوم نہ ہوا''۔12

البتہ ممتاز علی بھوپالی نے ان کے بارے میں مفید اطلاعات فراہم کی ہیں:

''مسکین تخلص، شیخ عبدالواحد خان صاحب مرحوم اکبرآبادی، نواب دولھا جہانگیر محمد خان صاحب بہادر کے مصاحب تھے، 1271ھ (1854-55) میں ان کا انتقال ہوا۔ تکیہ دلاور شاہ واقع سواد بھوپال میں دفن ہوئے۔ ان کے فرزند عبدالعلی خان تونگر تخلص میر منشی ریاست ہو کر خارج کیے گئے۔ ان کی تالیف وتصنیف سے دیوان مسکین ومثنوی چشمۂ شیریں یادگار ہیں۔ فارسی کمتر اردو بیشتر دیکھنے میں آئی''۔

ان کی مثنوی کے بارے میں مزید کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی۔ انھوں نے حافظ شیراز کی ایک غزل کی تخمیس کی تھی، اس کے دو بند یہ ہیں۔

ہے وہ بوٹا سا قد اس کا اور وہ تن — جس پہ غش شمشاد ہو اور نسترن
کیا کہوں اوصاف قد گل بدن — بنگرد دیگر بسرو اندر چمن
عاقبت روزے بیاجی کام را

کھا بہت مسکیں نہ تو رنج و تعب — گرد مثل ایام سے گھبرا نہ اب
کر عمل اس بیت پر اللہ ہے رب — صبر کن حافظ بہ سختی روز و شب
ہر کہ دید آں سرو بیم اندام را

ان کی دو غزلوں کے ایک ایک شعر یہ ہیں۔

لے گئی چھین کے دل ساقی سرشار کی آنکھ　　آ گئی دیکھ جسے نرگسِ بیمار کی آنکھ

کیوں نہ الھنا بیٹھنا مشکل ہو اس رنجور کا　　جس کو از خود رفتگی بھی اک سفر ہے دور کا

یہ کلام شاہد ہے کہ مسکین کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے۔ کلام پر ان کے آقا کے حالات کا بھی کچھ پرتو معلوم ہوتا ہے۔

6-کرم

یہ بھی مسکین کی طرح جہاندیدہ شاعر تھا۔ ان کے حالات میں ممتاز علی بھوپالی نے اس طرح تحریر کیا ہے:

"کرم تخلص، منشی غلام ضامن صاحب مرحوم خلف الرشید منشی غلام سبحانی عرف عبدالسبحان خاں صاحب، خال حقیقی مدار المہام محمد جمال الدین خان صاحب مرحوم، ابتدائے آغاز جوانی سے تا بست وفت سال سرکار نظام الملک حیدر آباد دکن میں بہ ماہوار پانصد روپیہ ملازم رہے، بعدہ بھوپال میں آکر عہدہ ہائے جلیل پر ممتاز رہے، دواوین ان کے زمانہ غدر ہند میں تلف ہو گیے، چند اوراق منتشر سے یہ دو غزلیں ان کی نقل کرتا ہوں، شعر وسخن میں مرزا لطف علی خان لطف دہلوی کے شاگرد تھے، تاریخ سیزدہم شہر شعبان المعظم 1265ھ (1849) کو ان کا انتقال ہوا"۔

ان کے کلام کا انداز ان شعروں سے ظاہر ہے۔

دہن کا اس کے ہر سو نہ ہو بیاں پیدا　　برنگِ غنچہ اگر ہووے سو زباں پیدا

کہیں ہیں دیکھ کے میری غزل کے شعر بلند　　اسی زمین سے ہوتا ہے آسماں پیدا

کرم کو جان غنیمت بقول حضرت لطف　　کہ ایسے گمشدہ ہوتے ہیں پھر کہاں پیدا

7-واصل:

یہ بھی نواب دولھا کے خاص لوگوں میں سے تھے، ممتاز علی بھوپالی کے تذکرے میں ہے:

"واصل تخلص، سید واصل علی صاحب ابن قاضی میر قطب علی مرحوم قاضی زادگان شاہ علی پور سے تھے، زمانہ ریاست نواب جہانگیر محمد خان بہادر نواب دولھا میں مشیر خاص

اور ملازمانِ بالا خصاص سے تھے، خطوط نسخ و نستعلیق و شکستہ و گلزار وغیرہ کے ماہر، کلام فارسی و اردو کے شاعر تھے، مقام راج گڑھ میں مختار کل ریاست ہو کر چند سال گرما گرمی سے اس عہدہ کو انجام دیا اور وہیں انتقال کیا"۔

تذکرہ نویس نے ان کا اردو کا کوئی شعر نقل نہیں کیا ہے۔

نواب دولھا کے عہد کے شاعروں کے کلام پر عموماً سوز و گداز بلکہ درد و یاس کی کیفیت چھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ طرز بیان سلیس اور عام فہم ہے اور زبان معمولاً صاف ستھری اور بول چال کے مطابق ہوتی ہے۔ اس زمانے کے شاعروں نے غزل کے علاوہ تقریباً سبھی مروجہ اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔

نثر

اکبر شاہ ثانی کے زمانہ سلطنت میں بھوپال میں شعر وسخن کے ساتھ ساتھ کم وبیش نثر کی طرف بھی توجہ کی جارہی تھی۔

احمد یار خان:

نواب دولھا کے متوسلین میں سے تھے، انھوں نے مذہبی موضوعات سے متعلق اردو میں ایک سے زیادہ رسالے لکھے تھے:

(الف) رسالہ مولود مسعود (16): یہ رسالہ حضرت رسول اکرم ﷺ کے میلاد مبارک سے متعلق ہے، اس کے نسخۂ رامپور کی کتابت 1246ھ (1830) میں ہوئی تھی، زمانہ تصنیف یقینی طور پر اس سے پہلے ہوگا، یہ کل اکتالیس ورق کا رسالہ ہے ہر صفحہ پر صرف بارہ سطریں ہیں۔

آغاز:

> ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، حمد اور شکر اس ذات واجب الوجوب کو لائق ہے جس نے سب سے پہلے نور محمدی ﷺ کو نور احدیت سے پیدا کیا اور ذات مطلق کو اس نور سے ہویدا اور اسی نور سے تمام عالم کو عالم ظہور میں لایا''۔

خاتمہ:

''اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو توفیق خیر کی دے خصوصاً اس رسالے کو جمع کرنے والے احمد یار خان گنہگار کو اور سب لوگوں کو جو اس مجلس متبرک میں بہ سبب تعظیم و تکریم علیہ الصلاۃ والسلام کے حاضر ہوئے ہیں، محبت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی اور ان کی آل واصحاب کی اور اہل بیت کی دیوے اور مرادیں دینی و دنیوی حاصل کرے، آمین یارب العالمین وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین''۔

یہ رسالہ مولود شریف جدید کے نام سے کانپور میں 1296ھ (1869) میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔

(ب) ذکر الشہادتین:

احمد یار خان کی تالیفات میں سے ایک یہ رسالہ بھی ہے۔ یہ بھی کانپور سے 1883 میں چھپ کر شائع ہو گیا تھا۔ اس کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔

(4) جبل پور

جبل پور صوبۂ متوسط کے اہم مقامات میں سے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سرکار کمپنی بہادر کے زمانے میں بھی انتظامیہ کے نقطۂ نظر سے اس کو اہمیت حاصل تھی۔ سرکار کمپنی نے وہاں ایک بڑی جیل بنوائی تھی۔ جس کا نگراں جنرل سپرنٹنڈنٹ جیل ہوتا تھا۔ وہاں زیادہ زور ٹھگوں کی بیخ کنی پر دیا جارہا تھا۔

علی اکبر نامی ایک شخص جبل پور کے محکمہ جیل میں سررشتہ دار تھے۔ انھوں نے ایک کتاب ''مصطلحات ٹھگی'' کے نام سے لکھی تھی۔ اس کے قلمی نسخہ کی ضخامت ایک سو پینتالیس صفحات کی تھی، اور ہر صفحہ پر بارہ سطریں ہیں، جناب نصیر الدین ہاشمی نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

> ''جیسا کہ کتاب کے نام سے واضح ہے اس میں ٹھگوں کی اصطلاحات قلمبند ہوئی ہیں، مؤلف کی صراحت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیپٹن ولیم ہنری سلیمن جو ٹھگوں کی بیخ کنی میں نام حاصل کر چکا تھا، 1830 (1245-46ھ) میں جبلپور میں متعین ہوا تھا، اس نے سینکڑوں ٹھگوں کو گرفتار کر کے سزا دلائی تھی، مصنف اس کیپٹن کے پاس متعین تھا، اور کرنل طامس پائرس جو جنرل سپرنٹنڈنٹ تھا، اس کی خواہش سے اس نے یہ کتاب مرتب کی تھی''۔1

کتاب ان جملوں سے شروع ہوئی ہے:

''حمد وسپاس زیادہ اندازہ شرح وبیان ذی جان سے جناب خلاق بیچہ ہ ہزار عالم کو زیبا ہے، کہ جس نے اپنی قدرت کاملہ وحکمت بالغہ سے انسان.....بنیان کو بہ طبائع متضادہ پیدا کیا اور لغات مختلفہ واصطلاحات جداگانہ سے گویا اور درود وسلام افزوں طاقت لسان جن وانسان سے برگزیدہ اور درود حضرت رسول مختار کو بجا ہے.....''

اور خاتمہ کے الفاظ اس طرح ہیں:

''اور ان امید یداروں کو بحد واردات کے حسب توفیق کچھ زیادہ دیتے ہیں''۔

کتاب اردو میں ہے لیکن اعراب بھی لگائے گئے ہیں، غالباً انگریز جنرل کی آسانی کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اصطلاحات کی توضیح کا نمونہ یہ ہے:

''بگڑا۔ ٹھگی ٹھگ بنس یعنی رمال کو کہتے ہیں''۔

یہ کتاب چھپ چکی ہے، چنانچہ قاموس الکتاب اردو میں ہے۔

مرزا محمد علی اکبر آبادی.....مصطلحات ٹھگی

کلکتہ: ولیم ہنری سلیمن

طاس بلاک لیتھوگرافک چھاپہ خانہ

کیفیت: ٹھگوں کی زبان اور ان کی مخصوص اصطلاحات

مصنف کا صحیح نام یہی معلوم ہوتا ہے، مخطوطہ میں جو ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یہ مصنف اکبر آباد کا رہنے والا بہ سلسلہ ملازمت جبلپور میں مقیم ہوگا۔ اس کی کتاب کی زبان صاف ہے اور شمالی ہند کے روزمرہ کے مطابق ہے۔

افسوس ہے کہ جبلپور میں اس زمانے کی کسی ادبی تحریر کا پتہ نہیں چل سکا ہے۔

(5) ناگپور

1- غمگین

اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں ناگپور کے علاقے میں ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے اوّلین شاعر کی حیثیت سے غلام رسول غمگین کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلے میں ضمناً انھوں نے عمادالدین احمد زیب کا بھی تذکرہ کیا ہے جو غمگین کے استاد تھے۔

1- شاعری میں وہ مولانا عمادالدین احمد زیب سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ غمگین نے ان کے انتقال پر ستاون شعروں پر مشتمل جو قطعہ تاریخ کہا ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ زیب کو صَرف، نحو، منطق، معانی، حکمت، فقہ، تفسیر، حدیث، احوال کلام، تجوید، طب اور حساب جیسے دقیق علوم پر پوری قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے بروز اتوار ستائیس ذی قعدہ 1247ھ (1832) کو رحلت فرمائی، قطعہ کے آخری دو شعر یہ ہیں۔

بہر تاریخ رحلتش وی شب فکری ساختم کہ ہاتف S رب
داد آواز غیب کاے ای غمگین فایز خلد شہ عماد الدین

1247ھ (1831-32)

اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں زیب ناگپور کے علاقے میں کہن سال مشاق استاد کی حیثیت

سے فارسی (اور بہ گمان غالب اردو) شاعری کی ترویج وتوسیع کے کام میں مصروف تھے۔

زیب کی طرح ان کے شاگرد غمگین کے حالات بھی کچھ معلوم نہیں سوائے اس کے کہ ان کی اردو فارسی اور عربی کی نظم ونثر کا ایک مجموعہ مہمات فیض آیات دستیاب ہے اور اسی مجموعہ سے ان کے بعض حالات کا علم حاصل ہو جاتا ہے، اس مجموعہ میں اِن کا ایک قطعہ 1233ھ (1815) کا ہے:

تاریخ (2) رحلت حضرت شاہ حسین قدس اللہ سرہ

آہ شیخ المشائخ کہار گشت موصول بارگاہ کریم
گفت تاریخ رحلتش غمگین شد حسین شاہ در منام نعیم

1233ھ

اس کے چند سال بعد کا ایک اور قطعہ یہ ہے،

تاریخ چاہ حسن باغ ناگپور

زہے شرف النساء کو از پے اجر بکند انید ایں چاہ صفا را
چناں تاریخ او بنوشت غمگین عجائب چشمہ شیریں دل آرا

1240ھ (1834-35)

ان قطعات سے پتہ چلتا ہے کہ غمگین اچھی تاریخیں کہہ لینے پر قادر تھے۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے غمگین کی اس دور کی اردو غزل کا کوئی نمونہ نقل نہیں کیا ہے۔ اس لیے اس بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔

2۔ حشمت

امیر مینائی نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''حشمت محمد ناصر خان ولد محمد یوسف خان مرد عالم تھے (3) اخوند زادے عبدالاحد خان سے ناگپور میں کتب درسیہ پڑھیں، شعر فارسی کا شوق ہوا۔ سید رفیع الدرجات نزہت کے شاگرد ہوئے، ناگپور میں رسالدار تھے، ستر برس کی عمر ہوئی، بارہ سو ساٹھ ہجری میں قضا کی، یہ ان کا شعر ہے۔

چو گفتم راز خود حشمت وفرمود چرا ایں رسم سرگوشی بر آمد

امیر نے ان کا اردو کا کوئی شعر نقل نہیں کیا ہے۔

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں ناگپور کے علاقے میں اردو شاعری کا کچھ زیادہ رواج معلوم نہیں ہوتا ہے۔ ذاتی شوق سے بعض لوگ جو کچھ کہہ لیتے تھے وہی کچھ تھا اسی سے زمانۂ آئندہ میں اس علاقے میں اردو شعر و ادب کی آبیاری ہوئی۔

حواشی

1-برار

1-برار کی علمی وتمدنی تاریخ — ص42ت47

2-ایضاً — ص100ت156

3-ایضاً — ص156ت157

4-ایضاً — ص152ت153

2-برہانپور

1-برہانپور — ص11

2-ایضاً — ص13ت14

3-آصفیہ جلد2 — ص36ت37

4-مخطوطات اردو گنج بخش — ص51ت52

5-اردو مخطوطات انجمن جلد2 — ص78ت81

6-قاموس الکتب جلد1 — ص257

7-اردو مخطوطات علی گڑھ — ص160

8-آصفیہ جلد2 — ص36ت37

9-اردو مخطوطات انجمن جلد2 — ص19ت20

3-بھوپال

1-تزک سلطانی — ص6ت9

2-گلستان سخن جلد1 ص439
3-بھوپال ص32
4-ایضاً ص36
5-خمخانہ جلد3 ص214تا215
6-بھوپال ص33
7-تزک سلطانی ص18
8-سخن شعرا ص19
9-ایضاً ص197
10-سراپا سخن ص381
11-گلشن بے خار ص176
12-سراپا سخن ص69
13-آثار الشعرا ص204
14-ایضاً ص190
15-ایضاً ص226
16-جائزۂ مخطوطات جلد1 ص198تا201

4-جبل پور

1-آصفیہ جلد1 ص361تا362
2-قاموس جلد3 ص690

5-ناگپور

1-ناگپور میں اردو ص24
2-ایضاً ص27
3-انتخاب یادگار ص117

(7) گجرات

گجرات کی زبان اور شاعری 313

(1) احمد آباد 317

1-باقر— باقر علی بخاری 317

2-وحید— شیخ وحید الدین 318

(2) بڑودہ 319

1-نصیری— نواب میر امین الدین حسین 319

2-شیدا— خواجہ سعید 320

(3) بھڑوچ 323

1-صاحب— نواب مرزا محمد بیگ 323

2-ضاحک— مرزا احید الدین 323

3-ذاکر— سید محمود 324

4-عباس— سید عباس علی 325

(4) سچین 327

1-کریم— نواب عبدالکریم خان 327

2-محب— نواب محمد ابراہیم خان 327

3-اخلاص— عبدالرحمٰن خان 328

4-فرحت— سید و میاں 329

5-غمگین— منشی فرید بخش 330

6-غنی— خواجہ ابراہیم 331

(5)سورت 333
1-احمد—میاں جان 333
2-قطب —ملاقطب الدین 335
3-اختر—احمد علی 336
4-بخشش—شیخ احمد عرف بخشو میاں 336
5-لطیف—میر شمس الدین 339
6-شمس—حکیم شمس الدین 339
(6)کھمبایت 341
1-کاظم محمد کاظم 341
2-احمد سید احمد نوراللہ 342
حواشی 343

گجرات کی زبان اور شاعری

گجرات کا قدیمی نام ''گوجر راشٹر'' یعنی گوجروں کی مملکت بتایا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہی گوجر بعد میں ''گُجر'' ہو کر راجپوت کہلائے۔ اِس علاقے میں سمندری راستے سے زمانۂ قدیم سے عربوں کی آمد و رفت تھی۔ یہاں کے ہندو راجا ہر طرح سے ان کی دل جوئی کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عربوں کی خوشنودی اور اُن کی دعائیں اِن راجاؤں کی درازیٔ عمر کا سبب تھیں۔

سلطان شمس الدین التمش کے عہد کے ایک عالم نور الدین محمد عوفی نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جو مختصراً اِس طرح ہے:

> ''کھمبائت میں بہت سے سُنّی مسلمان رہتے تھے، ان کی مسجد کے پاس ایک مینار بھی تھا جس پر چڑھ کر مؤذّن اذان دیتا تھا، پارسیوں کی تحریک سے ہندوؤں نے حملہ کر کے اس مینار کو توڑ دیا، مسجد کو جلا دیا اور اَسّی مسلمانوں کو شہید کر دیا، مسجد کا خطیب قطب علی خان جان بچا کر اُٹھلو اڑھیسو نچا اور جنگل میں راجا کی رہ گزر پر بیٹھ کر اس کا منتظر رہا، جب راجا کی سواری پہنچی تو قطب علی نے اسے روک کر ایک نظم جو ہندی (قدیم اردو زبان) میں تھی اور جس میں تمام واقعہ لکھا تھا راجا کو دیدی، راجا نے قطب علی کی شکایتوں کی خود تحقیق کی، اور حکم دیا کہ غیر مسلموں میں سے دو دو آدمیوں کو سزا دی

جائے، ایک لاکھ چاندی کے سکّوں سے وہ مسجد اور مینار تیار کی جائے، اس کے علاوہ
راجا نے (قطب علی کو) چار پارچہ کا خلعت بھی عطا کیا"۔1

گجرات اور پورب دیس کے مابین بھی اچھے روابط تھے، پورب دیس (ہند) میں بھی اکثر صوفیا نسلاً عرب تھے۔ دونوں علاقوں کے ہندوؤں کو گنگا کا پانی مربوط رکھتا تھا، البیرونی نے سوم ناتھ کی عبادتوں کے سلسلے میں لکھا ہے:

"اس کے پاس ہر روز ایک گھڑا گنگا کا پانی لایا جاتا تھا، اس کی نسبت ان کا یہ اعتقاد تھا،
کہ وہ پرانی بیماریوں سے شفا دیتا ہے"۔2

دونوں علاقوں کی پیداوار میں بھی ایک حد تک یکسانی موجود ہے، ان حالات میں قطب علی کی زبان ہندی کے لیے کوئی تاویل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

زبان ہندی کے قدیم معروف شاعروں میں بہاء الدین باجن خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اُنھوں نے اپنی تصنیف "خزائنِ رحمۃ اللہ" میں مختلف بزرگوں کے علاوہ خود اپنا کلام بھی نقل کیا ہے۔ حافظ محمود خاں شیرانی نے ان کا جو کلام نقل کیا ہے اس کی کیفیت خود ان کے لفظوں میں یہ ہے:

"یہ اشعار میں نے ایک ایسے نسخے سے لیے ہیں جو سخت غلط ہے اور بارھویں صدی (ہجری) کے خاتمے کے قریب لکھا گیا ہوگا۔"

اِس سخت غلط اور مجہول الحال نسخے کے مندرجات کی بنا پر باجن کے کلام کے بارے میں کوئی حکم لگانا بھی سخت غلط ہوگا۔ ڈاکٹر شیخ فرید برہانپوری نے خزائن رحمت کے دو نسخوں کا بہ غور مطالعہ کرنے کے بعد راقم کو مطلع کیا تھا کہ اس کتاب میں ہر جگہ جہاں نسخۂ شیرانی میں دہلوی ہے لفظ "ہندی" آیا ہے، اِس طرح:

در صفت دنیا ایں درویش بہ زبانِ ہندی گفتہ است

پہلی نظم۔

گجری ع — یہ فتنی کیا کتے ملتی ہے الخ

اور دوسری نظم۔

ہمیں مضمون بہ زبانِ ہندی گفتہ شدہ است

ع جب راوت جاؤنہہ جھوجھیں

بہاءالدین باجن کی ایک نظم مولوی عبدالحق نے اس تمہید کے ساتھ نقل کی ہے:

''اس زمانے میں جو ملکِ ہند کی طرزِ زبان تھی اِسی طور پر کلماتِ شعر بہ مضمونِ تصوّف کبھی کبھی موزوں فرماتے تھے، ازاں جملہ یہ ہے،

پردہ پوربی میں ع یوں باجن باجی رے''4

ان اقتباسات سے بخوبی ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں گجرات میں بھی وہاں کے لوگ اپنی بول چال کی زبان کو ہندی یا ہندوی کہتے تھے۔ البتہ مقامی الفاظ بلکہ بعض مخصوص نظموں کو بھی وہ گجروی کا نام دے دیتے تھے۔

زبان اردو کی تاریخ میں کسی ایک فرد کی منظومات کا جو قدیم ترین مجموعہ دستیاب ہوا ہے اُس کے مصنف شاہ علی محمد جیو گامدھنی (گجراتی) متوفی 973ھ (1565-66) تھے۔ اس مجموعہ کو ان کی زندگی میں ان کے ایک مرید نے مرتب کر کے اس کا نام ''جواہر اسرار اللہ'' رکھا تھا۔ اس مجموعہ (دیوان) کے دیباچہ کا خلاصہ اس طرح ہے:

''میگوید بندہ فقیر حقیر شیخ حبیب اللہ ابن عبدالرحمٰن قریشی الاحمدی کہ چند مکاشفاتِ حضرت شاہ علی جیو معشوق اللہ مدظلہٗ ابن شاہ ابراہیم ابن شاہ عمر الحسینی الاحمدی در بیان توحید و اسرار بہ الفاظ گوجردی بہ طریق نظم فرمودہ بود، دریں مختصر آوردہ وجمع کردہ و آں ملفوظات جواہر اسرار اللہ را بہ کتاب جواہر اسرار اللہ نام داشتہ''۔5

شاہ علی جیو کی ان منظومات میں قدرتی طور پر مقامی الفاظ ہی نہیں مروّجہ زبان ہندی کے الفاظ مقامی تلفظ اور لب ولہجہ کے ساتھ آئے ہیں اس لیے مرتب کا ان کو بہ الفاظ گوجروی کہنا واجبی تھا لیکن بطور مجموعی ان کی زبان وہی ہے جو باجن اور دوسرے شعرا کی تھی۔

عالمگیر اورنگ زیب کے زمانے میں ولی نے اردو شاعروں کو نیا رنگ ڈھنگ عطا کیا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے بارے میں تذکرہ نویسوں کے درمیان شدید اختلاف رہا ہے۔ بعضوں نے انھیں گجراتی اور بعض نے دکنی کہا ہے۔ قاضی نورالدین حسین فائق نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

''بہ راقم آثم از زبانی ثقات بلدۂ احمد آباد بہ ثبوت چناں پیوستہ کہ شاعرِ مزبور (ولی) از

بلدۂ مسطور بودہ وسالہا بہ دکھن ہم گذرانید"۔[8]

احمد شاہ بادشاہ کے آخر زمانے میں گردیزی اور میر نے اردو شاعروں کے تذکرے لکھے تھے۔ دونوں نے عبدالولی عزلت سورتی کی بیاض سے استفادہ کیا تھا اور عزلت ہی کے واسطے سے ان دونوں تذکروں کی وہ نقلیں تیار ہوئی تھیں جن کی بنیاد پر ان کے متون ہمارے زمانے میں شائع ہو کر مشتہر ہوئے ہیں۔

اہل گجرات نے زبان اردو کی جو خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا سلسلہ تادیر جاری رہا تھا البتہ ان کا اعتراف جیسا کہ چاہیے ہنوز نہیں کیا جا سکا ہے۔

اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں دوسرے صوبوں کی طرح گجرات کی بھی مرکزیت ختم ہو چکی تھی اور مختلف چھوٹے بڑے شہروں اور قصبوں میں شعر و سخن کی محفلیں آراستہ ہونے لگی تھیں۔

(1) احمد آباد

احمد آباد مدت تک گجرات کا پایۂ تخت رہ چکا ہے لیکن اکبر شاہ ثانی کے عہد میں اس کی وہ حیثیت باقی نہیں رہ گئی تھی چنانچہ شاعروں کی وہاں پر کثرت نہیں رہ گئی تھی اس شہر میں صرف چند شاعر رہ گئے تھے اور وہ بھی یہاں وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔

1- باقر

اپنے وقت کے ممتاز لوگوں میں سے تھے، فائق نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

''باقر تخلص، اسوۂ شعراء، اصلح فصحاء سخن پرور، نظم گستر، استاد مسلم، میر باقر علی بخاری، از فرزندان حضرت شاہ عالم، مولد در زین البلاد احمد آباد، اکثر اوقات بہ تقریب درس فارسی کہ سرداران دولت انگریزی استفادۂ علوم می گرفتند، سیر اماکن دکن و خاندیس فرمودہ، انواع حسب فضیلت را با نسب سیادت جمع می دارند، فاضلی است سخن سنج نکتہ پرور و عالمے خوش کلام و خوش فکر.....در رسوم شعر و قوانی و انشاد عروض بے نظیر روز گار است، طبع شریفش بہ خیالات فارسی موزونی تمام دارد، گاہے بہ تحریک ہم عہدان خود فکر سخن برنگتہ زباں می کردند''۔1

ان کا ذکر کسی اور معاصر تذکرے میں نہیں مل سکا ہے، فائق نے ان کے صرف دو شعر

لکھے ہیں۔

جو لب سے اپنے تبسم وہ گلعذار کرے　　دہان غنچہ صبا کیوں نہ بخیہ دار کرے

عکس جوہر دمِ شمشیر دودم میں قاتل　　نالے نالاں کے لیے سرمۂ خاموشی ہے

بظاہر اس کلام میں آورد ہی آورد ہے، شاعر کو صنعتوں کے طرف کا زیادہ سے زیادہ شوق معلوم ہوتا ہے۔

2-وحید:

یہ بھی اپنے وقت کے استادوں میں تھے، فائق نے ان کا احوال بھی اس طرح قلمبند کیا ہے:

"وحید تخلص، نامش شیخ وحید الدین خلف شیخ رحیم الدین از استادان نامور احمد آباد بودند، ہمچو تخلص خود در تدریس فارسی وحید وقت خویش بودند، در آں شہر کم کسے باشد کہ نسبتِ شاگردی ازاں مغفور نداشتہ باشد مدت مدید صرف ما یحتاج از سرکار حضرت قاضی محمد صالح قدس سرہٗ می رسید، عرصۂ پنج شش سالست کہ جہان گذراں را وداع مفارقت فرمود، بالجملہ صاحب اوصاف واخلاق بودند، فقیر ہم وقت اقامت بہ احمد آباد بہ خدمت شریفش تحصیل فن فارسی می کرد، اگر چہ فقیر در ہنگام اکتساب علم فارسی ذکر از کار سخن فرمودن آں مرحوم نہ شنیدہ، البتہ کہ در فارسی کلامے می گفتند، امّا بعضے احیاناً چند ابیات طبعزاد ایشاں بطریق ارمغاں فرستادند، بریں یک بیت اکتفا کردہ یادگارانہ ثبت افتاد۔

یہ ہم پہ گردشِ گردوں سے جو ہُوا سو ہُوا　　تو اپنے دل میں نہ آزردہ ہو ہُوا سو ہُوا"۔ 2

وحید نے 1262-63ھ (1846-47) کے قریب وفات پائی تھی، ظاہراً ان کو بھی مشکل ردیف اور قوافی میں شعر کہنے کا شوق تھا۔

اس زمانے میں احمد آباد میں کئی اور شاعروں کی موجودگی کا بھی پتا چلتا ہے، ان میں سے دو کے نام یہ ہیں:

سید احمد نور اللہ احمد　　اور　　صوفی احمد آبادی

(2) بڑودہ

بڑودہ مرہٹوں کی ریاست تھی۔ وہاں کے راجا نے اپنی ریاست کی نیک نامی کا خیال کیا چنانچہ اس کے مقرب امرا اور حکام نے بھی علم و دانش کی سرپرستی کی اور وہاں شعر و ادب کی مجلسوں کے سلسلے بھی جاری ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ان میں سے زیادہ کا احوال قلمبند نہیں کیا ہے۔

1۔ نصیری

نواب میر امین الدین حسین خان نام تھا اور یہ نواب میر کمال الدین کے بیٹے اور نواب میر نور الدین حسین خان نواب بڑودہ کے پوتے تھے۔ خود نہایت متقی اور پرہیزگار شخص تھے، حضرت غلام نصیر الدین عرف کالے میاں کے عقیدت مند تھے اور انھیں کے نام کی مناسبت سے اپنے لیے نصیری تخلص پسند کیا تھا۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد نصیری ان کے جانشین ہوئے، فائق نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''نصیری تخلص نواب امین الدین حسین خان مرحوم، از امراء نامی سرکار مہاراجا بڑودہ بنابر غایت تشہیر ذکر محامدش احتیاج تسطیر نہ دارد، ورسنہ ثلاث وخمسین ومائتین بعد الف ماۃ عمرش منکسف گردید وہم تاریخ انتقالش غروب مہ یافتہ شد''۔1

فائق نے ان کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے۔

وائے یہ گردشِ طالع کہ شب اس محفل میں　　پہونچی نوبت جو ہماری تو سبو ٹوٹ گیا

اچھا شعر ہے، مضمون بھی نیا ہے اور زبان بھی اس کی صاف اور رواں ہے، بیان کا طرز بھی پسندیدہ اور خوب ہے۔

نصیری کی وفات کے بعد ان کے بھائی نواب میر حسام الدین مسند نشین ہوئے، یہ بھی علم دوست رئیس تھے۔ چنانچہ ان کے زمانے میں مختلف ریاستوں سے بعض شاعر بڑودہ میں آکر مقیم ہو گئے تھے، ان میں خواجہ ابراہیم غنی بھی تھے جو چین سے آئے تھے۔

2-شیدا

مشاق اور باکمال شاعر تھے، نورالدین فائق نے ان کے حالات اس طرح لکھے ہیں:

''شیدا تخلص، خواجہ سعید نام، ابن الخال نواب حسام الدین حسین خان بہادر چغتائی نژاد بودہ، اصلش از دہلی بود، وے در بڑودہ از نہاں خانۂ بطون قدم بہ عالمِ وجود نہادہ، مردِ نیک سیرت وخوش طبیعت بودہ، ذہنِ سلیم وفکرِ مستقیم داشت، در ہر زمین سنگلاخ دو دو سہ سہ طرح غزل می کرد، بر جودتِ ذہنش ایں نقل زباں زدِ برنا و پیر است۔

آوردہ اند، وقتیکہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ مولف تذکرہ گلشنِ بے خار بہ عزم زیارت خانۂ مبارک وارد بڑودہ بودند، مشارٌ الیہ خبر نواب شنیدہ بہ حضورش رفت وطرحے خواست کہ بر آن طرح سخن کند، نواب موصوف منزل زدہ وتعب کشیدۂ راہ بود بعذر عدم گفتنِ سخن بر بستہ زبان آورد، چوں التماس او از حد گذشت ناچار ایں بیت فرمود۔

احباب تنگ کرتے ہیں فکرِ سخن کو اور　　تنگ آرہے ہیں جان سے اپنی سفر میں ہم

شیدا کہ شیدائے ایں معنی بود بجز واصفائے ایں بیت غزلے گفت ومصرع اولیٰ بیت نواب را تغیر دادہ ومقطع غزل کردہ بہ نظر ایشاں در آوردہ۔

شیدا طریح مانگے تو کہتے ہیں شیفتہ　　تنگ آرہے ہیں جان سے اپنی سفر میں ہم

شیفتہ بعد مطالعۂ غزل متبسم شدہ تحسین و مرحبا بر ذکاوت طبع شیدا خواند، و در طرس تحسین
و ما تین بعد الف راہی سفر حجاز بود، و بعد شرف عتبہ بوسی روضۂ مقدسہ فے مابین حرمین
شریفین زادہما شرفا در عین عالم جوانی واصل لقائے رحمانی شد، شیدا صاحب دیوان
است"۔2

ان کے چند شعر نمونہ کے طور پر یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

میں نے کہا کوچے میں ترے آؤں تو بولا — جاتا نہیں جنت میں گنہگار کوئی شخص
ہنستا کسی گلرو سے نہیں میں کہ مبادا — ہوجائے گلے کا نہ مرے ہار کوئی شخص
نہ ذوق سجدہ سے ہیں برہمن، نہ اہل دین واقف — مگر ہے آستانا تیرا یا میری جبیں واقف
کیا بڑی عمر ہے، یاد اس کو ابھی کرتے تھے — وہ سواری بت ہو شربا آتی ہے

کلام سے ان کی مشاقی بخوبی ظاہر ہے، نواب شیفتہ کے مذکورہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی قدرت کلام پر ان کو بڑا اعتماد تھا لیکن مضامین میں جدت اور کیفیت نہیں معلوم ہوتی تھی۔

(3) بھڑوچ

اِس بلدۂ مینو سواد کے والیان شروع سے علم و دانش کے دلدادہ رہے تھے لیکن دنیا میں شہرت اور ناموری ہر شخص کو میسّر نہیں ہوتی ہے، یہی معاملہ ان کا بھی رہا ہے۔

1-صاحب

صاحب تخلص تھا، نواب مرزا محمد بیگ نواب بھڑوچ کے صاحبزادے نواب رفیع الدولہ بیگ خان بہادر عرف نواب حامد بیگ کا، اپنے والد کی رحلت کے بعد ان کی جگہ مسند نشین ہوئے، چودہ برس تک استقلال سے حکومت کی، خود شاعر بھی تھے اور شاعر نواز بھی، 4/ جمادی الاولی 1181ھ (1767) کو وفات پائی۔ کسی نے غم عالم سے تاریخ نکالی تھی، ان کا ایک شعر یہ ہے۔

1181

آہ معلوم نہیں ساتھ کے اپنے شب و روز　　لوگ جاتے ہیں سو یہ لوگ کہاں جاتے ہیں[1]

کلام سے قدامت کا رنگ جھلکتا ہے، اکثر لفظوں کا تلفظ بھی ویسا ہی ہے۔

2-ضاحک

مرزا احید الدین بیگ نام اور ضاحک تخلص تھا، اکبر شاہ ثانی کے ہم عصر تھے، باپ کے قبضہ سے ریاست جاتی رہی تو یہ بمبئی میں جا کر سکونت پذیر ہو گئے، فائق نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''ضاحک تخلص، مرزا احید الدین بیگ خلف نواب امتیاز الدولہ معزز خان بہادر والی۔
ایں بلدہ، بعد تحویل ریاست پدر بزرگوار خود در بمبئی رفتہ اقامت می داشت و بہ وقع
وقار تمام می زیست واز سرکار انگریزی برائش ماہوار مقرر بودہ، قریب بست سال است
کہ راہی سفر آخرت شدہ، مسموع یافتہ کہ صاحب دیوان است''۔1

انھوں نے 1248ھ (1832) کے قریب وفات پائی تھی، کلام میں ان کے پختگی کا وصف ظاہر ہے، ان کے دو شعر یہ ہیں۔

نرگسی چشم کا بیمار ہوں، کن کا، ان کا　　تشنۂ شربتِ دیدار ہوں، کن کا، اِن کا
دِل پژمردہ کی تو داد دلا جا، آجا　　شربتِ وصل مجھے یار پلا جا، آجا

ان کی شعر گوئی کا انداز دلچسپ اور قابلِ قدر ہے، بھڑوچ میں اِس زمانے میں بہت شاعر جمع ہو گئے تھے، چند کے نام یہ ہیں:

بدرالدین بے تاب بھڑوچی، مرزا محمد بیگ طالب بھڑوچی، میر احمد اللہ احمد بھڑوچی وغیرہ۔

3-ذاکر

یہ نورالدین فائق کے عزیزوں میں سے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان کا احوال کسی قدر تفصیل سے درج کیا ہے:

''ذاکر تخلص، اسم بزرگوارش سید محمود از بنی اعمام حضرت جد امجد راقم، نسبش بہ حضرت
محبوب یزدانی سید احمد جعفر شیرازی قدس سرہ منتہی می شود، تولد و نشو و نما در ایں شہر
رشک ارم است، مصدر مکارم کریمہ و محامد صفات پسندیدہ ظاہرش، بہ جو باطن مطابق
و بہ مزید فضل و دانش بر ہم عصران فائق، بر اضافہ علوم امتیازے تمام داشتہ، لا سیما در
دری زبان قدرت کاملہ و مضامین شستہ می یافت، طرز نثر نویسی اش عذب و شیریں
و گفتار گزیدہ اش دلنشیں سر انشا بہ طرز جامع القوانین تصنیف می فرمودہ، در ابتدائے
حال بہ خدمت صدر امینی قلعہ کھیڑہ کہ از شائستہ خدمات انگریزی است قایم بودہ، در
عمر ہشتاد و سالگی دو دیعت حیات سپردہ، امروز وفاتش را سیزدہ سال سپری شدہ، گاہے
دریں زبان بہ تفنن خاطر و پاس ہم زباناں سخن فرمودے، قطع نظر از محاورۂ ایشاں کہ

دریں وقت مروج است فرقے است بعید، ایں یک دو شعر کہ بموجب زبان جدید
گجرات از بیاض حضرت جد امجد ثبت افتاد و ہم بہ اسم شریف خود متخلص می شدند۔

ہے اُس روے نکو پر اس طرح خط　　قمر کے جس طرح ہو گرد ہالا
عبث ہے جستجو ذاکر دہن کی　　نہیں تا عمر بھی یہ پانے والا 2

ان کی وفات 1255ھ (40-1839) کے قریب ہوئی تھی، سیدھی سادی زبان میں سامنے کے مضامین نظم کیے ہیں، ان کے مزاج کی سادگی کا اثر یہ ہے کہ غزلیں غیر مردّف بھی کہہ لیتے تھے۔

4-عباس

یہ نواب معزز خان کے زمانے کے معزز شاعروں میں سے تھے، فائق نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''عباس تخلص، سید عباس علی از سادات ایں بلدہ بود در سلک خشیان نواب امتیاز الدولہ معزز خان بہادر سرفراز، یک دو رقعہ نوشتۂ او بہ نظر رسید، معلوم شد کہ فارسی را خوب می دانست، حالات جنگ نواب موصوف با سرکار کمپنی و قابض شدن انگریزاں بر بلدۂ بھڑوچ را تمام و کمال در نظم ہندی آوردہ، از دیادگار است، زیادہ ازیں سال است کہ ہم آغوش لحد است''۔3

فائق نے ان کا صرف ایک شعر لکھا ہے۔

جس جگہ حُسن کا بازار ترے ہووے گرم　　یوسفِ مصر کا وہاں کوئی خریدار نہ ہو

عباس علی کا جنگ نامہ جس کا عنوان ''تاریخ قصۂ نواب معزز خان مرحوم'' ہے ایک مختصری نظم ہے، اس کا ایک نسخہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی آزاد لائبریری میں محفوظ ہے، فہرست نگار نے اس کی کیفیت اس طرح قلمبند کیا ہے:

''بھڑوچ کے اخیر نواب معزز خاں 1772 (87-1186ھ) کی ایک لڑائی کی داستان مصنف نواب صاحب کے ہمراہ تھا کاتب نہایت ہی کم سواد ہے، آخری شعر پڑھا نہ جا سکا''۔4

لڑائی کا جو سال اس اقتباس میں آیا ہے صحیح نہیں ہے، عباس کی یہ مثنوی اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

کہوں کیا خان صاحب کی بڑائی لڑیں ایسے کو سایوں سیں لڑائی

اس نظم کی موجودگی اس حقیقت کی غماز ہے کہ بھڑوچ کے علاقے میں شاعروں نے غزل کے علاوہ دوسری مختلف شعری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔

(4) سچین

سچین کی ریاست مضافاتِ سورت میں تھی۔

1-کریم

نواب شیدی عبدالکریم خان ابن شیدی عبدالرحیم خان ولد شیدی سرور یاقوت خاں ریاست زنجیرہ سے جو بمبئی کے قریب تھی پیشوا کے پاس پہنچے، اس نے ان کو ستّرہ گاؤں سورت کے قریب عطا کیے۔[1] شیدی عبدالکریم نے قصبہ سچین کو صدر مقام بنا کر اپنی چھوٹی سی ریاست قائم کی۔ شاہ عالم ثانی نے ان کو محمد یاقوت خان مبارز الدولہ نصرت جنگ کے خطابوں سے سرفراز کیا۔

نواب عبدالکریم خان خود بھی شاعر تھے اور شاعروں کے ساتھ مربیانہ پیش آتے تھے۔[2] اپنے نام کی مناسبت سے انھوں نے کریم تخلص اختیار کیا، فائق نے ان کے یہ دو شعر اپنے تذکرے میں لکھے ہیں۔

یار دیکھو ہرا شرابی ہے　　آنکھ اُس کی عجب گلابی ہے
چشم مست اُس کی دیکھ کر عاشق　　کہتے ہیں آج پھر خرابی ہے

2-محبّ

یہ نواب شیدی عبدالکریم خان کے ولی عہد تھے اور اپنے والد کی جگہ مبارز الدولہ محمد ابراہیم

یاقوت خان بہادر نصرت جنگ کے خطاب سے مسند نشیں ہوئے تھے، اور نواب شیدی بالو کے عُرفی نام سے مشہور ہوئے تھے، اپنے والد کی طرح یہ بھی علم دوست اور شاعر تھے، محبؔ تخلص کرتے تھے، فائق نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''محبؔ تخلص نواب محمد ابراہیم خان مبارز الدولہ جنگ خلف نواب عبد الکریم یاقوت خاں والیِ سابق من مضافاتِ سورت، ہموارہ رنگِ مشاعرہ بہ مکانِ فیض بنیان خودی ریختہ ومشاہیر شعرائے سورت را تکلیفِ طرح غزل می نمودند، صادرین واردین را بابا حُسنِ خدمت واخلاق بہ صلہ وجائزۂ شائستہ پیش می آید، صاحب دیوان فارسی و اردو مثنویات اند''۔3

افسوس ہے کہ ان کی تصانیف میں سے کوئی بھی اب دستیاب نہیں ہے۔ سید ظہیر الدین مدنی نے البتہ اتنا لکھا ہے کہ:

''نواب صاحب نے قریب سو سال کے عمر پائی تھی، 4/ جمادی الثانیہ 1269ھ (1852) کو وفات پائی تھی۔ حدیقۂ احمدی میں مرقوم ہے کہ ایک کتاب حکایاتِ فارسی اور یوسف زلیخا کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اور بدر منیر کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا''۔

فائق نے ان کا صرف یہ ایک شعر لکھا ہے۔

یار با سلسلۂ زلفِ دراز آتا ہے　　مژدہ اے دل کہ دہ دیوانہ نواز آتا ہے

خیال کرنے کی بات ہے کہ ان کے اثر سے اس علاقے میں صنفِ مثنوی کی طرف شعرا کو زیادہ توجہ ہوئی تھی، یہ اور بات ہے کہ اس خطے کے بیشتر شعرا کا احوال اور کلام اب دستیاب نہیں ہے۔

3-اخلاص

قاضی نور الدین فائق نے نواب محبؔ کے دو صاحبزادوں کا ذکر شاعر کی حیثیت سے کیا ہے، پہلے سید میاں جو اپنے والد کے جانشیں ہوے، ان کا حال فائق نے اس طرح لکھا ہے:

''اخلاص تخلص امیر ذو الکرام عبد الرحمٰن خان نام عُرف سید میاں خلف نواب سبارز الدولہ ابراہیم یاقوت خان بہادر نصرت جنگ المشہور بہ نواب بانو والیِ قصبہ

سچین من مضافات سرکار سورت، امیر زادہ ایست، متصف بہ صفات پسندیدہ و دریں
است مستجمع اخلاق حمیدہ، عرصہ چند سال است کہ راغب شعر گوئی اند، ابیات رنگیں
ونظم متین می دارند، گویند در مکان فیض بنیانش محفل مشاعرہ منعقد می گردد، صاحب
دیوان اند و یک داستان مثنویہ بہ طریق مثنوی قریب چند ہزار بیت بہ فصاحت تمام
گفتہ، اگر چہ در تحصیل ایں فن چنداں رغبتے نہ فرمودہ، با وجود آن با پا لغزی ہائے
شاعری در سخن کمتر، راقم آثم ہنوز شہد صحبت ایشاں نہ چشیدہ مگر از مطالعہ اشعار مستفاد
گردید کہ اکثر مذاق کلامش ہم انکار شیخ ناسخ است واین ہم بر علو طبع ایشاں دلیلے
است بین، چنانچہ ماہران این فن در تصانیف خود ہا نوشتہ کہ با شاعر اعلیٰ طبع ہم طرز
بودن دلالت است بر تیزی فکر شاعر، الحاصل اکثر کلمات شیریں منش کم از قید مکرر
نیست"۔4

اخلاص بھی اپنے علاقے کے لکھ لٹ نواب تھے، چنانچہ ان کے کلام میں طرز لکھنؤ سے مطابقت کا پایا جانا امر قدرتی تھا۔ فائق نے ان کے تین درجن سے زیادہ اشعار لکھے ہیں، چند یہ ہیں ؎

روئے منور اس کا، دلِ شعلہ زن میرا — اخلاص سامنا ہے یہاں نور و نار کا
اس پری کو کس طرح کوئی مسخر کر سکے — جس نے دیکھا اس کی صورت کو مسخر ہو گیا
یاد آتا ہے ہمیشہ قصۂ یوسف کا حال — مجھ کو اشفاقِ پدر اور بغضِ اخواں دیکھ کر
دل میں آتا ہے جلا کر خاک نامے کو کریں — نامہ بر کوئی ہمارا بجز صبا ہوتا نہیں

معلوم ہوتا ہے کہ اخلاص کو طویل ردیفوں اور سنگلاخ زمینوں میں شعر کہنے کا شوق نہیں تھا۔

4-فرحت

یہ سید میاں اخلاص کے چھوٹے بھائی تھے، فائق نے ان کے ذکر میں بس اسی قدر لکھا ہے:
"فرحت تخلص ابن نواب ابراہیم یاقوت خاں والیِ سچین برادر کوچک سید میاں اخلاص، از نامش مطلع نیم"۔

اور ان کے صرف یہ دو شعر تذکرے میں درج کیے ہیں ؎

یہ حضرتِ دل جس کی نگاہوں پہ مرے ہیں　　مدِّ نظر اُس شوخ کے جمدھر سے دھرے ہیں
جس دن سے بُدی دل نے کیے یار سے فرحت　　کچھ تجھ ہی سے تنہا نہیں عالم سے بَرے ہیں

کلام سے نومشقی ظاہر ہے، اکثر قدیم الفاظ بھی نظم کر جاتے تھے، مضامین تازہ کی جستجو کا شوق معلوم ہوتا ہے، اس میں کبھی کوئی دُرِ بے بہا بھی ہاتھ لگ جاتا ہے۔

یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ اہلِ تذکرہ نے اس خطے کے شاعروں کے حالات میں استادی اور شاگردی کے سلسلوں کا عموماً ذکر نہیں کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شاعر اپنے مزاج اور علم وغیرہ کے مطابق فکرِ شعر کرتا تھا البتہ علاقہ کے امرا اور رؤسا کی طبیعت نے میلان اور پسند کو بھی شاعری کے طرز و آہنگ کی تعمیر و تشکیل میں دخل ہوتا تھا۔

سچین شیدی خاندان کی چھوٹی سی ریاست تھی۔ نواب محمد ابراہیم یاقوت خان بہادر متخلص بہ محبّ نے دہلی کے اکبر شاہ ثانی کا زمانہ پایا تھا، فائق کا کہنا ہے کہ اس کے گھر پر شاعروں کا جمگھٹ رہتا تھا، لیکن خود ان کے تذکرے میں سچین کے زیادہ شاعروں کا حال درج نہیں ہے، وجہ شاید یہ ہوئی ہو کہ خود فائق کو ان کی خدمت میں رسائی حاصل نہیں ہو سکی تھی، یہاں صرف دو شاعروں کا مجملاً ذکر کیا جاتا ہے۔

5- غمگین

غمگین والیِ سچین کے ملازمین میں سے تھے، قاضی نورالدین فائق نے ان کے تعارف میں تحریر کیا ہے:

"غمگین تخلص، منشی فرید بخش اصلش از ہند، قریب سی سال است کہ در ندمائے خاص نواب ابراہیم خان والیِ سچین شمردہ می شود، شگفتہ طبع و خوش وضع است"۔

قیاس کہتا ہے کہ یہ مغربی یوپی کے کسی مقام کے رہنے والے ہوں گے اور سچین پہونچ کر نواب کے مقرب ہو گئے ہوں گے، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

شمع رویوں کی ملاقات سے کرتا ہے تو منع　　ناصحا آگ لگے اس ترے سمجھانے کو
دامِ ہجراں میں گرفتار ہوں مُرغِ اسیر　　پڑا تڑپوں ہوں رخِ خال کے میں دانے کو

غمگین کو محاوروں کے نظم کرنے کا شوق معلوم ہوتا ہے۔ ان شعروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ

شاید یہ شاعر دہلی کے مضافات کا رہنے والا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

6-غنی

یہ بھی نواب کے مقرب تھے، فائق نے ان کے احوال میں بعض مفید معلومات قلم بند کی ہے:

''غنی تخلص، اسمش خواجہ ابراہیم از باشندگانِ سورت، مرد خوش صحبت وخوش سیرت وشیمہ خلق وتواضع درطینت می دارد، گاہے مرکب فارسی ہم می باشد ہوراوائل مفلس تخلص می کرد، روزے نواب ابراہیم یاقوت خاں والی چھین کہ از جوہریانِ ایں فن است نظر بر گوہر بے بہائے معتیش فرمودہ وتخلص مفلس بجا انگاشت وگفت کہ ازین روز غنی تخلص نماید، غنی کہ از فکر مجوز غنی بود بدیہۃً ایں شعر بر زباں راند فرمود

کب تک رکھے گا مفلس اے چرخ بد گہر تو　　یاقوت خاں نے مجھ کو اب تو، غنی کیا ہے

عرصۂ چند سال است کہ در سرکار نواب حسام الدین خان بہ پیشۂ طبابت متعلق است قوت حافظہ کمال است، اشعار اساتذہ یاد دارد بسیار''۔

غنی کے چند شعر یہ ہیں ؎

آج اُس جھوٹے کی جھوٹی سے ملے گی کیا مجھے　　جو پھڑکتے ہیں مرے بیرمغاں کچھ شب سے لب

مثلِ تصویرِ تحیّر میں بس آجاوے ہے　　آئینہ دیکھے ہے جب اس مری حیرانی کو

میرے اشکوں کا روبرو آنا　　آبرو موتیوں کی پانی ہے

رہتی ہے چت چڑھی اب کس کی سنہری رنگت　　جوبن دنوں غنی کا چہرہ ہے زعفرانی

معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم یاقوت خان اپنے وقت تک ان کی سرپرستی کرتے رہے تھے پھر یہ بڑودہ جا کر نواب حسام الدین کے یہاں طبیب کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔

نواب ابراہیم یاقوت خان کے ایک شعر سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے بغض سے پریشان تھے ان کی فیاضی اور عالی حوصلگی کے باوجود ان کے حالات سے ان کے متوسلین کا بھی متاثر ہونا لازم تھا چنانچہ غمگین اور مفلس وغیرہ تخلص حقیقت حال کی صاف غمازی کر رہے ہیں، ایسے حالات میں شعرائے چھین کے کلام کے معیار کا بلند ہونا آسان نہیں تھا، بیشتر شاعروں کے یہاں یاس وناامیدی بھی غالب معلوم ہوتی ہے۔

(5) سورت

گجرات کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے کو یہ قول ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ:

''مدار بادشاہی دہلی بر گندم و جوار است و مدار بادشاہی گجرات بر مَرجان و مَروارید است کہ ہشتاد و چہار بندر در تحتِ تصرف بادشاہی گجرات است''۔

سورت گجرات کے اہم ترین بندرگاہوں میں سے تھا۔ یہاں کے ملک التجار ہی علم و دانش کے صحیح سرپرست تھے، یہ اور بات ہے کہ بعض نوابین بھی علم پروری کے معاملے میں قابلِ ذکر کردار ادا کر رہے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں سورت میں معروف شاعروں کی خاصی تعداد تھی، اس مقام پر ان میں سے صرف کچھ کا حال مختصراً لکھا جاتا ہے۔

1 - احمد میاں جان

اس شخص کے تفصیلی حالات کچھ معلوم نہیں البتہ جامع مسجد بمبئی کے کتب خانے میں اس کی ایک کتاب ''بیاض احمد مع شرح'' مخطوطہ کی صورت میں ہے[1]۔ کتاب کا متن منظوم ہے اور اس کی شرح نثر میں ہے، اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیان میں بعض ضروری مسائل و عقائد و فقہ دینِ محمدی کے ہیں، بھائی مسلمان عامیوں

کے واسطے اور بیتوں میں بنانا منہ پر یاد رہنے کے واسطے ہیں، ارادہ شاعری کا نہیں ہے"۔

مصنف خود کو شاعر ثابت نہیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ باقاعدہ شاعر ہے بھی نہیں، اس لیے اس نے اپنا کوئی تخلص مقرر نہیں کیا ہے۔ جہاں ضروری سمجھا ہے اپنے نام کو تخلص کے طور پر نظم کر دیتا ہے، یہ کتاب اس نے 1231ھ (1815) میں لکھی ہے، کہتا ہے ؎

اب تیری رحمت کے سوائے ربّنا نہیں آسرا　　احمد میاں جاں کو بھی تو غفار ہے دو جگ بھیتر

بارہ سو اجہری کے اوپر یک تیں میں ہوئی یہ تمام　　جو کوئی پڑھے اور جو سُنے ہو رب سے رحمت اُس اوپر

اس موقع پر اس نے سبب تالیف میں یہ بیان کیا ہے:

"یہ کتاب سنہ مذکور میں بطریق بڑودہ کے، بندر مبارک سورت میں لکھی گئی۔ بعد اس کتاب کے حاشیہ پر بعض مسائل ضرورت کے سبب اور بحث و تکرار کے سبب لکھتے لکھتے بہت ہوے، بعد شولا پور کے مقام میں آتا ہوا تب مسائل زوائد بہ مع فوائد بطریق شرح کے داخل کیا تا کہ ہند کے بھائی مسلمان عامی لوگ ہندی میں مسائل دین کے ہونے سے سیکھ کر علم دین سے واقف ہو کر اہل علم گنے جاویں"

اسی سلسلہ میں ذیل کے اقتباس بھی توجہ طلب ہے:

"عربی فارسی بولی میں علم کی کتاباں ہیں سو عرب و فارس کے لوگ اپنی مادرزاد بولی میں علم ہونے کے سبب جلد علم کی لیاقت کو پہنچتے ہیں، اور ہندی کے لوگ وہ دوسری بولیاں سیکھنے سوائے علم و عقل کتابوں سے حاصل نہیں کر سکتے، اکثر بے خبر ناواقف اور کم عقل رہتے ہیں"

اور:

"تب اگر ایک کتاب فارسی یا عربی میں عقائد و مسائل کی ہووے کہ جسے سیکھنا ضرور ہے، تو ہر ایک مسلمان کو وہ بولی سیکھنے کی محنت لیے سوائے وہ کتاب نہ سمجھے، اور اسی کتاب کو اگر ایک آدمی نے محنت کر کے ہندی میں بنایا تو پھر سب کی محنت آسان ہو گئی کہ اپنی بولی میں ہونے سے سب جلد سمجھ لیوں گے۔"

ان اقتباسوں سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں گجرات کے خطے میں بھی عربی وفارسی کا رواج مسلم معاشرے میں نہیں رہ گیا تھا اور یہ زبانیں ''غیر'' ہوگئی تھیں۔ مصنف کے بقول ہندی (ہندوستان کے) لوگ زبانِ ہندی کو بے تکلف پڑھ اور سمجھ سکتے تھے، یہ ضرور تھا کہ شمال اور جنوب کے علاقوں کے لوگوں کے تلفظ، لب ولہجہ اور روز مرّہ میں فرق تھا، چنانچہ احمد میاں جان کی زبان کا بھی یہی معاملہ تھا۔

احمد میاں جان نے اپنی کتاب ان شعروں پر ختم کی ہے ۔

از طفیلِ مصطفیٰ اور انبیاء　　آل اور اصحاب، جملہ اولیاء
فضل سے اپنے دعا یاں کر قبول　　کرم سے اپنے مُراداں کر حصول
بخش دے احمد میاں جاں کے تئیں　　یہ محمدؐ کے ثنا خواں کے تئیں

2-قطب

یہ سورت کے متموّل تاجروں میں سے تھے۔ خود شاعر تھے اور شاعروں کی سرپرستی بھی کرتے تھے، فائق نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''قطب تخلص، ملّا قطب الدین از متولان ومعززان سورت بودہ، بزرگانش از پیشگاہ خلافت مخاطب بہ ملک التجار بودند، در سلیقہ وصحبت از ہمعصران فائق، صورت باسیرت مطابق داشت، حیف کہ گلچین اجل در ریعانِ جوانی گلِ وجودش را بر چید وگل بند قضا قامت موزونش را کہ سرو خراماں بود بہ گلشنِ جنت رسانید، دیوانے دارد قلیل الحجم، چند روز برائے اصلاح بہ میاں نجو دادہ بود، از اتفاقات شاید از سہو وقت طائے مہملہ لفظ قطب را کہ تخلصِ خودش بود در یک شعر متحرک بہ وزن آوردہ، محمد اسحاق متخلص بہ اسحاق دریں خصوص معارض گردید وایں مضمون را بہ نظم کشید فرمود

بجائے جزم لفظِ قطب بر ضم بسکہ بھاری ہے
یہ اس کے چرخ کے محور میں کس نے میخ ماری ہے

اگر چہ از رشک نوگریز خامہ ام گرہ در دل ناقۂ آہوے چینی گرہ بستہ لما معاذ اللہ گاہے غبار نکہ چینی بہ دامانِ خاطر نہ نشستہ، چشم دارم کہ اگر بہ پائے چشم دریں باغ سراپا بہارم

بہ شتابی خار نمیت ومعایب کسے را نہ یابی مگر چوں ایں بیت خالی از لطف نہ بودہ بہ تحریک وتکلف بعضے دستانِ ظرافت پسند مرقوم شد، خلاصۂ فکر اوست ۔

کب ہمارے یار کے کوچے سے جاتی ہے بہار جھوٹ ہے کہتے ہیں سب گلشن میں آتی ہے بہار۔ 2

3-اختر

یہ شاعر ملا قطب الدین کے مصاحبوں میں سے تھا، فائق کے تذکرے میں ہے:

''اختر تخلص، احمد علی نام، از باشندگان حیدر آباد دکن، سالہائے سال عمر عزیز خود را در سورت گزرانیدہ، ملا قطب الدین قطب پیوستہ در مصاحبت خودی داشت، گویند خط نستعلیق را ہمچو خط یاقوت بسان شیریں می نگاشت، شاعرے بود نیک فکر، درست اندیشہ وجوانے بود دل خستہ عشق پیشہ، نظر بہ تخلص از نیرنگی گردش تقدیر پایش گرفتار سلسلۂ عشق پری پیکرے ماہ طلعتے از اہل نشاط مہتاب نامی شدہ، مہتاب محبت در دلش پرتو انداز گشتہ، یکبار متاع صبر وشکیبائے در رفت ہوش وہوشیاری بر باد دادہ، دانہائے حلقۂ انگشت او برا کثر اعضا خوردہ بود در عشق آں شمشاد قد گلعذار ہموارہ خود را رشک سرو چراغاں می نمود، از چندے حالش روشن نہ کہ گردش فلک آں اختر دل سوختہ را کجا برد، اغلب کہ ستارۂ زندگیش ہبوط کردہ باشد''۔3

یہاں ان کے صرف دو شعر نمونہ کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔

مو برابر نظر نہیں آتی مل بے تیری کمر کی باریکی

اتنا جو پُر غبار ہے اختر یہ دشتِ دل یاں سے مگر سواری کسی کی گذر گئی

4-بخشش

یہ بھی سورت کے تاجروں کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے چنانچہ فائق نے ان کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے:

''بخشش تخلص، شیخ احمد نام المشہور بہ بخشو میاں شاگرد میر امان اللہ نادر، آبائش تاجران نامی سورت می باشند، صاحب ذہن عالی بودہ، در فارسی وگجراتی شایستہ قدرت داشت، از جانب سرکار کمپنی بر تعلقہ منصفی قایم بودہ، کتاب کثیر الحجم مسمّٰی بہ حدیقۂ احمدی

مشتمل بر احوال غزوات جناب رسالت مآب وخلفاء الراشدین وائمہ اثنا عشر وسایر
ملوک روم وشام وہند وفرنگ وعربہ ہائے ہندوستان بہ عبارت سلیس تالیف ساختہ
ودیباچہ اورا بہ نام نواب افضل الدین خان بہادر والیِ سورت نوشتہ واز اتفاقات حسنہ
میاں بخو صاحب، مادۂ تاریخ اتمام تالیفش را بہ نام میر افضل الدین یافتہ، بہ دیں
صورت بہ سلکِ نظم کشید تاریخ

بہ عہد افضل الدین خان نواب مرتب گشت تاریخ نگاریں
ز گل تاریخ با املا وافضل دلیل افضلیت بس بود ایں
کہ آمد سالِ تاریخش برابر بنامِ نامیِ میر افضل الدین 4

(1845)ھ1256

در شہر شوال سنہ خمس وستین مأتین بعد الف ازیں جہانِ فانی بہ عالمِ جاودانی رخت ہستی بر بست ونواب مصطفیٰ خاں شیفتہ تاریخ رحلتش از دار الخلافت دہلی بہ دیں نوع گفتہ فرستاد تاریخ:

کیا کیا نکوشیم عدم آباد کو گئے ملک جہاں خراب ہوا اب کے سال میں
خاص اس جوانِ صالح ودیندار کا فروغ نکلا جو بدر سے بھی زیادہ کمال میں
بخشو میاں پہ نور جو برسا دمِ وصال سالِ وفات آ گئی میرے خیال میں

(1849)ھ1265=256+1009

بخشو میاں کے استاد میر امان اللہ نادر سورت کے قدیم شاعروں میں سے تھے۔ 5 غزلت اور تبحر وغیرہ کے معاصر تھے، لمبی عمر پائی تھی لیکن ان کا کلام ضائع ہو گیا، فائق نے صرف ایک شعر نقل کیا ہے۔

جب وہ پیارا ناز سے دامن کو ٹھکراتا چلے دل بھی اپنا اس کے آگے ٹھوکریں کھاتا چلے

بخشو میاں کی کتاب حدیقۂ احمدی کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہو سکی، شاید وہ چھپ نہ سکی اور نایاب ہو گئی، بخشو میاں کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

عہد پر اپنے دلربا نہ رہا نہ رہا پر وہ بے وفا نہ رہا
کمانِ عشق سے چھٹ کر لگے ہزاروں تیر جب اُس کی ابرو و مژگاں کے سامنے دیکھا

جب کہ اس گل کا مجھے بیڑۂ پان آتا ہے　　تنِ بیجان میں سو رنگ سے جان آتا ہے
چال اٹھکھیلی کی چلتا ہے خدا خیر کرے　　حشر برپا نہ کہیں ہو یہ گمان آتا ہے

بیڑۂ پان کی ترکیب محلِ نظر ہے لیکن لکھنؤ میں بخشو میاں کے معاصر بزرگ شیخ ناسخ نے بھی کہا تھا　　ع　　مسی آلودہ لب پر رنگِ پاں ہے

4-سمجو

یہ بھی گجرات کے ان شاعروں میں سے تھے جنھیں دہلی جانے کا موقع ملا تھا، فائق کے تذکرے میں ہے:

"سمجو تخلص، ناظمِ کشورِ فصاحت، فرماں روائے اقلیمِ بلاغت زبدۂ شعرائے عالی مقام، خلاصۂ سخنوران ذوالاحترام غلام محمد نام المشہور بہ میاں سمجو، اصل از بندر مبارک سورت، اکثر بلاد را بہ گامِ مساحت پیمودہ، وقتِ مراجعت از سفرِ حجاز در رکابِ ظفر انتساب شاہزادہ محمد جہاں شاہ خلف محمد اکبر شاہ ثانی بادشاہ غازی بہ دار الخلافت دہلی رفتہ، قصیدہ بہ فصاحت تمام و بلاغتِ مالا کلام در مدح حضرت ظلِ سبحانی انشا فرمودہ پس از حضور بارگاہِ سلطانی در صلۂ آں بہ خلعتِ فاخرہ مشمول نوازشات خاقانی شدہ، مدت قلیل تا ہنگام اقامت خود در دہلی چند غزلیات خود را پیش مومن خاں و خاقانی ہند محمد ابراہیم ذوق در آورد، بعدہٗ بہ حیدر آباد دکن رفتہ، در سرکار راجا چندو لال دیوان دولت علیۂ عالیہ نظامیہ بہ سلسلۂ شعراء داخل و ملازم شدند، اکنوں از مدت چند روز در سرکار عالی جاہ ثریا جاہ نجم الدولہ ممتاز الملک نواب حسین یاور مومن خاں بہادر والی بندر کمپایت بر عہدۂ وکالت انگریزی کہ از شایستہ خدمات آں سرکار والا است معزز و ممتاز اند، در فارسی فاضلِ عصر و دیگر فنون کامل دہر، اگر چہ شہرہ شعر آں مجمع کمالات از دیگر علوم بیشتر است لما اشعارش نمونہ ایست بر دیگر فضایلِ او، الحق حق استادی بر ذاتش مسلم، اگر عجدی وقت گویم سزاست وگر فردوسی عہد خوانم رواست، کلام اعجاز بیانش الہامی است کہ فرشتہ بایں معنی ناطق شدہ، و حسنِ سخنش یوسف صفتے است، کہ عجوزہ طبعاں را زلیخا وار جوانی تازہ بخشیدہ، انحصار افضلیتِ آں استادِ متبحر بہ آب دریا

پیوستہ، از تسوید کلام فصاحت نظامش بر مطالعہ کنندگاں می نہد"۔

میاں سمجو کے کچھ شعر یہ ہیں۔

دشمنِ جاں چشم و لب عیسا نفس　　فوق یہاں اعجاز پر جادو رہا
دست فریادی ہے کس مظلوم کا　　کھینچتا شانہ ترا گیسو رہا
آگئی یاد اگر گردشِ چشمِ ساقی　　حشر میں، قبر سے اٹھنا ہمیں مشکل ہوگا
میں تو ہوں کم نگاہی کا مارا　　تم نے کیوں مجھ کو نیچہ مارا

گجرات کے بیشتر شاعروں کی طرح میاں سمجو کو بھی طویل ردیفوں مشکل قافیوں اور سنگلاخ زمینوں میں غزلیں کہنے کا شوق نہیں معلوم ہوتا ہے۔

5-لطیف

یہ شاہ عالم ثانی کے وقت کے شاعر تھے۔ انھوں نے اکبر شاہ ثانی کا زمانہ بھی پایا تھا۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے لکھا ہے:

"لطیف عزیزے از اولاد و امجاد خیر البریہ علیہ الہ التحیہ والسلام نیک سرنجام میر شمس الدین نام، وے از ساداتِ سورت است، امّا از چندے بہ بلدۂ لکھنؤ توطن گزیدہ، گویند کہ جوانِ شایستہ و با ادب و تیز ذہن و مہذب است،

ایں سہ شعر او راست۔

مژدۂ وصل اگر کوئی سناتا ہے مجھے　　میں یہ سمجھوں ہوں کہ جی دان دلاتا ہے مجھے
ایسی الفت کو لگے آگ پڑے چولھے میں　　جو ہے دل سوز مرا وہ ہی جلاتا ہے مجھے
گھر میں جا بیٹھ رہا اس سے خفا ہو تو لطیف　　کیا ہی غصہ تری اس بات پہ آتا ہے مجھے"۔ ج

6-شمس

فائق کے تذکرے میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"شمس تخلص، حکیم شمس الدین خلف حکیم عبد اللطیف از متوطنانِ سورت، بسیار خوش اخلاق و خوش صورت بود، افسوس کہ چراغِ زندگانی آں گل گلشنِ لیاقت را، صرصرِ اجل درعینِ شباب کشت، وفاتش را قریب بست سال می باشد"۔ ج

اس کا سالِ وفات 1248ھ (1532) کے قریب ہے، فائق نے اس کا صرف ایک شعر لکھا ہے:

تو صبح دم نہ نہا بے حجاب دریا میں پڑے گا ٹوٹ ابھی آفتاب دریا میں

سورت میں اسی زمانے میں اور بھی کئی قابلِ ذکر شاعر موجود تھے۔ ان میں سے دو یہ ہیں: سید درویش علی درویش، اور ارشاد علی اضعف۔

(6) کھمبایت

گجرات کے تاریخی اہمیت کے بندرگاہوں میں کھمبایت بھی ہے۔ اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں یہاں ثریا جاہ نجم الدولہ ممتاز الملک نواب حسین یاور مومن خان بہادر کا دور دورہ تھا، بعض شاعر مثلاً میاں سمجو ان کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ ان کے مقربین میں ایک اور شاعر کا ذکر فائق نے اس طرح کیا ہے:

> ''کاظم تخلص محمد کاظم نام، نشو ونما در بندر کھمبایت یافتہ، مسموع شدہ کہ جوانیست بہ تہذیب اخلاق و مروّت آراستہ و بہ حلیۂ ذکاوتِ ذہن پیراستہ حال از چندے بہ خدمت تحصیل تمام پرگنات کھمبایت از سرکار نواب حسین یاور خان بہادر سرفراز است''۔1

ان کے دو شعر درج ذیل ہیں۔

نہ وہ آیا نہ مجھ کو بُلوایا نہ تو خط کا مرے جواب آیا
اسی عالم یہ خواب میں دیکھا اضطرابی سے پھر نہ خواب آیا

زبان ان کی صاف اور سلیس ہے، طرز بیاں بھی عام فہم ہے۔ معمولاً آسان زمینوں میں شعر کہنے کو پسند کیا کرتے ہیں۔ مضامین بھی سامنے کے ہوتے تھے جن میں کوئی دقّت یا

اونچ نیچ نہیں ہوتا تھا۔

2-احمد

یہ زیادہ مدت تک احمد آباد میں رہے تھے پھر کھمبایت میں آ گئے، آخر 1255ھ (1839) میں اسی مقام پر وفات پائی۔ فائق نے ان کے بارے میں جو لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

''احمد تخلص، مخدومنا سید احمد نور اللہ مرقدہٗ اصل از خجستہ بنیاد احمد آباد، در جمیع فنون عربی وفارسی فرید دہر، اکتساب علوم ظاہری از سید میر عالم صاحب، واشغال باطنی از حضرت بڑا صاحب خدانما نمودہ، رسالۂ چند در ریاضی والٰہیات از تصانیفش یادگار، تا عرصۂ سی سال در احمد آباد معروف بہ تدریس بودہ، بعد ازاں کھمبایت را از قدوم میمنت لزوم رشکِ بغداد وصفاہاں ساخت، آخر در سنہ خمس وخمسین ماتین بعد الف در کھمبایت بہ گل گشت، روضۂ رضواں خرامید، اگر چہ در زبان تازی ودری اشعار بسیار داشت، دور اردو عدم التفات می فرمود''۔2

ان کے نام سے صرف یہ ایک شعر درج ہے۔

توڑ کر دل کو مرے اٹھ کے چلا جاتا ہے اے صنم کس نے بتائی تجھے کعبہ شکنی

حواشی

1-تاریخ گجرات	ص275تا277
2-کتاب الہند جلد2	ص272
3-پنجاب میں اردو	ص38
4-ابتدائی نشونما	ص23
5-پنجاب میں اردو	ص171تا172
6-مخزن شعرا	ص111
احمد آباد	
1-مخزن شعرا	ص29
2-ایضاً	ص110
بڑودہ	
1-سخنوران گجرات	ص131
2-مخزن شعرا	ص109
3-ایضاً	ص71

بھڑوچ

1-مخزن شعرا ص73

2-ایضاً ص174

3-سخنوران گجرات ص133

4-مخزن شعرا ص41

5-ایضاً ص76

6-اردو مخطوطات علی گڑھ ص184

سچین

1-سخنوران گجرات ص129

2-مخزن شعرا ص94

3-ایضاً ص98

4-سخنوران گجرات ص130 تا 131

5-مخزن شعرا ص16 تا 17

6-ایضاً ص84

7-ایضاً ص80

8-ایضاً ص40

سورت

1-اردو مخطوطات بمبئی ص57 تا 58

2-مخزن شعرا ص85

3-ایضاً ص20

4-ایضاً ص29 تا 30

5-ایضاً	ص180
6-ایضاً	ص43
7-مجموعہ نغز جلد	ص149
8-مخزن شعرا	ص73
کھمبایت	
1-مخزن شعرا	ص87
2-ایضاً	14 تا 15

بمبئی

الف۔شاعری

1-سپاہی— شیخ داؤد 351

2-محی الدین 352

3-یوسف— محمد یوسف مرگھے 353

4-فاطمہ 355

(ب)نثر

357

1-عبدالقادر 357

2-غلام حسین 359

3-ابراہیم مقبہ 361

4-نظام الدین 364

5-یوسف مرگھے قاضی 365

6-صالح محمد 366

کوئی ڈیڑھ سو برس پیشتر تک اِس خطّہ کو مُنبئی کہتے رہتے تھے۔ بہادر شاہ ثانی بادشاہ دہلی کے وقت تک اس شہر کی بعض مطبوعات پر یہی قدیمی نام دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک تفسیر کے خاتمۃ الطبع کی عبارت اس طرح ہے:

''سپارۂ تبارک کا ترجمہ.... ہندوستانی زبان میں معمورۂ بندر منبئی میں ہوا اور مطبع محمدی میں ستائیسویں تاریخ شہر جمادی الاول 1264 ہجریہ مقدسہ (1848) کے اختتام کو پہنچایا''۔

ملک کی آزادی کی ایک مدّت کے بعد اس علاقے کا جدید نام بمبئی متروک ہوا اور رجعت پسندی نے قدیمی نام کو دوبارہ رواج دیا۔ باوجود اس کے کہ اس علاقے میں زبان اردو کو ''ہندوستانی'' کہتے تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں اردو نظم ونثر کے اعتبار سے اس خطّہ کو ایک قابلِ توجہ اور اہم مرکز کا درجہ حاصل رہا ہے اور یہاں نظم ونثر کی کم وبیش سبھی اصناف کے نمونے مل جاتے ہیں۔

بمبئی کے صاحبِ قلم گھرانوں میں اکثریت کوکنیوں کی تھی۔ یہ کوکن لوگ اصلاً عرب تھے۔ ان کی زبان اپنی اصل کے اعتبار سے تو مرہٹی ہی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن عربی، فارسی کے الفاظ ومحاورات کی کثرت کی وجہ سے وہ ہندوؤں کی مرہٹی سے الگ ہوگئی ہے۔ عربی النسل ہونے کی وجہ سے کوکنیوں کو شعر گوئی سے زیادہ دلچسپی رہی ہے۔

(الف) شاعری

1- سپاہی

ایک قدیم مثنوی قصہ بہرام وزہرہ کے ترقیمہ سے اس سپاہی کے بارے میں بعض مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں، وہ ترقیمہ یہ ہے:

''نوشتہ شدہ بتاریخ پنجم ماہ محرم الحرام روز پنجشنبہ سنہ 1268ھ، مالکِ ایں قصہ شیخ داؤد سپاہی گولنداز رتناگری والے، اگر کسے دعویٰ کند باطل است، نقل بموجب اصل شدہ است''۔1

ڈاکٹر میمونہ دلوی نے اس سپاہی کے حالات اس طرح تحریر کیے ہیں:

''پورا نام شیخ داؤد تھا، گولنداز خاندان کے ایک فرد تھے، یہ خاندان کوکن کا ایک مشہور خاندان ہے، اس کے افراد اب تک بمبئی میں موجود ہیں''۔2

خاندان کا نام بتاتا ہے کہ اس کے مورثِ اعلیٰ لشکر سے متعلق تھے، اور گولنداز ہونے سے اُن کے مَرتبے کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ شیخ داؤد کا تخلص سپاہی اس شخص کے پیشے کا مظہر معلوم ہوتا ہے، یہ شخص محرم 1268ھ (1851) تک علمی کاموں میں مصروف تھا، بعد میں کسی زمانے میں اس نے رحلت کی ہوگی۔

سپاہی نے ایک مسدس ترجیع بند کی صورت میں ''ماما حجانی اور مکان حاجی علی'' کی رونقوں کے بیان میں لکھی تھی۔ آخری بند میں اس نے سالِ تصنیف کا بیان کیا ہے۔

سَن جو بارہ سو یکاوَن کے بھیتر کیتا کلام — مہ جمادی الاوّلیں تاریخ دو یازدہ مدام
شب دوشنبہ کو لکھا ہوں میں مسدس اس تمام — سُن سپاہی کا بچن خوش ہو گئے ہیں خاص وعام
مت کرو اے جاں مرے دل کوں اپنے بے کلی — چل دیکھ توں ماما حجانی اور مکان حاجی علی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شب دوشنبہ جمادی الاوّل 1251ھ (1835) کو سپاہی نے یہ ترجیع بند مکمل کیا تھا۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کے بیان کے مطابق اس میں کُل تیئیس بند ہیں، پہلا بند یہ ہے۔

ایسے مبارک روز میں مجھ کو ملی ساعت بھلی — ہیں کئی دنیا میں صاحب شجاعت حق ولی
ان کی کرامت دیکھ کر کھل گئی مرے دل کی کلی — پایا مُراد اں دل کے سب، دور ہوگئی سب مشکلی
مت کرو اے جاں مرے دل کوں اپنے بے کلی — چل دیکھ تو ماما حجانی اور مکانِ حاجی علی

2-محی الدین

اس شاعر کی صرف ایک مثنوی دستیاب ہے۔ جس کا عنوان ہے ''قصہ تمیم انصاری''[3] اس میں ضمناً شاعر نے اپنے بارے میں اتنی بات بتادی ہے کہ وہ کوکن کے علاقہ میں سیرو ردھن کا رہنے والا ہے۔

خدا کے مُلک میں یک مُلکِ کوکن — ہے اس کوکن میں نام سیرودھن
اسے بھی پنج تن کا آسرا ہے — کہ جس کے آسرے ہر دوسرا ہے

معلوم ہوتا ہے کہ محی الدین باقاعدہ شاعر نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے کوئی تخلص اختیار نہیں کیا تھا، وہ ہر جگہ اپنے پورے نام کو تخلص کے طور پر نظم کرتا ہے، مثلاً

محی الدّین یو تجھ میں کیا سکت ہے — کرے اس کا صفت جو بے صفت ہے

مثنوی کی ابتدا ان شعروں سے ہوئی ہے۔

میں اپنے گام میں بیٹھا تھا یک دن — جہاں کے کام سے ہو دور لیکن
زیارت کو مرے احباب آئے — فریب شوق کا اسباب لائے

کہے یک دَم سخن سے کھول لب کوں　　نکو آزردہ کر توں سب کوں
جہاں میں یادگاری ہے سخن سوں　　نہیں ہے یادگاری جان وتن سوں

قصہ کا تعارف ان شعروں میں کرایا ہے۔

ہُوا ہے یک نوادر جگ میں قصہ　　او قصہ ہے یقیں تیراج حصہ
عبارت سے اٹھا کر نظم میں لا　　مبارک نظم سوں عالم کوں کو دکھلا
محمد مصطفاؐ کا اک مصاحب　　مدینہ سوں ہُوا یک بارغایب
مبارک نام اس کا تو تمیمؓ ہے　　لقب انصاری حضرت کا ندیم ہے

مثنوی کا سال تصنیف اس شعر میں بیان کیا ہے۔

سنہ ہجری سوں گذرے سو شمارہ　　جو بارا سو اُپر بارا بارا
1224=12+12+1200ھ

یعنی یہ مثنوی 1224ھ (1859) میں مکمل ہوئی تھی، اس کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں۔

تمیم اس دم ہوے ہیں بھونت شاداں　　قبول ان کا زیارت جو ہوا واں
سو پاکر وھاں سوں تب رخصت چلے ہیں　　سب اپنے گھر میں جا داخل ہوے ہیں
بحمداللہ تمیم نامہ ہُوا تَم　　بہ برکت مرتضا، سردارِ عالم

اس سے ظاہر ہے کہ شاعر نے اپنی نظم کا نام تمیم نامہ مقرر کیا تھا۔ اس مقام پر یہ ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت تمیم انصاری کا مزار سمندر کے کنارے مدراس شہر میں ہے۔ جنوبی ہند میں اکثریت وَان سے بڑی عقیدت ہے۔ چنانچہ ان علاقوں میں متعدد شاعروں نے ان کے قصے کو نظم کیا ہے، محی الدین کی مثنوی میں لفظ نکو (نہیں) اور تاکید کے واسطے حرف چ کا الحاق اس کے بولی کا اثر ہے۔ جملوں کی ساخت اور بیشتر لفظوں کا۔

3-یوسف

محمد یوسف نام، مہر گھے خاندانی لقب تھا، 1189ھ (1872) میں پیدا ہوئے۔ کم سنی میں ان کے والد محمد حسین کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے بھائی شیخ محمد عطاء الدین نے انھیں تعلیم وتربیت دلائی۔ ان کی وفات کے بعد تلاشِ معاش میں سندھ گئے واپس آئے تو ایسٹ انڈیا کمپنی

کے گورنر نے انھیں چیف قاضی آف بمبئی کا منصب عطا کیا۔ چوراسی سال کی عمر میں شب جمعہ ماہ محرم 1283ھ (1866) کو رحلت کی، تاریخ ہوئی ۔

وفائے زار رقم کرد سال آن زیکا 23

شب آدینہ و عاشورہ محرم بود 1260

1283

محمد یوسف مرگھے نے اردو نظم ونثر میں متعدد تصانیف چھوڑی ہیں:

(الف) زین المجالس: یہ حضرت عبدالقادر جیلانی سے متعلق گیارہ مجلسوں کا مجموعہ ہے۔4 تکمیل کی تاریخ ذیل کے شعروں میں نظم کی ہے۔

کیا ہوں اس کے تئیس جب میں نے اتمام ربیع الآخر تھا ماہ فرجام
تھے بارہ سو پہ پندرہ سالِ ہجرت کہ پایا حق سے یہ تائید ونصرت
1215

اسے اتمام کر دیکھتا ہوں پڑھ کر بہلنے کو لگا دل اس کے اندر
کیا تب فکر تاریخ مناسب کہا ہاتف نے وہ روضۂ مناقب
1215ھ

(ب) زینت المجالس: یہ مثنوی قطب کوکن مخدوم علی مہائمی کے حالات میں ہے5۔ چنانچہ ان شعروں میں مذکور ہے۔

بہت دن سے تھی آرزو مجھ کو یوں کہ ہندی میں ان کے مناقب لکھوں
جو ہیں قطب کوکن امامِ ہمام وے مخدوم صاحب معلّا مقام

اس کی تکمیل کا سال شاعر نے ان شعروں میں نظم کیا ہے۔

بخوبی ہوئی ایک مجلس تمام رکھا زینت المجلس اب اس کا نام
بتوفیقِ حق جب کیا لکھ کے بس تو تھے بارہ سو بائیس ہجری برس
1222

اس مثنوی کے شروع میں شاعر نے ایک مناجات اور ایک نعتیہ قصیدہ بھی شامل کیا ہے۔

مناجات کا آخری بند یہ ہے ۔

یوسف کے سب جرایم بخش اور درگذر کر　　بے حد ہُوا پشیمان اپنے کیے کے اوپر
رحمت سے اپنی تک دیکھا، اسی کی طرف نظر بھر　　ہوکر رجوع تجھ سے کہتا ہے یہ مکرر
اِنّی ظَلَمتُ نَفسی فَاغفِر لی یَا الٰہی

(ج) کفایت الاسلام: قاضی محمد یوسف کا مسلک شافعی تھا۔ انھوں نے 1250ھ (1834) میں فقہِ شافعی سے متعلق ایک منظوم رسالہ ''کفایت الاسلام'' کے نام سے دو حصوں میں لکھا تھا[6]۔ ہر حصے کو انھوں نے مقصد کہا ہے، پہلا مقصد عقائد اور دوسرا عبادت ہے ۔

مختصر یہ کفایت الاسلام　　ہے بیاں اس میں دین کے احکام
ہے مرتب جو دو مقاصد سے　　ایک مقصد تو ہے عقائد سے
ہے عبادات مقصدِ ثانی　　مجملاً مسئلے فقیہانی

مصنف کا کہنا ہے کہ یہ رسالہ انھوں نے محمد علی روشن اور محمد ابراہیم مقبہ کی فرمائش سے لکھا تھا۔ سالِ تکمیل اس طرح نظم کیا ہے ۔

یہ کہا رکھ قبولیت کی آس　　کہ تھے سنہ یک ہزار دو سو پچاس
1250
سال ہجرت سے ختمِ مرسل کے　　بارہویں دن ربیع اول کے

یوسف کی مثنویوں میں بھی مقامی لب ولہجہ اور تلفظ ہر جگہ نمایاں ہے۔

4-فاطمہ

یہ ایک قابلِ توجہ حقیقت ہے کہ میمن برادری کی اس زمانہ میں ایک خاتون شاعرہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ ان کا نام فاطمہ بنت محمد یعقوب ابنِ احمد عبداللہ ہے۔ انھوں نے محمد ابراہیم مقبہ کی خدمت میں ایک مختصر سی نظم جو بصورت مثنوی ''عریضۂ نیاز'' کے عنوان سے تاریخ بست ونہم شہر ذی الحجہ 1250ھ (1834) کو پیش کی تھی[7]۔ اپنی اس نظم میں شاعرہ نے اپنے وقت کے کئی نامور اور بااثر لوگوں کے نام لیے ہیں اور اس طرح اس کی افادیت زیادہ ہوگئی ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ اس شاعرہ کی کوئی اور تحریر دستیاب نہیں ہوسکی ہے۔ نظم کا عنوان اس طرح ہے:

''مطالعہ شریف جناب حضرت محمد ابراہیم صاحب لقبہ زاداللہ تعالیٰ عدلہٗ واحسانہٗ
عریضۂ نیاز منظومہ در زبانِ ہندوستانی''

فاطمہ نے اپنی زبان کو ہندوستانی کہا ہے اور اس کا یہ عریضہ بھی دستور کے مطابق حمد، نعت وغیرہ سے شروع ہوتا ہے۔

کروں حمدِ حق اور نعتِ رسولؐ　　صحابؓ اور حسنینؓ زہرہ بتولؓ
جو حمد ونعت دیکھا بے انتہا　　قلم تھر تھرا کر وہیں رہ گیا

فاطمہ نے اس نظم میں خود کو یتیمہ کہا ہے۔

قیامت تلک رہوے نام آوری　　کرو یتیمہ کی تُم بہتری

معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنا زر وزیور کسی کے پاس امانت رکھا تھا۔ اب وہ چاہتی ہے کہ اس کا وہ مال اسے واپس دلا دیا جائے۔

کہ زر ہے جو میرا سو دیویں مجھے　　تو عزت شریعت پناہ کی بڑھے
لیے جس طرح سے امانت بری　　اُسی طرح سے دیویں سلامت مری
مری درد مندی کی وارو کرو　　امانت میں تم کم نہ یک مو کرو

اچھی نظم ہے۔ بیان میں ہر طرح تسلسل قائم رکھا گیا ہے۔ زبان بھی صاف اور سریع الفہم ہے اردو میں جو منظوم نامے ملتے ہیں ان میں فاطمہ کا یہ نامہ بہت اچھا اور معلومات افزا ہے۔

نثر

بمبئی کے علاقوں میں نظم کے ساتھ ساتھ اکبر شاہ ثانی کے دور میں نثر بھی لکھی جا رہی تھی بلکہ صحیح یہ ہے کہ وہاں نثر لکھنے والوں کی تعداد زیادہ معلوم ہوتی ہے اور ہر قسم کے نثر کے نمونے اس خطے میں کم وبیش مل جاتے ہیں۔

1 - عبدالقادر

یہ اس زمانے کے ممتاز استادوں میں سے تھے معلوم ہوتا ہے کہ تکمیلِ علوم کے بعد اُنھوں نے معلّمی کا شغل اختیار کر لیا تھا۔ چند سال کے تجربے کے بعد تصنیف وتالیف کی طرف متوجہ ہوئے شروع میں فارسی میں لکھتے تھے، پھر اردو میں لکھنے لگے۔ شروع زمانے کی ان کی ایک تصنیف مخطوطہ کی صورت میں ملی ہے جس کا نام مقامع الحدید ہے اور اس کی زبان فارسی ہے، اس کے دیباچے میں ہے:

> ''سید عبدالقادر ابن سید اسماعیل ملکاپوری... چوں از مدت دوازدہ سال تا حال کہ یک ہزار ودوصد وبست ودو ہجری (1807) است اتفاق سکونت ایں حقیر پُر تقصیر در بندر معمورہ منبئی افتادہ''۔[1]

اسی کے حاشیہ پر کسی نے لکھا ہے:

''مفتی سید عبدالقادر والد ماجد مفتی سید حبیب اللہ ملکاپوری ثم رتنا گیری''۔

ان دونوں کو ملائیں تو معلوم ہوگا کہ

عبدالقادر کے والد سید اسماعیل ملکاپور کے رہنے والے تھے،

1210ھ (1795) میں کسی وجہ سے عبدالقادر کو ترک وطن کرنا پڑا اور وہ بمبئی میں آکر سکونت پذیر ہو گئے۔

انھوں نے اپنے بیٹے حبیب اللہ تک دولتِ علم کو منتقل کر دیا تھا اور بیٹا اور باپ دونوں مفتی تھے۔ بیٹے نے بمبئی کی سکونت ترک کر کے رتنا گیری میں اقامت اختیار کی۔ اسماعیل اور حبیب اللہ دونوں کی علمی مصروفیتوں کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہے۔

مفتی عبدالقادر کی اردو میں ایک نثری کتاب دستیاب ہے، جس کا نام ''من لچھن'' ہے، یہ بھی مخطوطہ کی صورت میں ہے۔ اس کے ایک نسخہ کا ترقیمہ درج ذیل ہے:

''بہ ید فقیر پُر تقصیر عفی اللہ عنہ وعن والدیہ بتاریخ دوازدہم شہر شوال ۔ 1250ھ (1834) اتمام یافت''۔

خیال کیا گیا ہے کہ یہ نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تسلیم کرنا چاہیے کہ مفتی عبدالقادر 1250ھ (1834) تک نہ صرف بقید حیات تھے بلکہ علمی کاموں میں مصروف بھی تھے۔ مفتی عبدالقادر کو اپنے بعض کوکنی شاگردوں سے بے وفائی کا شکوہ رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے من لچھن کی تمہید میں اس کا ذکر سخت انداز سے کیا ہے:

''میں نے بھی حتی المقدور اس علم کی خدمت میں کوشش کر کے آج تک قریب چالیس برس کے کہ بارہ سو چالیس ہجری (25-1824) ہیں، طالب علموں کو پڑھاتا رہا، پس اگر قسمت سے کسی کو علم حاصل ہوا نہ ہو تو نہ ہو۔ اما اکثروں کو حاصل ہوا ہے۔ لیکن ثمرہ سے علم کے محروم رہے ہیں، ان میں سے کیتک خصوصا کوکنی لوگ شیخ جی تلوجہ وغیرہ کہ اہلِ وفا تھے، اہلِ شقاق بن کر عاق ہوئے ہیں... اگرچہ یہ لوگ اپنے زعم میں ابن ملجم جیسا دینداری کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ لتادین کے علی کو قتل کرنے سے نہیں ڈرتے... پس اخوتِ اسلام کا حق ادا کرنے کے لیے اس کتاب کا ترجمہ کیا ہوں، تا طالب حق کا

اس سے مستفید ہووے"۔

یہ رسالہ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کے قول کے مطابق "تعلیم المتعلم" کا اردو ترجمہ ہے اور تیرہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ ہر فصل میں علم، تحصیل علم، معلم اور متعلم کے مسائل سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ اقتباسِ بالا میں ان مباحث سے قطع نظر ایک اور بہت اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے "علم کا ثمرہ"، یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ ہمارے زمانے میں اس پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اوپر کے اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ مفتی عبد القادر نے طالب علموں کو سنہ بارہ سو ہجری (1786) سے پڑھانا شروع کیا تھا۔ اگر اس وقت ان کی عمر بیس برس خیال کر لی جائے تو ماننا پڑے گا کہ وہ ستر برس سے بھی زیادہ مدت تک زندہ رہے تھے۔

مفتی عبد القادر نے اپنے رسالہ "من لیحضر" کی ابتدا ان کلمات سے کی تھی:

"حمد و ثنا اس قادرِ مطلق کی کیجیے کہ جس نے بنی آدم کو علم اور عمل کی خلقت بنا کر تمام عالم پر اس کی بزرگی اور شرف ظاہر کیا، اور رحمت کاملہ اور سلام اس خواجہ سالار پر بھیجیے کہ جس نے تمام عرب اور عجم کا قافلہ اپنی پناہ میں لے چلا"۔

اس رسالہ کے خاتمہ کے کلمات یہ ہیں:

"اور ضرور ہے کہ کچھ علم طب کا سیکھے اور طب کہ شیخ ابو العباس عنظری نے جمع کیا ہے، اسے خوب یاد کرے، وَالحمد للّٰہ رَبّ العالمین"۔

یہ نصیحت بڑی اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں علم طب کو مذہبیات کے متعلقات میں خیال کیا جاتا تھا اور ہر طالب علم کے لیے اسے لازمی سمجھتے تھے۔ مفتی عبد القادر کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک کلمہ 'تھے' کی تعیین ماضی کی علامت کے طور پر نہیں ہوئی تھی۔

2-غلام حسین

موجودہ صوبہ مہاراشٹر کے ضلع رائے گڑھ کی تحصیل مہاڑ کے یہ بزرگ رہنے والے تھے۔ اسی تعلق سے مہاڑی کہلاتے تھے۔ یہ کلمہ رفتہ رفتہ مہری ہو گیا۔ چونکہ اس گھرانے کے بزرگ

منصب قضاۃ پر فائز تھے، یہ لوگ قاضی کہلانے لگے تھے۔

قاضی غلام حسین مہری اپنے وقت کے ممتاز عالموں میں سے تھے۔ انھوں نے زبان اردو میں کئی نثری رسالے یادگار چھوڑے تھے۔ مثلاً شفاعت کبرائے نبیؐ، اور تحفۃ الاحباب وغیرہ، لیکن ان کا زمانہ کسی قدر بعد کا ہے۔ اکبر شاہ ثانی کے عہد کی ان کی صرف ایک نثری کتاب ملتی ہے، جس کا نام فقہ حسینی ہے۔ یہ کتاب 1242ھ (1826-27) میں کوئی چار سو چالیس صفحوں پر مکمل ہوئی تھی۔ مصنف کا بیان ہے کہ

> ''اکثر مسلمان تعلم و تعلیم علوم دینی کو ایک طرف چھوڑ کر امور معاش میں گرفتار ہیں، اور اکثر مسایل دینی سے جن کا فہم اور دریافت اور یقین ضروری ہے، محروم رہتے ہیں، بنابرآں اس فقیر حقیر کوتاہ تدبیر غلام حسین مہری نے ایک مختصر فقہ زبان ہندی میں... جمع اور تصنیف کیا... اور فقہ حسینی نام رکھا''۔

اسی سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ

> ''اس فقیر نے ترجمہ کتب معتبرہ فقہ مذہب سنیہ شافعیہ سے، چنانچہ تحفہ و شرح منہاج اور امداد شرح ارشاد وغیرہا کہ جو برخوردار سعادت یار فضیلت و بلاغت دست گاہ قاضی شہاب الدین مہری طال عمرہ وزاد علمہٗ کے لیے کیا''۔

افسوس ہے کہ یہ ترجمے دستیاب نہیں ہیں۔ اگر موجود ہوتے تو مترجم کی ابتدائی کاوش کے نمونے کی حیثیت سے قابل توجہ ہوتے۔

خاتمہ میں مصنف نے اس مسئلہ کی وضاحت کی ہے کہ اس نے ترجمہ یا تصنیف کا کام زبان ہندی میں کیوں کیا ہے:

> ''یہ مختصر اور معتمد زبان ہندی میں... تمام ہوا، اگرچہ زبان ہندی چنداں مشتہر نہیں ہے، اہل ہند کو اس کے سوا یہ کمال فہمیت حاصل نہیں ہے زبان عجمی خواہ فارسی یا دیگر ہو بمقابلہ لسان شریفہ عربیہ کہ لسان دہن نبوی ہے، یہ سب السنہ درجہ واحد میں ہیں، ان السنہ عجمی میں با یک دیگر کچھ فضیلت اور غیریت نہیں ہے، بلکہ جمیع محصلہ کو ان کی مادری زبان پہ فحوائے تکلم... بہت سریع الحفیظ اور معہود الذہن ہوتے ہیں، اس کے واسطے نفع

عام پر نظر دے کر یہ مختصر زبان ہندی میں تصنیف کیا"۔

اس کے بعد عربی میں یہ لکھا ہے:

"کانَ الفراغ مِن تبییض هذا المختصر فی سَلخ ذی الحجة الحرام سنه 1242ھ (1827)"۔

اس کتاب میں دوسو بیس ابواب اور فصلیں ہیں۔ ان میں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تجارت، نکاح، قصاص وغیرہ کے تفصیلات شافعی مسلک کے مطابق قلمبند کی گئی ہے۔ عبارت کا نمونہ یہ ہے:

"قرض یہ ہے کہ کسی کو ایک شے کا مالک کرنا کہ وہ بعد اس کے بدل دیوے، اور قرض دینا بڑی نیکی ہے، بلکہ احادیثِ صحیحہ میں آیا ہے کہ قرض دینا صدقہ سے افضل ہے۔ لہٰذا قرض لینے والا اس کو لے جا کر حرام میں خرچ کرنے والا ہووے تو اس کو قرض دینا حرام ہے۔

یہ زبان بہت صاف اور رواں بلکہ آج کل کی بول چال سے بھی بہت مطابق ہے اور اس بنا پر لائق قدر و تحسین ہے۔

3- ابراہیم مقبہ

مقبہ خاندان کا تعلق عراق سے تھا، اس خاندان کے سب سے پہلے فرد جن کے حالات دستیاب ہیں منشی محمد ابراہیم تھے۔ ان کا سال ولادت 1207ھ (1792-93) خیال کیا گیا ہے۔ وہ اوائلِ عمری میں ہی نو وارد انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے ڈرسوا کیڈٹ اسکول میں مقرر کر لیے گئے، انھوں نے عربی، فارسی، مرہٹی، گجراتی اور انگریزی وغیرہ کئی زبانیں سیکھ لیں اور بتدریج ترقی کر کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور بورڈ آف ایجوکیشن کے بھی ممبر ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے انھوں نے ایک سے زائد مدرسے قائم کیے۔ ان میں زیادہ شہرت قاضی محلہ کے مدرسہ کو ملی جو دارالمقبہ کے مدرسے کے نام سے مشہور ہوا۔

ابراہیم مقبہ نے مختلف زبانوں میں چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ اردو میں ان کی معروف کتابیں یہ ہیں:

(الف) الفنسٹن نامہ: کئی برس کے تجربہ کے بعد 1822 (1237ھ) میں انگریزوں کی تعلیم کے لیے ہندستانی قواعد ولغت کی کتاب مرتب کر کے لارڈ الفنسٹن کے نام سے اسے سوسوم

کیا تھا، یہ اسی زمانہ میں چھپ گیا تھا۔

(ب) تعلیم نامہ: یہ کتاب مصنف نے دو جلدوں میں مکمل کی تھی، اس طرح:

جلد اول - پہلا، دوسرا، تیسرا باب

جلد دوم - چوتھا، پانچواں باب

اس کے دیباچے میں مصنف نے کہا ہے:

"اس کتاب کا نام تعلیم نامہ ہے، لڑکوں کو ہندوستانی سیکھنے اور تربیت حاصل کرنے کے واسطے نیاز مند محمد ابراہیم مقبہ نے 1250ھ (1834) میں جزیرۂ معمورہ مُنبئی میں مرتب کیا"۔

(ج) کتاب انگلش آموز: تین جلدوں میں، انگریزی سیکھنے کے قواعد اردو میں لکھے ہیں، پہلی جلد کے دیباچے میں ہے:

"اس کتاب میں انگریزی صَرف ونحو کا بیان ہے کہ اس میں تین باب ہیں، سو ہر ایک باب میں کتنی ایک فصل ہیں، پھر اس میں انگریزی الفاظ کی لغت بھی ہے، پس اس نسخہ کا نام ترجمان صَرف ونحو انگریزی رکھا ہے، اس کو جزیرۂ معمورہ مُنبئی میں 1254 ہجریہ مقدسہ و1838 عیسویہ میں اس خاکسار محمد ابراہیم مقبہ نے انگریزی کتابوں سے ترجمہ کر کے لکھا ہے"۔

اس کتاب کی تیسری جلد کے دیباچے میں مصنف نے تحریر کیا ہے:

"صاحبانِ ذی شعور کے ضمیرِ پُرنور پر ظاہر ہووے کہ انگریزی زبان سیکھنے کا نسخہ، اس کا نام مبتدی زبانِ انگریزی، کہ اس کی تین جلدیں ہیں، ان میں سے یہ تیسری جلد ہے، اس میں انگریزی زبان کے صَرف ونحو کے ضروری قاعدوں کا بیان ہے، چنانچہ دوسری جلد کے پہلے باب میں ویسے تھوڑے قانون لکھے ہیں، گویا ان کی یہ شرح ہے، اور کتنے ایک ضروری چیزیں، خطوط وغیرہ بھی مرقوم ہیں، اور اس جلد میں چھ باب ہیں، پھر ہر ایک باب میں کتنی ایک فصلیں ہیں، ان کی فہرست اس نسخے کے آخر میں لکھی ہے.... یہ نسخہ جزیرۂ معمورہ مُنبئی میں 1255ھ (1839) میں نیاز مند محمد ابراہیم غفرلہ

ولوالدیہ نے مرتب کیا"۔

(د) رسالہ وضونماز:

ایک مدت تک اس قسم کی تعلیمی مصروفیتوں میں گھرے رہنے کے بعد محمد ابراہیم مقبہ نے مذہب کی تلقین واشاعت کی فکر کی۔ چنانچہ 1256ھ (1840) میں ایک رسالہ لکھا جس کی تمہید میں ہے:

"اب معلوم ہووے کہ یہ کتاب وضونماز کا چھوٹا سا جُز ہے، حضرت امام شافعی صاحب کے مذہب میں بچوں کو پہلے سیکھنے اور یاد کرانے کے واسطے، اس کا نام وضونماز کا مختصر بیان، اللہ تعالیٰ سب بچوں کو نیک توفیق بخشے اور علم نصیب کرے، آمین۔"

اس رسالے کی زبان سادہ سلیس اور بچوں کے لیے نہایت مناسب ہے۔ اس میں مصنف نے اسلام کے ارکان کا بیان کیا ہے۔

(ہ) نورالایمان:

رسالہ وضونماز کے ساتھ یہ مختصر رسالہ بھی شامل ہے، اس کے بارے میں مصنف کا بیان ہے:

"سوان دونوں کتابوں میں بچوں کو چھوٹ پن میں سیکھنے اور یاد کرنے کے واسطے بہت مختصر بیان ہوا ہے"۔

شروع میں یہ چند شعر لکھے ہیں۔

خدا ہے ایک اور سب کا ہے خالق — سبھی تعریف خاص، اس کو ہے لایق
وہ ہے خاوند سب چیزوں پہ قادر — جو کچھ چہتا ہے سب کرتا ہے ظاہر
خدا کے ہیں رسول افضل محمدؐ — خدا کے خلق میں افضل محمدؐ
تو ابراہیم پڑھ صلوات وتسلیم — نبیؐ اور آل و یاراں پر تعظیم
کہ بخشے ہم کو اب ایمان کامل — کرے نیکوں میں اپنے ہم کو داخل

یہ مختصر رسالہ چار ابواب میں منقسم ہے، اس طرح:

1-ایمان وعقائد کے بیان میں 2-اسلام کے بیان میں 3-حضرت رسول اللہ ﷺ کی آلِ مطہر واصحابِ مطہر کے مراتب وغیرہ کا تھوڑی ضروری معتبر باتوں کا بیان 4-حضرت محمد ﷺ کی معراج کا بیان۔

محمد ابراہیم مقبہ کی یہ سب کتابیں ان کے قائم کردہ مدرسوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ بعد میں ان کا منبئی کے اکثر مدارس میں رواج ہو گیا تھا۔

4-نظام الدین

اس زمانے کے بمبئی کے بیشتر اہلِ قلم کی طرح منشی نظام الدین کے حالات بھی تفصیلاً معلوم نہیں ہے۔ انھوں نے بھی زیادہ دلچسپی تدریس کے معاملات سے لی تھی، ان کی صرف ایک کتاب کا حال معلوم ہو سکا ہے۔ جس کا نام انشائے ہندی ہے۔ اس میں عرضی، پروانے، فرمان، اشتہار وغیرہ کے نمونے دیے گئے ہیں، سبب تالیف مصنف نے اس طرح بیان کیا ہے:

"..... کہ وہ اکثر یورپین لوگوں کو ہندی اور فارسی سکھاتا رہا، پونا میں اسکاٹ صاحب بہادر نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، انھوں نے ہر روز چار خط ہندی میں لکھنے شروع کیے، کئی مدت کے بعد خیال آیا اور انھیں جمع کر کے کتاب بنائی، اور اس کا نام انشائے ہندی رکھا"۔

خاتمۂ کتاب کے بعد یہ رباعی لکھی ہے۔

یہ انشائے ہندی ہوئی جب تمام　　تھے بارہ سو چالیس اے نیک نام
مگر پنج افزود تھے اس پہ تب　　ز سنِ رسالت علیہ السلام

1245=5+1240ھ

اس سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کا سالِ تکمیل 1245ھ (1829-30) ہے۔

انشائے ہندی کے ساتھ فارسی کتاب انشائے ہرکرن کا اردو ترجمہ بھی ملحق ہے۔ اس میں پانچ ابواب ہیں۔ یہ ترجمہ پہلے خطِ نستعلیق میں پھر خطِ شکستہ میں لکھا ہے تاکہ شائقانِ زبان اردو کو ہر شخص کے ہاتھ کی تحریر پڑھنے کی لیاقت حاصل ہو جائے۔

اس کتاب میں یہ مذکور بھی ہے کہ نظام الدین نے آب وہوائے مُنبئی کے مذمت میں بھی

چند شعر کہے تھے۔ وہ دستیاب نہیں ہو سکے۔ کہتے ہیں کہ بعد کے زمانے میں نظام الدین نے نقلیں وغیرہ بھی لکھی تھیں۔

5-یوسف:

شاعر کی حیثیت سے قاضی محمد یوسفِ مرگھے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے اردو نثر میں بھی کئی کتابیں لکھی تھیں جو دستیاب ہیں۔ افسوس ہے کہ ان کا زمانہ معلوم نہیں ہے، قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ شاید ان کی آخر زمانے کی تالیف ہونگی:

(الف) رمضان کی نماز:

ڈاکٹر میمونہ دلوی (خدا جنت نصیب کرے) نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

''یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس کا نام ''رمضان کی نماز وتر کا بیان'' ہے۔ اس رسالے میں قاضی صاحب نے بتایا ہے کہ دونوں فرقے (شافعی اور حنفی) کے مصلّیوں کی وتر کی نماز ماہ رمضان میں ایک ہی جماعت سے پڑھنا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل بھی ہے، یہ رسالہ 1263ھ (1847) میں شائع ہوا تھا''۔

(ب) تیسر القرآن:

اس کتاب کے قلمی نسخے کے سرورق پر کھٹکھٹے کا یہ نوٹ ہے:

''شرح کلماتِ قرآن از قاضی محمد یوسف مرگھے''۔

اور تمہید کی عبارت اس طرح ہے:

''معلمِ حقیقی نے اس احقرِ محض کو نعمتِ علم اور صفتِ حفظ سے سرفراز فرمایا،.... چاہتا تھا کہ اس کے شکریہ میں کوئی تفسیر عربی اور ترجمہ عجمی لکھے مگر چونکہ علمائے سلف ...اس سعادت عظیم کو بہ وجہ اتم حرز کر چکے تھے، عزمِ مصمم قلب مطمئن سے فتوا چاہتا تھا، بعد اصرار بسیار کے نفس ملہمہ نے یوں صلاح دی کہ تمامی لغات قرآن مجید اور فرقان حمید کے استنباط کر کے بہ طور فرہنگ کے مُبوّب اور مفصل لکھے، راقم السطور نے اس کو الہام غیبی سمجھ کر بعد ریاضت جلیلہ کے بیچ مدت قلیلہ کے بہ احسن وجوہ تمام کیا، اور نام اس کا تیسیر القرآن و تسہیل الفرقان رکھا''۔

مصنف نے مطالب کی ترتیب کا بیان اس طرح کیا ہے:

''ترتیب اس کتاب کی اوپر اٹھائیس باب کے ہے، اور ہر باب اوپر اٹھائیس فصل کے بہ اعتبار حروف تہجی مرتب ہے، نکالنا جس لفظ قرآنی کا منظور ہو پہلا اور دوسرا حرف اس لفظ کا دیکھ کر اس کے باب اور فصل سے نکالیں''۔

کتاب کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے:

''سبحان اللہ وبحمدہ۔ کہا بڑی شان ہے اس شہنشاہ بے پروا کی کہ کلام صمد خاص کو اپنے بندے بہ اختصاص پر نازل فرمایا''۔

مخطوطہ ناقص الآخر ہے، اس لیے ترقیمہ وغیرہ نہیں ہے، بہ صورت موجودہ یہ باب النون مع العین پر ختم ہو گیا ہے، اور کل ایک سو پینتالیس صفحے ہیں:

(ج) بیاض قاضی محمد یوسف:

یہ کوئی مستقل اور مربوط تالیف نہیں ہے۔ محض ایک بیاض ہے، ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کا کہنا ہے کہ:

''معلوم ہوتا ہے کہ مرتب کا مقصد ایسے عربی قواعد تیار کرنا تھا جن کی مثالیں قرآن مجید سے دی جائیں اور قرآن مجید کو سمجھنے میں ان سے مدد ملے لیکن بدقسمتی سے یہ کام پورا نہ ہو سکا۔ ادھورا ہی رہ گیا''۔

6- صالح محمد

ان کے حالات کچھ معلوم نہیں بجز اس کے کہ انھوں نے ایک کتاب ''جامع الحکایات'' ہندی کے نام سے تالیف کی تھی۔ اس کے دیباچہ میں انھوں نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے یہ ہے:

''یہ فقیر حقیر شیخ صالح محمد عثمانی اگرچہ مدت سے اس خطۂ خوش سواد دکھن میں وارد ہے اور کئی سال سے خدمت میں صاحبان عالی شان کے علاقہ رکھتا ہے، پر ان دنوں آنریبل گورنر الفنسٹن صاحب بہادر دام اقبالہ کے عہد میں کہ جن کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ اظہر من الشمس و شہرۂ آفاق ہیں۔

وہ حسن خلق میں گلِ عنبر شمیم ہے　　خوشبو سے جس کی باغ جہاں میں نسیم ہے
ابرِ کرم سے اس کے جہاں پُر بہار ہے　　اور مہرِ عدل اس کی سے ظالم دو نیم ہے
جس طرف یہ سکندر ذوالعزم رخ کرے　　ہمراہ اس کی فوج کے فتح عظیم ہے
ہتھیار باندھ جب کہ وہ ہو مستعدِ جنگ　　بھاگے ہزار کوس جو اس کا غنیم ہے

سن بارہ سو چالیس ہجری مطابق سن اٹھارہ سو پچیس عیسوی میں اس حقیر کو بندر منبئی میں آنے کا اتفاق پڑا تو یہ کتاب موافق مرضی جناب فیاض زمان نکتہ رس قدرداں یعنی کرنل کینڈی صاحب بہادر دام شمتہٗ کے تصنیف ہوئی۔ امید ہے کہ ان کی توجہ سے مطبوع عام وخاص ہو۔

کچھ نہیں آتا ہے میرے دھیان میں　　جو لکھوں میں وصف اس کی شان میں
مہر سے گر وہ کرے یک دم نظر　　سنگ ہو لعلِ بدخشاں کان میں
جو کوئی محتاج آیا اس کے پاس　　کردیا مطلب روا اک آن میں
ہند کی بولی میں ماہر اس قدر　　کب ہُو ایسا اہل ہندوستان میں
فی الحقیقت وہ ہے اہلِ امتحاں　　آزمایش سب کی اس کے گیان میں

آخر میں ''خاتمہ کتاب کی تاریخ میں'' کے عنوان سے مولف نے یہ عبارت تحریر کی ہے:

''اب یہاں سے یہ کتاب حکایت شیریں کلام کے ساتھ نظم ونثر کے انتظام پاکر بخوبی سرانجام کو پہونچی۔ ارادہ ہُوا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھا چاہیے کہ جس میں تاریخ بھی نکلے، دل نے کہا سیر عشرت اچھا نام ہے کیونکہ اس کتاب کے دس باب ہیں اور تاریخ سن بارہ سو چالیس ہجری اسی 1240
نام سے نکلتی ہے۔ پس سیر عشرت اس کا نام رکھا۔ لیکن جامع الحکایات سے یہ کتاب ماخوذ ہوئی اور عہد میں عیسویوں کے ترتیب پائی۔ اس لیے منظور ہوا کہ سن عیسوی بھی کہنا ضرور ہے۔ وہی لفظ جامع الحکایات کا اس کے نام سے ملایا تو سن اٹھارہ سو پچیس عیسوی اس سے نکلی:

سیر عشرت جامع الحکایات

1825=585+ھ1240

یہاں سے بس نہ لکھ زیادہ عبارت　　بتاریخ مسمّٰی سیر عشرت
ھ1240

اس اقتباس میں مولف نے جامع الحکایات کو اپنی کتاب کا ماخذ بتایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا نام جوامع الحکایات ولوامع الروایات ہے اور اس کا مصنف سدید الدین محمد بن یحییٰ بن طاہر بن عثمان العوفی البخاری الحنفی الاشعری تھا، وہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی اولاد میں تھا اور 628ھ (1231) میں شہید ہوا، وہ آخر عمر تک پیش آنے والے واقعات کو قلمبند کرتا رہا تھا۔

مولف عثمانی نے عوفی کی کتاب کے دس ابواب سے اپنی پسند کے مطابق حکایتیں منتخب کر لی ہیں۔ اپنی کتاب میں اس نے درج ذیل ابواب مقرر کیے ہیں:

پہلا باب عدل کا	دوسرا باب دور اندیشی کا
تیسرا باب بادشاہوں کی سیرت کا	چوتھا باب وزیروں کی عادت کا
پانچواں باب فراست اور تجویز کا	چھٹا باب وحدانیت کا
ساتواں باب مصاحبوں کا	آٹھواں باب حیا وعفو وہمت وصبر واخلاق کا
نواں باب کسب ونمک حلالی وگدائی کا	دسواں باب حسد وحرص کا

حکایتوں کے بیچ بیچ میں مؤلف نے اپنے اشعار شامل کیے ہیں اور ہر باب کے آخر میں پانچ شعر کی ایک غزل لکھی ہے۔

حواشی

1-اردو مخطوطات بمبئی ص287

2-بمبئی میں اردو ص103

3-اردو مخطوطات بمبئی ص193

4-ایضاً بمبئی میں اردو ص167 تا 172

ص84 تا 85

5-بمبئی میں اردو ص86 تا 87

6-ایضاً ص85 تا 86

داردو مخطوطات بمبئی ص133 تا 134

7- بمبئی میں اردو ص96

8-اردو مخطوطات بمبئی ص128

9- ایضاً ص129

10- ایضاً ص127 تا 128

11- ایضاً ص70

12- ایضاً ص35 تا 37

13-بمبئی میں اردو ص136

14- ایضاً ص57 تا 59 و ص

121 تا 126

15- ایضاً ص126 تا 127

16-ایضاً ص130

17-اردو مخطوطات بمبئی ص99تا100

18-ایضاً ص27تا29

19-جامع الحکایات ص1تا3

20-ایضاً ص159

21-مطبوعہ میں اس جگہ "چوالیس" ہے جو صحیح نہیں ہے۔

22-ایضاً-تعارف ص1تا2

دکن

1-حیدرآباد	375
2-اورنگ آباد	411
3- کرنول	419
حواشی	427

(1) حیدرآباد

(الف) شاعری

1-شاداں چندلال 376
2-نصیر شاہ محمد نصیرالدین 377
3-حفیظ شیخ محمد حفیظ 378
4-اویسی شاہ محی الدین 380
5-شرر مرزا جعفر 380
6-شہرت امیر بخش 380
7-آفاق میر فریدالدین 381
8-شہید میر احمد علی 381
9- مسرت شیخ وزیر علی 382
10-شہید غلام امام 383
11-حیدر محمد حیدر 385
12-طوفان غلام محی الدین 387
13-عقلاں غلام ولی 388
14-فیض میر شمس الدین 390
15-قاسم حکیم سید قاسم 393
16-لعل لعل شاہ 394
17-لچھمن راجا لچھمن لال 394

(ب) نثر

1-بابا قادری 397

2-حسین علی 400
3-رتن لعل 403
4-شاہ علی 404
5-محمد جعفر 406
6-محمد صالح 406
7-لاعلم 407
(ج) مطیع شمس الامرا 409

اورنگ آباد

1- شوق محمد علی 411
2- عمر معتبر خان 413
3-غلام نبی 414
4-ہرنگ عزیز اللہ 415

کرنول

1-سعید الدین 419
2-ظہور علی 421
3- شہسوار غلام حسین 421
4- جوہر ملک محمود 423
5-واقف باباشاہ حسینی 425
حواشی 427

دکن

(1) حیدرآباد

شاہ عالم ثانی کے آخری زمانے میں دکن کے علاقے میں اکبر علی خاں سکندر جاہ آصف جاہ ثالث حکمراں تھے۔ 1221ھ (1806) میں شاہ عالم کی وفات کے بعد دہلی میں اکبر شاہ ثانی تخت نشیں ہوئے۔ انھیں کے عہد میں 1244ھ (1828-29) میں سکندر جاہ نے وفات پائی۔ کسی نے تاریخ کہی۔

ع پسند حیف سکندر نکرد آبِ حیات

ان کے بعد فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ آصف جاہ رابع مسند نشیں ہوئے اور یہ 1273ھ (1855-56) تک برسرِ حکومت رہے۔ ان دونوں حکمرانوں کے دور میں علوم وفنون کو خوب ترقی ہوئی۔ اس زمانے میں ہندوستان میں شعر وسخن کے تین مرکز مانے جاتے تھے۔ دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد بلکہ دہلی کے بعض باکمال سفر کی صعوبتیں اٹھا کر یہاں آتے اور دربارِ آصف جاہی کی نوازشوں اور عنایتوں سے فیضیاب ہوتے تھے۔ اس زمانے میں حیدرآباد میں مقامی شاعروں اور نثر نویسوں کی بھی کثرت تھی لیکن ان کی دلچسپیاں عموماً وہی تھیں جو دلّی والوں کی تھیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ لکھنؤ سے رابطہ نہیں تھا۔ لیکن اہلِ لکھنؤ کے حیدرآباد کے علمی ماحول پر بہت زیادہ

اثرات یقیناً نمایاں نہیں تھے۔

آصف جاہ ثالث اور آصف جاہ رابع کی شعر گوئی کا ثبوت نہیں مل سکا ہے لیکن ان دونوں کی شعر و سخن سے دلچسپیاں ظاہر ہیں۔ ان کی خدمت میں منظوم عرض داشتیں پیش کی جاتی تھیں اور دربار میں قصیدے پڑھے جاتے تھے۔

1-شاداں

چندولال نام قوم کے کھتری تھے۔ 1175ھ (1761-62) میں پیدا ہوئے۔ اپنی محنت اور لیاقت کی بدولت ترقی کرتے گئے۔ 1212ھ میں خطاب راجا بہادر اور 1235ھ (1820) میں مہاراجا سے سرفراز ہوئے، ناصر الدولہ مسند نشیں: دئے تو چندولال راجۂ راجایاں ہوگئے، 1260ھ میں وہ ملازمت سے الگ ہوگئے اور 1261ھ (1845) میں رحلت کر گئے۔ وہ اپنے ولی نعمت کے ہمیشہ مدّاح رہے، کہتے تھے۔

دعا ہے شاہ سکندر سدا رہے شاداں کہ جس کے لطف سے ہے ہم کو فارغ البالی

شاداں کی کیا مجال ہے جو کر سکے بیاں مت پوچھ وصف اُس شہِ گردوں رکاب کے

ان کے حالات میں شاداں کی یہ رباعی بھی لائقِ توجہ ہے۔

جو جُرم کیا ہم نے سو کر اب کے معاف گو ہم سے ہُوا ہے ترے فرماں کے خلاف

ہے تجھ کو سزاوار سراسر بخشش کس کا ہے یہ منہ تجھ سے جو چاہے انصاف

شخصی حکومت میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ آصف جاہ رابع مسند نشیں ہوئے تو چندو لال خدمت سے الگ کر دیے گئے لیکن پھر کامیابی حاصل ہوئی اور وہ ترقیوں سے سرفراز ہوئے۔ چندولال کی شاعری کے بارے میں نصیر الدین نقش نے لکھا ہے:

''شاداں تخلص، مہاراجا چندولال ستونی، مدار المہام سرکار آصفیہ خلف نارائن داس کھتری باشندہ رائے بریلی شاگرد شاہ نصیر دہلوی با وصف ہجوم کار وزارت بدیں مایل وقدر دان اہل فن، لاسیما سخنوران بہ غایت در مقام التفاتے بود، کہ می باید و شعرائے نامدار مثل شاہ نصیر و طوفان وغیرہ بہ مدحش رطب اللسان بودہ اند و بسیار ستودہ روی بہ جایزہ ہا مراعات نمودہ و مدام محفلِ مشاعرۂ نیم شبے ترتیب می داشت، گویند کہ تخلص مذکور

از حکیم دانا نامی بہ جلد دے دو ہزار روپیہ دیک دو شالہ ابتباع نمودہ، دو دیوان فارسی وہندی میدارد"۔

اردو کے دو دیوان سکندر جاہ کے زمانے میں مرتب ہو گئے تھے۔ چنانچہ عابد علی بیگ ظہور نے دیوان دوم کی تاریخ کہی تھی۔

جس کی نظیر ہووے نہ آفاق میں ظہور　　تاریخ اس کی کیوں نہ ہو دیوان بے نظیر

1243ھ (1827-28)

مہاراجا چندو لال شاداں اس کے بعد بھی ایک مدت تک زندہ رہے تھے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ان کا بہت کلام غیر مطبوعہ نہ رہ گیا ہو۔ وہ آخری عُمر کا کلام یقیناً بہت بہتر اور وقیع ہوگا۔

چندو لال اس زمانے کی روایت کے مطابق غزل گو شاعر تھے۔ ان کے مطبوعہ دیوان میں غزلوں کے علاوہ چند رباعیاں، ایک قصیدہ، ایک مخمس اور چند قطعے ہیں، ان کی ذاتی دلچسپی اس جوار میں ان اصناف کے فروغ کا سبب بن گئی تھی۔

2۔ نصیر

شاہ محمد نصیر الدین عُرف میر کلّو دہلی کے باکمالوں میں سے تھے۔ نقش نے اپنے تذکرہ میں ان کے بارے میں بعض اہم اطلاعات قلمبند کی ہیں:

"نصیر تخلص، شاہ نصیر الدین عرف کلّو میاں دہلوی، از شاہجہاں آباد قصیدہ کہ مطلعش

اینست۔

گو ہیں سپر، تیغ وسناں شمس و ہلال و کہکشاں　　پر ہیں ترے قبضہ میں ہاں، شمس و ہلال و کہکشاں

ناہشتاد شعر نوشتہ در خدمت مہاراجا چندو لعل شاداں فرستاد، راجا موصوف در جایزہ اش دو ہزار روپیہ تبلیغ داشتہ، متکلف قدم رنجہ فرمائی ایں طرف شدند، شاہ موصوف جواب نوشت اگر بدرقہ بفرستید خواہم آمد، راجا موصوف پانزدہ ہزار روپیہ برائے زاد راہش فرستادند، آنگاہ شاہ موصوف در بلدہ حیدر آباد رسید بہ ماہوار یکہزار و دو صد روپیہ مامور شد و دربار یافتگان راجا موصوف عز امتیاز حاصل کرد، بعد ماندن دو نیم سال مستدعی رخصت از راجا موصوف گردید، گفتند کہ چرا می روید و چہ تکلیف است، شاہ موصوف

گفت کہ در ماندن ہیچ از الفاظ کی دیھی زبانم کوڑہ خواہد شد، راجا موصوف پانزدہ ہزار روپیہ زاد سفر عنایت فرمودہ مرخص کردند، بہ اکثر معمور ہائے مشہور مثل لکھنؤ و بنارس وغیرہا رفتہ، با شعرا مشتہر ہر دیار مطارحہ و مشارعہ کردہ بہ استادی نام برآوردہ وزمین ہائے سنگلاخ طرح ی کرد کہ بہ دیگراں در بندش آں دقت روی داد و در دہلی وفات یافت، در تذکرۂ نوشتہ کہ نصیر تخلص پیرزادہ از اولاد میر صدر جہاں و در دیگر تذکرہ گفتہ کہ یکے از خلفائے میر صدر جہاں است، واللہ اعلم بالصواب"۔

ڈاکٹر زور نے ان کی وفات کے بارے میں لکھا ہے:

"آخر زمانے میں لکھنؤ اور حیدرآباد کے کئی سفر کیے اور آخر کار حیدرآباد ہی میں 1254 (1838) میں وفات پائی۔ ان کی قبر واقع درگاہ سید موسیٰ شاہ قادری پر ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے سنگ مرمر کا کتبہ لگا دیا گیا ہے"۔

شاہ نصیر کا جو کلیات چھپا ہے اس میں حیدرآباد کے قیام کے زمانے کا کلام غالباً شامل نہیں ہے۔ ورنہ جیسا کہ نقش نے بیان کیا ہے انھوں نے چندو لال کی مدح میں قصیدے ضرور کہے تھے۔ ممکن ہے کہ آصف جاہ ثالث و آصف جاہ رابع کی مدح میں بھی قصیدہ کہے ہوں۔ حیدرآباد میں ان کے کلام کا جو انتخاب تیار کیا گیا تھا اس میں یہ اشعار ہیں۔

دیکھنے جب اپنی صورت وہ پری پیکر لگا — بن گیا آئینہ جوگی منہ کو خاکستر لگا
چشم نقش پا سے ہیں پامال حسرت دیکھیے — گوشۂ داماں کو اپنی اور ہی ٹھوکر لگا
نہ کیونکہ شب رہا ہالہ نشیں ہو حلقہ بگوش — بلا یہ کان کے بالے تمھارے پلتے ہیں
غزل اک اور بھی کہہ اس زمیں کی کہ نصیر — زباں سے شعر ترے خوب تر نکلتے ہیں

3- حفیظ

شیخ حفیظ دہلوی اپنے وقت کے استادوں میں تھے۔ حیدرآباد کی قدر دانیوں کا حال سن کر یہ بھی وہاں چلے گئے تھے نواب شیفتہ نے مختصراً ان کے بارے میں لکھا ہے:

"حفیظ تخلص، محمد حفیظ نام، از دہلویانست، اصلاح شعر از حکیم قدرت اللہ خاں قاسم گرفتہ، بہ خواندن مراثی بہ طرز دلپذیر شہرۂ شہر بودہ، کمتر از سال است کہ زیر خاک شد"۔

نصیرالدین ہاشمی نے ان کے حالات اس طرح تحریر کیے ہیں:

''شیخ محمد حفیظ نام، حفیظ تخلص، دہلی وطن مگر حیدرآباد آکر بود و باش کرلی، مہاراجا چندو لال کے درباری شاعر تھے۔ اوّلاً اورنگ آباد کے راجا مہت رام کے متوسّل ہوئے تھے۔ ان کے زمانے میں تین شاعر استادِ سخن تسلیم کیے جاتے تھے، شیخ ذوق دہلی میں۔ شیخ ناسخ لکھنؤ میں اور شیخ حفیظ دکن میں''۔

ڈاکٹر زور نے ان کے حالات میں اچھا اضافہ کیا ہے، مختصراً یہ ہے:

''مہاراجا چندو لال نے ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کردی۔ شیخ حفیظ نواب سکندر جاہ کے دربار میں بھی باریاب ہوئے تھے، اور یہ رباعی نذر کی تھی۔

کوئی نام خدا ے کے حرم تک پہونچا　　کوئی پوجتے ہی دیر صنم تک پہنچا
خوش طالعی میری ہے کہ لیکر میں نذر　　تجھ رشکِ سکندر کے قدم تک پہنچا

بڑے نفیس مزاج، قلندر منش اور فیض رساں بزرگ تھے۔ حیدرآباد میں ان کے سینکڑوں شاگرد تھے، شیخ حفیظ 1247ھ (1831-32) میں فوت ہوئے اور غالباً دائرہ میر محمد مومن میں دفن ہوئے''۔

نصیرالدین نقش نے ان کے حالات میں بعض مختلف باتیں تحریر کی ہیں:

''حفیظ تخلص، شیخ حفیظ الدین شاگرد شیر محمد خاں ایران از مردم قصبہ ادھونی من مضافات بلدۂ حیدرآباد، از یاوری بخت در جرگہ شعرائے راجا چندو لال شاداں ملازم و مصاحب بود و باشاہ نصیر وغیرہ مشاعرہ و مطارحہ کردہ، دو دیوان دارد، ملاحظہ شدہ، طبیعت بسیار پُر روانی و پُر زور، ماورائے زلات اقدام سخنوری بعض ابیات خوش و خرم افتادہ''۔

صحیح نام وہی معلوم ہوتا ہے جو شیفتہ وغیرہ نے لکھا تھا۔ شمالؔ سے اگر حفیظ ادھونی میں بھی رہے ہوں گے لیکن وہاں کے رہنے والے وہ نہیں تھے۔ سعادت خان ناصر کا کہنا ہے کہ رائے بریلی کے رہنے والے تھے، خود حفیظ نے اتنا کہا ہے کہ

اردوے خاص کیوں نہ ہو میری زباں حفیظ　　ساکن ہوں ملک ہند ہوں، اہل دکن نہیں

ممکن ہے حفیظ نے ایمان سے کسب فیض کیا ہو لیکن اس کے لیے کوئی اور شہادت فی الوقت دستیاب نہیں ہے۔ حفیظ کے درج ذیل شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مرزا علی لطف اور شیخ ناسخ سے بھی کسب فیض کیا تھا۔

حفیظ الطاف ہے مرزا علی لطف کا مجھ پر　　سبب یہ ہے کہ بندہ ہوں جناب شاہ مرداں کا

ناسخ نے مہربانی کیا مجھ پہ سرسری کی　　تھا آفتاب تاباں، اک ذرّہ پروری کی

سُنا جو لطف نے فرمایا آفریں اس کو　　حفیظ شعر بھی کہتا ہے اور سپاہی ہے

ہوسکتا ہے کہ راجا سیتا رام کے یہاں وہ سپاہی کی حیثیت سے ملازم رہے ہوں۔

حفیظ کے دو دیوان مرتب موجود ہیں، لیکن ان کو اب تک چھپنا نصیب نہیں ہوسکا ہے۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق تو قناعت پسند شخص تھے۔ دکن کے حالات سُن کر انھوں نے کہا تو یہ کہا کہ۔

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن　　کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

لیکن دلّی کی گلیوں کو چھوڑ کر دکن کی طرف جانے والوں کی تعداد کچھ بہت کم نہیں تھی۔ یہاں بعض کا مختصر اذکر کیا جاتا ہے۔

4-اویسی

اویسی تخلص شاہ محی الدین، از مشائخ زادگان بریلی است، رخت بہ دکن کشیدہ اوراست۔

باغ میں گلعذار ہوں، فصل بہار ہو نہ ہو　　میں ہوں غزل سرا وہاں، بلبل زار ہو نہ ہو

5-شرر

شرر تخلص، مرزا جعفر کہین برادر حکیم مرزا محمد المتخلص بہ عشق از مردم دہلی است، بہ حیدرآباد رفتہ عازم پیشتر گشت یعنی ازیں دار فنا رخت سفر بربست، اوراست۔

اے عشق جگر سوز، شرر کی تجھے سوگند　　اک شعلۂ جان سوز کہ مشتاق فنا ہوں

6-شہرت

شہرت تخلص، امیر بخش نام، پسر عیسیٰ خان، ہمراہ پدر بہ دکن رفتہ، بہ ذریعۂ شاعری ملازم سرکار، دیوان چند و لعل گشت وصلہ ہا یافت و نوجواں مُرد، کسب فنون نظمیہ از ثناء اللہ خاں فراق کردہ"۔

یہ استاد بھائی میر فرید الدین آفاق کے تھے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان دونوں نے ایک سے زائد منظومات مل کر مکمل کی ہیں۔ ایک موقع پر افسر امروہوی نے لکھا ہے:

''دانش افروز، کاشفی کی کلیلہ دمنہ کا منظوم ترجمہ جس میں پندرہ ہزار سے زائد ابیات ہیں میر آفاق اور شہرت کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ ہے، شہرت کا توسل پہلے شہریار الدولہ کے یہاں ہوا، پھر نواب شمس الامرا کے یہاں بہ صیغۂ شاعری مقرر ہوئے، عیسیٰ خاں نواب رفعت الملک کی سرکار میں ملازم ہوئے''۔

دوسرے مقام پر موصوف نے ہی اطلاع دی ہے کہ:

''فارسی منطق الطیر کا منظوم ترجمہ ہے، جسے فرید الدین آفاق اور امیر بخش شہرت نے مل کر نظم کیا ہے''۔

پہلا ترجمہ 1221ھ (1806) میں اور دوسرا 1271ھ (1812) میں (مکمل ہوا تھا) شیفتہ نے شہرت کو چندو لال کا ملازم لکھا ہے۔ یہ محض بر بنائے شہرت معلوم ہوتا ہے اور غالباً صحیح نہیں ہے۔ بعد کے تذکرہ نویسوں نے انھیں کی اتباع کی ہے۔

7-شہید

نصیر الدین نقش نے ان کی بہت تعریف کی ہے لیکن ان کے بارے میں اطلاعات برائے نام قلمبند کی ہیں:

''شہید تخلص، میر احمد علی، اصلش از شاہجہاں آباد، شاگرد شاہ نصیر دہلوی، در فارسی دفنون زکیہ مہارتے می دارد، مشق سخن بسیار حاصل بخی کہ بشک مخزی اشتہار یافت، واز سر خیال ممتازی داشتہ، کوس لمن الملک می نوازد، آرے ایں بادہ بہ ہمیں طرف میلان داشت''۔

میر احمد علی سکندر جاہ کے زمانے میں حیدر آباد آئے تھے۔ پھر یہیں کے ہو رہے۔ طویل عمر پائی، اور 1292ھ (1875) میں رحلت کی۔ ان کے دیوان کا مخطوطہ جو کتب خانہ آصفیہ میں ہے کوئی پونے تین سو صفحوں پر محیط ہے۔ شروع میں یہ رباعی ہے ۔

اے ذات تیری مطلع دیوانِ وجود ہر بود و نمود کو تجھی سے ہے نمود
جب تک تو حجاب گنج اَنا میں رہا بے پردہ ہُوا نہ شاہد گفت و شنود

اس کے بعد نثر میں دیباچہ لکھا ہے، جس میں شہید نے اپنے حالات مختصراً بیان کیے ہیں۔ یہ دیباچہ دس صفحے کا ہے:

''جب نواب ناصر الدولہ بہادر ابن سکندر جاہ نے 1244ھ (1828-29) میں جلوس فرمایا تو ریاست پر بیٹھے، تمام منصب داران کو بلایا اور مخاطب کیا اور مصاحب بنایا، فقیر بھی حسب الطلب دربار میں آیا، اور اضافۂ خلعت و قربیت و صحبت سے فائدہ اٹھایا''۔

ناصر الدولہ نے شہید کو امیر الشعرا کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ان کا دیوان اس رباعی پر ختم ہوتا ہے۔

یارب ترا اقبال عدو سوز رہے　　شب عید، برات روز نوروز رہے
دولت تری ایک شمع ہے اے آصف جاہ　　روشن یہ شمع عالم افروز رہے

اس کے دو صفحوں پر ناصر الدولہ کی وفات اور افضل الدولہ کی مسند نشینی سے متعلق قطعات تاریخ درج ہیں۔ اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ آصف جاہ ثالث اور آصف جاہ رابع دونوں علم دوست اور شعرا پرور تھے۔ زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ان کے ملازمین کے نام تو زبانوں پر جاری ہیں لیکن خود ان کی علوم پروری کی طرف جیسی کہ چاہیے توجہ نہیں کی گئی ہے۔

8-مسرت

نواب شیفتہ نے مسرت کے بارے میں اختصار کے ساتھ لیکن ضروری اطلاعات قلمبند کر دی ہیں:

''مسرت تخلص، شیخ وزیر علی، استفادہ شعر از حکیم عزت اللہ خان عشق کردہ، از باشندگان دہلی است، از چند سال بہ حیدر آباد رفتہ، بہ جرگۂ شعرائے چند دلال است''۔

یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ زمانے نے بہت جلد ان کو عملاً فراموش کر دیا۔ چنانچہ نصیر الدین نقش نے لکھا ہے:

''مسرت تخلص، میر وزیر علی، از ہند فایز ایں بلدہ فرخ شدہ بود، در ینولا از حقیقتش آگہی

نیست''۔

لکھنؤ سے دکن کے علاقوں میں پہونچنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ معلوم نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ چندولال نے شیخ امام بخش ناسخ کو دعوت دی تھی۔ لیکن وہ بھی کالے کوسوں کے سفر کے لیے آمادہ نہیں ہوئے اور کبھی کانپور کبھی الہ آباد وغیرہ مقامات پر پڑے لکھنؤ کو یاد کرتے رہے

9-شہید

پورب کے علاقوں سے جا کر حیدرآباد میں ملازمت اختیار کرنے والوں میں یہ بڑے نامور تھے۔ نقش نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''شہید نامیش غلام امام، از گراں گوشی ازیں بلدہ شہرت یافتہ اند، از مردم اکبرآباد بہ ذریعہ محمد یار خان محی الدولہ مرحوم در سرکار آصفیہ ملازم شدہ، دریں بلدہ سکونت می دارند ودر ہندی اہل لسان ودر فارسی شاگرد مرزا حسن قتیل اند ودر عشق حبیب رب از اہل قال وہم صاحب وجد وحال اند وبر اصناف سخن فے الجملہ قدرتے داشتہ، لا سیما مثنویات بلال وحنانہ کہ مشہور ست نیکو گفتہ، قطع نظر از پالغزہائے شاعری بہ محاورہ عوام بد نہ گفتہ بلکہ داد بلاغت دادہ''۔

شہید اٹیٹھی کے رہنے والے تھے۔ شاہ غلام محمد کے بیٹے تھے۔ اردو میں شیخ مصحفی کے شاگرد تھے، محی الدولہ کی طلب پر حیدرآباد گئے اور کئی برس تک سالار جنگ اول کے دارالانشا میں ملازم رہے۔ لمبی عمر پاکر 1296ھ (1879) میں وفات پائی۔ کلیات کے علاوہ رسز الشہادتین انشائے بہار بے خزاں اور مولود شریف شہید ان سے یادگار ہیں۔ ان کی جن مثنویوں کا ذکر نقش نے کیا ہے افسوس ہے کہ ان کا سال تصنیف معلوم نہیں ہے۔ دونوں مثنویاں یعنی قصہ حضرت بلال اور قصہ حضرت حلیمہ دونوں ایک ساتھ بنگلور سے 1292ھ (1875) میں چھپ کر شائع ہوئی تھیں۔ مثنوی بلال کے ابتدائی شعر یہ ہیں۔

دل سے سنو دوستو یہ داستاں　　لکھتا ہے یوں راوی رنگیں بیان
عشق ومحبت کی نشانی ہے یہ　　عاشق صادق کی کہانی ہے یہ
ایک موذن تھا نبیؐ کا بلالؓ　　ہجرت سے اس مہ کی گھٹا جوں ہلال

اور دوسری مثنوی ان شعروں سے شروع کی ہے۔

جن وانساں ، ملک وحش وطیور　　سب کے سب آپ کے تھے طالب نور
ایک عاشق تھی حلیمہ دائی　　جس نے گھر بیٹھے یہ دولت پائی
وہ کچھ اس رمز سے آگاہ نہ تھی　　اس کی قسمت میں یہ دولت تھی لکھی

غلام امام شہید کے فضل وکمال کے باوجود حیدرآباد کی غزل گوئی پر ان کا کوئی خاص اثر معلوم نہیں ہوتا۔

حیدرآباد کے مقامی شاعروں میں سے بعض نے شاہ نصیر وغیرہ کے اثر سے غزل گوئی اختیار کرلی تھی لیکن بیشتر نے مثنویاں لکھ کر ہی نام پیدا کیا۔

10-حیدر

اس شخص کا اصل نام غالباً محمد حیدر تھا۔ شاہ رفیع الدین قندھاری اور ان کے خلیفہ رحمان شاہ سے بیعت کے بعد فقیر اللہ شاہ لقب اختیار کیا۔ ایک جگہ اس نے اپنے تعارف میں لکھا ہے:

''فقیر اللہ شاہ بن محمد سنگی عفی عنہما پابوس سلسلۂ عالیہ قادریہ بدساعت یَدُ اللّٰہِ فَوقَ اَیدیھم کے، قدم گیر حضرت رحمان شاہ بن محمد بشیر قدس سرہٗ دخو پذیر حضرت شاہ رفیع الدین بن شمس الدین الدکھنی القندھاری رحمت اللہ علیہ کا''۔

اس نے زیادہ عمر حیدرآباد، گلبرگہ، ورنگل اور قندھار شریف وغیرہ مقاموں کی سیر وسیاحت میں گذاری تھی۔ حیدر کی دو کتابیں ملتی ہیں۔

1۔ تناولی: فقیر اللہ شاہ حیدر نے اپنی اس داستان کے سبب تالیف میں بیان کیا ہے کہ:

''مدت متمادی سے کتاب بکاولی کا چرچا ممالک محروسہ دولت مدار فیض آثار کے درمیان بہوت ہے..... فقیر کو اس کتاب کے مطالعے کا شوق بھی از حد..... ہوا۔ بفضلِ خدا ایک روز او کتاب ناگاہ مدرسہ حیدرآباد میں دیکھنے میں آئی، جب مشائخ لاڈلے حسینی بن قبول اللہ حسینی اور بہادر حسینی سلمہٗ اللہ تعالیٰ قلعہ ورنگل میں تشریف فرمائے، فقیر ملازمت ان سے حاصل کر کچھ اِدھر اُدھر کی گفتگو میں تذکرہ کتاب بکاولی

وچہار درویش کا بھی موافق استماع کے لکالتے ہی صاحبان ممدوح فرماتے کہ ہمارے
یہاں یہ دو کتابیں حاضر ہیں، ہم تمھیں عنایت فرماتے ہیں"۔

اور

"کتاب زبان اردو میں اور اس فقیر کو کم واقفیت اس زبان سے، پس خدمت والا میں
انھیں کے بیٹھ پڑھنا شروع کیا، انھوں نے کچھ تعلیم کر فرمائے کہ مجھے خوب اس زبان
میں درک نہیں.... فقیر سات آٹھ روز کے عرصے میں بکاولی اور چہار درویش کہ دونوں
ایک ہی جلد میں تھے دیکھ لیا، بارے کچھ کچھ اس زبان سے واقفیت ہوئی، اور چہار
درویش والا تو کیفیت اس زبان کی لکھتا تھا کہ لشکری زبان ہے۔ زبانِ اردو اور اردو
لشکرِ خاص بادشاہی کو کہتے ہیں"۔

ان اقتباسوں سے ظاہر ہے کہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی کتابیں اس زمانے میں حیدرآباد تک پہنچ رہی تھیں۔ زبان کے لیے لفظ اردو کا استعمال شروع ہو گیا تھا لیکن اہلِ حیدرآباد اس زبان کو اپنے لیے غیر سمجھنے کے باوجود اس سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق رکھتے تھے۔ اسی صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ دہلی اور اس کے قرب وجوار کے لوگوں کی حیدرآباد میں پذیرائی ہوتی تھی۔

حیدر نے قصہ بکاؤلی (مذہب عشق) کے طرز پر اپنی داستان تناولی لکھی تھی، وہ چاہتا تھا کہ اس کے قصہ کو بکاؤلی کی برابری کا درجہ حاصل ہو جائے، اس زمانے کے دستور کے مطابق اس میں جابجا مصنف نے واقعات اور معاملات کو مثنوی کی صورت میں بھی لکھا ہے۔ اس میں کُل بتیس داستانیں (فصلیں) ہیں۔ حصہ نثر کا اختتام ان کلمات پر ہوا ہے:

"وردِ اکبر کا دورہ تسبیح میں پھر (پڑھ) دَم کرنے آوے، کہا اب شاہزادہ نہ پیدا ہوا ہے
نہ پیدا ہوگا اور دنیا بہ.....نہ لوٹائے گا"۔

یہ کتاب مصنف نے 1244ھ (1828-29) میں لکھی تھی۔

2۔ نظم انور: ڈاکٹر زور نے اس کے تعارف میں جو لکھا ہے مختصراً اس طرح ہے:

"یہ دو ہزار سے زیادہ ابیات کی ایک مثنوی ہے۔ جس میں چار بھائیوں نرگس، سنبل،
نسترن اور یاسمین کی داستان بیان کی ہے۔ داستان شروع کرنے سے قبل حمد، نعت،

وصفِ صحابہ وپنجتن، مناجات بہ قبول سخن، قیام بہ ڈیوڑھی اسفندیار جنگ، بیان جلوس عرس خواجہ بندہ نواز، مریدی، توصیف نظام علی خاں، مدح خواجہ خیر الدین خاں اور ضمناً اپنے حالات بھی لکھے ہیں، تعجب ہے کہ نظام علی خاں کی وفات (1218ھ) کے تیس برس بعد ان کی توصیف یا ہجو کیوں لکھی، اور اس ضمن میں آصف جاہ ثانی اور مہاراجا چندو لال کا ذکر اس طرح کیوں کیا کہ مدح کے بجائے ذم کا پہلو نمایاں ہے، مثنوی میں جگہ جگہ غزلیں بھی شامل کی ہیں، شادی کے ذکر میں دکن میں مروجہ تمام رسوم کا بیان کیا ہے"۔

شاعر نے اپنا نام اس طرح نظم کیا ہے۔

جسے تو نے حیدر کا دے پہلے نام　　فقیر اللہ کر اب پکارا ہے عام

آغاز مثنوی۔

رہے پہلے توصیف یزداں اہم　　تصانیف پر تو کروں میں رقم
کہ محمود حامد ہے کل کائنات　　او ہے ذات اس کی تمای صفات

خاتمہ۔

اگر ذکر ہے جانِ عالم یقیں　　مگر وقفیت غیر تیرے نہیں
کرم سے دیا وقفیت جس طرح　　کرم کر کہ واصل بھی ہوں اس طرح
نکل سنہ میں لا نظم انور کا نام　　ہوا روز جمعے کے تمت تمام

1247

سپرد حق کے یہ نظم و ناظم کا کام　　پس آگے کہوں بجز والسلام

اس سے بظاہر ہے کہ یہ مثنوی 1247ھ (1831-32) میں مکمل ہوئی تھی اور شاعر نے اس کا نام تاریخی رکھا تھا۔

11-طوفان

یہ مہاراجا چندو لال کے خاص مدّاحوں میں سے تھا۔ چنانچہ مہاراجا کے حال میں ان کا نام آچکا ہے۔ نصیر الدین نقش نے ان کے تعارف میں لکھا ہے:

''طوفان تخلص، غلام محی الدین تلمیذ جناب حافظ تاج الدین مشتاق، رسالۂ عروض وقافیہ در ریختہ مسمّی بہ قریب الفہم رمختۂ کلک اوست وسخنوران معاصران خود را در عروض قافیہ تنگ می ساخت''۔23

ان کے رسالہ عروض کا ایک نسخہ کراچی میں موجود ہے۔ اس کے بارے میں افسر صدیقی امروہوی نے لکھا ہے:

''مثنوی در عروض۔ صفحات 72، سطور 11۔ یہ مثنوی نواب سکندر جاہ والیِ حیدر آباد کے عہد میں تصنیف ہوئی، مصنف نے حمد ونعت کے بعد ان کی اور چندو لال کی تعریف وتوصیف میں اشعار لکھے ہیں، عروض کا بیان حرکات قافیہ تک آیا ہے، ممکن ہے اس کے بعد چند عنوانات رہ گئے ہوں، صفحہ اوّل پر میر اکبر علی کی مہر ہے جس کا سنہ 1283ھ (1866-67) ہے، طوفان کا نام غلام محی الدین تھا، وہ تاج الدین مشتاق کے تلامذہ میں سے تھے''۔24

آغاز:

جُزو کُل پر ہے وہی کامل محیط — جس کی ایجادوں میں ہے خاک بسیط
ہے اصول کل وہی، وہ ہی فروع — یعنی آخر میں وہی، وہ ہی شروع
صنعتیں جس کی نہایت ہیں عجیب — وصف اس کا کہہ سکے کیا یہ غریب

خاتمہ:

وصل کی جنبش کو بولے ہم نفاذ — نایرہ تک ہے یہی پیہم نفاذ
ہووے تب جنبش روی کی ذات کو — جب روی سے وصل حرف وصل ہو

12-عقلاں:

یہ اپنے زمانے کے قابلِ ذکر شاعروں میں سے تھے۔ لیکن ان کے حالات کچھ معلوم نہیں ہوتے۔ نقش نے ان کے بارے میں بس اتنا لکھا ہے:

''عقلاں شخصے است از سکنۂ ایں دیار، مناقب وقصائد وغزل ہر سہ می گفت، گویند کہ بسیار شاگرد فراہم آوردہ بود''۔

ان کے کلام کا ایک مجموعہ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد میں ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر زور نے جو لکھا ہے اس کا اختصار یہ ہے:

''آصف جاہ ثالث نواب اکبر علی خان سکندر جاہ متوفی 1244ھ (1828-29)
اور ان کے جانشین ناصر الدولہ کے عہد کے ایک درویش شاعر تھے، مجموعے میں ان کی
نظمیں، قصیدے، مخمس، مسدس اور مختلف قسم کے ترکیب بند ہیں، بعض بہت طویل
(کئی سو اشعار پر مشتمل) ہیں، زیادہ تر نظمیں حضرت علی کی تعریف میں ہیں، اور
شہدائے کربلا کے مرثیے ہیں، ایک نظم میں محرم کے جلوسوں کی تفصیلات اور فقیروں
کے گروہوں کے حالات نظم کیے ہیں، اس کا آخری بند یہ ہے ۔

الغرض اس دھوم سے سارے فقیراں بہم　　فاتحہ دیتے ہیں جا پیشِ حسینی علم
تو بھی چل عقلاں وہاں سر کو بنا کر قدم　　دیویں تجھ کو تا حسین اس کا صلہ از کرم
آج یہ حیدر نگر عاشق یاری کا میل　　نکلا ہے سر طوق کی خاصی سواری کا میل

ایک دوسری نظم میں اپنے زمانے کی بے طوری اور فضل و کمال کی ناقدری کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ غالباً عہد ناصر الدولہ کی سیاسی و سماجی بے چینی کا مرقع ہے۔ یہ نظم بہ شکل مستزاد ہے۔ اس میں کل 15 بند ہیں۔ اسی قسم کی 70 کے قریب نظمیں ہیں''۔

مذکورہ مستزاد کا ایک بند یہ ہے ۔

یہ ابلقِ ایام جو بے طور ہے راہی　　مسرور ہیں گمراہ
اجلافوں کو توفیق ہوئی صحبتِ شاہی　　اور سایہ خرگاہ
ہے ان دنوں کشتیِ نجابت پہ تباہی　　بے طرح سے واللہ
اب چشم کرم کیجئے از بہر الٰہی　　اے نایب اللہ

عقلاں کی ایک طویل نظم جو ایک سو ستائیس صفحوں پر سمائی ہے کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔ اس کا عنوان ''میخانۂ وحدت'' ہے اور اس کے ترقیمہ سے شاعر کا نام معلوم ہوتا ہے:

''تمت الکتاب میخانۂ وحدت بعون الملک الوہاب الغزت من تصنیف غلام ولی
عرف ولی محمد متخلص بہ عقلاں وکاتب الحروف مرزا حاتم علی بیگ متخلص امکاں بہ

موجب فرمائش والا حضرت حفیظ الدین یکتا زماں ظرف بڑے میاں صاحب قبلہ
مدظلہ تاریخ چہاردہم، ربیع الثانی 1242 (1826-27)"۔

اس کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے:

"مصنف آصف جاہ ثالث کے عہد میں موجود تھا، مہاراجا چندولال کے دربار میں اسے رسائی حاصل تھی، شمس الدین فیض سے بہت دوستی تھی، یہ مثنوی حمد، نعت، مدح اصحاب، فضیلتِ حضرت علی، مدح خمسۂ اطہر، مدح غوث صمدانی، سید چرن علی شاہ، برن علی شاہ، سید بہار علی شاہ قادری اور پھر سکندر جاہ، مہاراجا چندولال کی مدح سے شروع ہوئی ہے، وجہ تصنیف کے بعد لنس مضمون بیان کیا ہے، یہ ایک فرضی قصہ ہے، آخر میں عشق مجازی کو ترک کر کے عشق حقیقی اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے"۔

فیض نے اس کی تاریخ کہی ہے۔

سر الطاف سے کہا فی الحال داستان طریقت اس کا سال

1 + 1235=1236

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی 1236 (1820-21) میں مکمل ہوئی تھی۔

14-فیض:

فیض حیدر آباد کے ممتاز شاعروں میں سے تھے۔ نصیر الدین ہاشمی نے ان کے دیوان کے تعارف میں جو کچھ لکھا ہے مختصراً یہ ہے:

"میر شمس الدین نام، فیض تخلص، 1195ھ (1781) میں تولد ہوئے، 1283ھ (1866-67) میں حیدر آباد میں وفات پائی، اجداد دہلی سے دکن میں آکر بس گئے تھے۔ فیض یہیں پیدا ہوئے، بارہ سال کے سن میں قرآن شریف حفظ کیا، مشتاق دہلوی کے شاگرد ہوئے، ان کا مزار زیارت گاہ خاص و عام ہے، دیوان میں غزلیات کے علاوہ رباعیات، مخمس، قطعات شامل ہیں، آخری قطعہ تاریخ 1278ھ کا ہے"۔

ڈاکٹر زور نے فیض کے بارے میں خاصے اضافے کیے ہیں۔ لکھا ہے:

"یہ بڑے مصنف، عالم اور صوفی بزرگ تھے، کئی دیوان لکھے۔ بعض شائع ہو چکے ہیں۔

چشمۂ فیض میں اوائلِ عمر کا کلام ہے، ایک غزل میں شاعر نے خود کہا ہے۔

ہے شمار سالِ عمر اپنا برس بائیس میں ہو سکا اب تک نہ ہم سے کچھ سرانجام شباب

اس مجموعے کی تکمیل کی تاریخ فیض نے اس طرح کہی ہے۔

چشمۂ فیض اس کی ہے تاریخ

1238ھ

ان کی ایک مُہر میں نام اس طرح تحریر ہے:

ع ہست حافظ میر شمس الدین فیض 1245ھ

یہ مُہر چشمۂ فیض کے نسخۂ ادارہ ادبیات کے سرورق پر تحریر ہے، اسی جگہ یہ قطعہ بھی لکھا ہے:

وہ عماد الدّین محمد جو کہ ہیں بابا میاں دستوں کے رنج اور ایذا سے انھیں صحت ہوئی

سال صحت فیض صاحب ہم سے فرماتے تھے کل میرے نورالعین نے پائی ہے صحت آج ہی

1283ھ

یہ قطعہ فیض کے آخری کلام میں سے ہے۔ کیونکہ اسی سال میں انھوں نے وفات پائی تھی"۔

فیض کثیر التصانیف شخص تھے، ان کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں یہ ہیں:

1-متن میر شمس الدین	2-خزانۃ الامثال
3-شرح منظومہ صرف	4-شرح ماۃ عامل
5-رسالہ مفید در احکام حلّت و حُرمت	6-شرح الفیض
7-شمس التصریف	8-طریق الفیض
9-تمیز القوافی	10-شرح میر شمس الدین
11-شمس النحو	12-رسالہ بیان ناسخ و منسوخ
13-شرح کلمۃ الحق	14-اعمال معما

ان میں سے بعض کی کیفیت درج ذیل ہے:

1-شرح الفیض: حافظ شمس الدین فیض کی پہلی تالیف "متن میر شمس الدین" تھی۔ جس کا سال تالیف 1235ھ (1819-20) بتایا گیا ہے۔30 اس کا مسودہ بظاہر تلف ہو گیا تھا،

شرح الفیض اس کے چار برس بعد یعنی 1239 (1823-24) میں لکھی گئی تھی، اس میں یہ مذکور ہے کہ:

''اکثر احبا خصوصاً حسب الاصرار ہمشیر زادہ سعادتمند ازلی میر دلاور علی ... بہ شرح منظومۂ قاضی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ پرداختم و بہ شرح الفیض موسوم ساختم''۔31

2-شرح میر شمس الدین: اول الذکر کی طرح یہ بھی فارسی میں ہے، موضوع اس کا عروض و بدیع ہے سال تصنیف 1253ھ (1837) ہے۔

3-اعمالِ معما کے نام سے ایک چار ورقی رسالہ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد میں ہے، قیاساً کہا گیا ہے کہ اس کے مصنف بھی فیض ہی ہیں، دکن کے علاقے میں اس رسالے کا تصنیف کیا جانا قابل ذکر واقعہ ہے کیونکہ خود شمالی ہند میں انگریز حکام فنِ معمہ کے مؤید نہیں تھے، بلکہ بعد کے زمانے میں اس کی ترویج میں مانع بھی ہوئے تھے۔

4-خزاین الامثال موسوم بہ دستور الشعراء: اس میں اردو شاعری کے محاورے اور امثال ردیف وار جمع کیے گئے ہیں، سال تصنیف 1272ھ (1855-56) ہے۔32

5-فیض جاری: یہ واحد باری کے طرز پر عربی، فارسی، اردو کی بہ صورت مثنوی ایک لغت ہے۔ اس کا سالِ تالیف 1256ھ (1840) ہے، اس کے مخطوطۂ حیدرآباد کے سرورق پر لکھا ہے:33

''رسالہ فیض جاری عہد میں نواب فلک جناب بندگانِ عالی حضرت آصف جاہ نظام الملک نظام الدولہ فتح جنگ میر فرخندہ علی خان بہادر مدظلہ العالی کے شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں واسطے تعلیم طلبا کے سرکار شمس الامراء بہادر امیر کبیر کے سنگی چھاپے خانے کے درمیان 1256ھ میں چھپا''۔

اس مصنف نے اپنا نام اس طرح نظم کیا ہے۔

ہے وہ حافظ جسے ہو قرآن یاد — شور ہنگامہ ہے فغاں فریاد
ع ع ہ ف ع ع

کہہ بنی فاطمہ کو سید میر — ہے مرمت کا ترجمہ تعمیر
ع ف ف ع

شمس ہے آفتاب دین اسلام ایک معنی رکھیں درود وسلام
ع ف
فیض الہام ہے ضیا ہے نور ہے جو تنور جان اس کو تنور

اپنی اس کتاب کا نام اور سال تصنیف شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے ۔

فیض جاری ہُوا مرتب جب تب کہا سب نے ہے نصاب جب
اس کی تاریخ مجھ کو یوں بھائی فیض کا یہ رسالہ ہے بھائی

1256ھ

اس کے ترقیمہ میں بھی دلچسپ وضاحت کی گئی ہے، اس طرح:

''رسالہ فیض جاری تصنیف کیا ہوا مولوی حافظ میر شمس الدین محمد المتخلص فیض کا پڑھنے والوں کی تربیت کے واسطے موافق عدد نام مولوی شمس الدین محمد کے جچھے سو اُنیاسی بیت پر، سوائے دو سو بتیس، تاریخ سنہ بارہ سو چھپن ہجری میں مرتب ہوا، تمام شد ایں رسالہ در سن یک ہزار و دو صد و شصت و ہفت ہجری بہ ید محمد تقی غفر اللہ لہ ولوالدیہ''۔

6-تمیز القوافی: یہ بھی فیض کے ابتدائی زمانے کی تصانیف میں سے ہے۔[34] اس میں جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے قافیہ کے مسائل کا بیان کیا گیا ہے۔ یہ صراحت کی گئی ہے کہ یہ نواب بدر الدین خان معظم الملک فرزند شمس الامرا فخر الدین خاں امیر پایگاہ کے لیے لکھی گئی ہے۔ یہ رسالہ صرف گیارہ صفحوں پر مشتمل ہے۔

فیض کی تصانیف کے موضوع بھی بہت متنوع لیکن مفید ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامع الکمالات شخص تھے۔

15-قاسم

حکیم سید قاسم شاعر نہیں تھے لیکن اپنے علم کو آسان بنانے کے لیے انھوں نے اسے نظم کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔[35] زمانے کے دستور کے مطابق انھوں نے چھ اشعار ''صفتِ ثانی سکندر یعنی سکندر جاہ'' کے عنوان سے بھی لکھے ہیں۔ خود اپنے بارے میں بھی مصنف نے بعض باتیں نظم کی ہیں، مثلاً۔

میں بمن مرشد سے اپنے یوں کلام ہے سید نجم الدین صاحب شرف نام
پردہ تعیں کہ ہو گئی ان سے بعض رہنما ہے عارفوں کی دست گیر وعظ
فرزند مہدی کے صحیح آفاق واظہر ہے قدم بوسی میں جن کے شمس وقمر

اس شعر میں بعض مصرعے ناموزوں بھی ہیں اور بہت سے لفظوں میں ساکن کو متحرک اور متحرک کو ساکن بھی کر دیا ہے۔ اس طرح تلفظ کے ساتھ املا میں بھی فرق پیدا ہو گیا ہے۔

اپنی طب منظوم میں قاسم نے جو منجم بھی اور رمّال بھی تھے۔ ہر مرض کے نسخے نظم کیے ہیں۔

کتاب کے آخر میں کوئی تر قیمہ نہیں ہے اس لیے فی الوقت بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ سکندر جاہ کے عہد کی ایک مفید علمی تالیف ہے۔

16-لعل

یہ بھی سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کے عہد کے شاعر تھے۔ لعل شاہ ان کا نام تھا۔ انھوں نے حضرت عبدالقادر جیلانی سے اظہار عقیدت کے لیے غوث نامہ کے نام سے ایک طویل نظم لکھی تھی۔

آغاز:

اول نام اللہ ذاتی قدیم ہیں باقی سب اسم صفاتی عظیم
ہے رحمان و رازق اور مہرباں رسا بندہ روزی بہ جملہ جہاں

شاعر نے اس نظم میں حضرت کی کرامتوں اور واقعات کو نظم کیا ہے۔

خاتمہ:

فضیلت کرامت ہدایت کے شاہ مُریداں کے تحقیق پشت وپناہ
ثنا صفت میراں محی الدین کی کہاں لگ کرے کوئی بشر پیر کی
ہے عاجز بندہ لعل شاہ ہے غلام کیا ختم یہ غوث نامہ تمام

انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے کتب خانہ خاص میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے۔ لیکن اس سے بھی لعل خاں کے بارے میں معلومات میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا ہے۔

17-مکھن

راجا مکھن لال مکھن تخلص، سکندر جاہ کے عہد کے شاعر تھے۔ منصب اور خطاب سے بھی

سرفراز تھے، بقول ڈاکٹر زور: انھوں نے حمد، نعت، منقبت، مرثیہ وغیرہ ہر صنف میں کامیابی سے طبع آزمائی کی تھی۔ عمر خیام کی رباعیوں کا بھی انھوں نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ڈاکٹر زور نے ایک قدیم بیاض میں ان کے سلاموں، نوحوں، مرثیوں وغیرہ کی نشاندہی کی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے رباعیات کے ترجمے سے متعلق ان کے لکھے ہوئے دیباچے کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

> ''اس نومشق سخن خوشہ چیں ارباب کمال راجا مکھن لال کو مدت سے یہ تمنا تھی کہ عند الفرصت اپنے ترجمہ رباعیات فارسی حضرت عمر خیام کا کہ اس بزرگ کے کلام میں سراسر حقیقت اور معرفت تر روشن کرتی ہے، خلاصہ اس کا زبان اردو میں موافق اپنی استعداد کے رشتۂ تحریر نظم میں لاوے، اگرچہ اس راقم آثم کو اتنا سواد اور مواد زبان ریختہ میں نہیں تھا کہ ترجمۂ کلام اس بزرگ کے کہ فیضِ ظاہری و باطنی اس میں مستور ہے، اس ترجمہ کو بھی فایدہ نصیب ہو''۔

موصوف نے یہ لکھا ہے کہ:

''مکھن لال کا جو دیوان ہے اس میں غزلیات کے بجائے ترجیع بند اور مخمس ہیں، ان میں شیخ عبد القادر جیلانی اور پنجتنِ پاک کی مدح ہے، مرثیے بھی ان کے یادگار ہیں۔

یہ بیان قابلِ توجہ ہے بظاہر حیدرآباد کے ان شاعروں نے جو براہِ راست اور بالواسطہ طور پر دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ سے فیض یاب تھے، غزل گوئی کو اختیار کیا لیکن جو شاعر ان کے زیرِ اثر کمتر رہے تھے انھوں نے عموماً غزل کے سوا دوسری اصناف خصوصاً مثنوی وغیرہ سے زیادہ دلچسپی لی تھی، مکھن نے مثنوی غالباً نہیں لکھی لیکن ان کی توجہ اور رباعیات اور مرثیہ وغیرہ کی طرف زیادہ رہی ہے اور انھوں نے ترجیع بند اور مخمس وغیرہ پر مشتمل اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا۔

نثر

حیدرآباد میں نثر نویسی کی طرف بھی دلچسپی لی گئی تھی۔ وہاں نثر کی مختلف اصناف کے نمونے ملتے ہیں۔ بعض نثری تصانیف کا احوال اوپر ضمناً لکھا جا چکا ہے اور اب کچھ نثر نگاروں کا حال یہاں تحریر کیا جاتا ہے۔

1- بابا قادری:

سید بابا القادری اور ان کے خاندان کے حالات ڈاکٹر زور نے بہت تفصیل سے لکھے ہیں۔ ان کا اختصار یہ ہے:

> ''سید بابا قادری کے والد سید شاہ محمد یوسف قادری ولد سید شاہ محمد عبداللہ قادری نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد کے ایک صاحب اثر بزرگ تھے، سید بابا نے ان کے بارے میں اتنا لکھا ہے کہ:
>
> علامۃ العصر الجامع بین علوم الظاہر والباطن وصاحب التصانیف فی المعقول والمعقول والتصوف''۔

شاہ یوسف کے دو بیٹے تھے۔ پہلے سید شاہ عبداللہ قادری المعروف قطبی صاحب اور دوسرے سید بابا قادری، اول الذکر کے نام سے حیدرآباد میں ایک محلہ قطبی گوڑہ مشہور ہے۔ سید بابا قادری

بڑے صوفی اور واعظ تھے۔ ایک دوست نے ان سے کہا کہ پہلے کے علما نے عربی اور فارسی میں قرآن مجید کی تفسیریں لکھی ہیں۔ آپ ہندی میں ایک تفسیر لکھ دیں۔ سید بابا نے سکندر جاہ آصف جاہ ثالث کے عہد میں ذیقعدہ 1240 (1825) کو اس کام کا آغاز کیا، اس تفسیر کا نام تفسیرِ تنزیل رکھا، جس سے غالباً اس کی تکمیل کا سال 1247ھ (1831-32) معلوم ہوتا ہے۔ بہ گمانِ غالب اس تفسیر کو مکمل کرنے کے بعد انھوں نے اس کا دیباچہ لکھا جس میں اپنے خاندانی حالات بھی تفصیل سے بیان کیے ہیں"۔

نصیرالدین ہاشمی نے ان حالات پر کسی قدر اضافہ کیا ہے:

"اس تفسیر کے دو نام ہیں، فوائدِ بدیعیہ اور تفسیرِ تنزیل، مصنف حیدرآباد کے متوطن ایک بلند پایہ عالم تھے، کئی کتابوں کے مولف ہیں، تفسیر کے علاوہ شمائل النبی کا بھی ترجمہ کیا ہے، آصف جاہ ثالث کی بہن منیرالنساء بیگم سید بابا کی عقیدتمند تھیں، ان کی فرمائش سے کئی کتابیں سید بابا نے لکھی تھیں"۔

کتب خانہ آصفیہ میں اس تفسیر کا مخطوطہ پانچ جلدوں میں ہے۔ پانچویں جلد کا اختتام اس بیان پر ہوا ہے:

"ظاہر کے حواس پانچ.... دین بھی پانچ فرضوں پر تمام ہوا... اور خدا تعالیٰ نماز اں بھی پانچ فرض کیا... اس طرح اس تفسیر تنزیل کو بھی پانچ شخصوں نے تمام کی اول فقیر مصنف سید بابا قادری، دوئم حاجی میاں محمد علی، سوئم محمد عبدالغفور خاں۔ یہ دونوں شخص اس امر میں نہایت کوشش رکھے تھے، چہارم محمد مسافر جوان صالح اور لائق اور خوش مزاج اور خوش نویس، اور پنجم محمد واحد علی کہ یہ دونوں شخص تصنیف کے لکھنے والے تھے، کہ خدا تعالیٰ ان دو شخصوں کے لکھنے سے تفسیر تمام کروایا، خدا تعالیٰ قرآن شریف کے تین حرف ب سے شروع کیا، اور ختم قرآن شریف کا حرف س پر ہوا، ان دو حرفوں کی حرکتیں مرکب کرو تو بس اس کا حاصل ہوتا ہے یعنی ان دونوں حرفوں کے جمع سے جو تمام قرآن شریف ہے بس کرنا ہے تیرے تئیں"۔42

ترقیمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفسیر نواب ناصر الدولہ کے عہد میں 1247ھ

(1831-32) میں مکمل ہوئی تھی۔اس تفسیر کا ایک حصہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ میں بھی ہے۔43

شرح شمایل ترمذی:

سید بابا القادری کی یہ دوسری کتاب ہے، اس کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی نے تحریر کیا ہے:

> ''مترجم نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ اس کتاب کے ترجمہ کرنے کی ترغیب دو دوستوں نے دی ایک محمد علی صاحب دوسرے منیر النساء بیگم ثانی الذکر نظام الدولہ رئیس دکن کی بیٹی ہیں، جو ہمیشہ خدا کی عبادت میں مصروف رہا کرتی ہیں اور فقیر اور اہل باطن کی صحبت کو غنیمت خیال کرتی ہیں، موصوفہ نے کئی مرتبہ مترجم کو ترغیب دلائی کہ احادیث نبوی کا ترجمہ کیا جائے''۔44

اس کتاب کا دیباچہ فارسی میں ہے، اس کے بعد نفس مضمون کا آغاز اردو میں ہوا ہے، اس کام کو مترجم نے غالباً تفسیر کی تکمیل کے فوراً بعد شروع کیا تھا، آغاز ترجمہ کا سال 1256ھ (1813) بتایا گیا ہے۔کتاب کا نام اس طرح لکھا ہے:

''سراج النبوۃ شرح شمایل ترمذی''

کتب خانہ آصفیہ کے قلمی نسخہ کو اس کی ضخامت کی وجہ سے چار علاحدہ علاحدہ جلدوں میں منقسم کر دیا گیا ہے اور اسی وجہ سے بصورت موجودہ ہر پہلی جلد کی آخری عبارت اس کے بعد والی جلد کی شروع کی عبارت سے مربوط ہے۔مصنف نے اصل حدیث کو پہلے عربی زبان میں لکھا ہے اس کے بعد اردو میں اس کا ترجمہ تحریر کیا ہے۔کتاب کا متن ان فقروں سے شروع ہوتا ہے:

> ''شروع کرتا ہوں میں اس کتاب کتیں نام سے اللہ کے کہ مہربان ہے بندوں پر عام کہ مسلمان اور کافر دونوں کو رزق دیتا ہے دنیا میں ایسا اللہ کہ رحیم یعنی مہربان ہے، خاص آخرت میں کہ مومنین کو بخشے گا سوائے کافروں کے''۔

چوتھی جلد کے آخری کلمات یہ ہیں:

> ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان ہے اور جو شخص کہ رسول اللہ پر بہتان کرے وہ

داخل جہنم میں ہوگا، نعوذ باللہ منہا"۔

کتاب کا ترقیمہ حسب ذیل ہے:

"الحمد للہ کہ رمضان شریف میں سترہویں تاریخ یک شنبہ کے روز 1266ھ میں شمایل ترمذی کی شرح کرنے سے فراغت ہوئی، خدا تعالی اپنے فضل سے بہ طفیل محمد رسول اللہ کے اس کتاب سراج النبوۃ کو قبول کرے ..... بدست احقر العباد محمد عبدالرزاق بتاریخ ہفدہم شہر رمضان المبارک 1266ھ بروز یک شنبہ باتمام رسید"۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس کام میں کوئی دس برس صرف ہوئے تھے۔

2- حسین علی

سید حسین علی خاں حیدر آباد کے شرفا میں سے تھے۔ ان کو قصے کہانیوں سے بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے فارسی سے یکے بعد دیگرے اردو میں چند قصوں کے ترجمے کیے تھے۔

مرغوب الطبع: یہ فارسی قصہ کامروپ کا ترجمہ ہے۔ مترجم نے اس کے سبب تالیف میں بیان کیا ہے:

"ایک روز مجلس میں تذکرہ قصوں کا درپیش آیا قصہ بکاولی و چہار درویش کا جو زبان ہندی سے لکھے ہیں کیفیت اس کی ایک صاحب نے بیان کیے، احباب کے تئیں شوق مطالعہ ہوا، چنانچہ بہم پہنچ کر مطالعہ سے اس کے جو کیفیت اچھی لکھی ہے محظوظ ہوتے تھے، ایک روز ذکر کامروپ کا نکلا تب ایک صاحب نے جو مجھ سے اتحاد کمال رکھتے تھے فرمائے کہ اگر تجھ سے ترجمہ اس قصے کا زبان ہندی سے جو قریب الفہم ہو ..... آوے تو بہت احسن ہے، تب میں نے عذر اپنی بے استعدادی کا کیا لیکن مبالغہ سے ان کے لاچار ہوں جیسا کہ مجھ سے ہوسکا لکھا اور موسوم بہ مرغوب الطبع کیا... جب ارادہ اس کتاب کے اتمام کی تاریخ کا ہوا تو مفہم غیب نے جو لفظ اول نام مرغوب ہے مادہ تاریخ کی مبارک باد دی ؎

خیال اس کی جو تاریخ کا ہوا دل میں ندا یہ ہاتف غیبی نے مجھ کو دی مرغوب

1248ھ

ختم کتاب کی عبارت یہ ہے:

''غرض مدت تک عیش ونشاط وخوشی وخوری سے کاٹا اور جھاڑ سے جوانی کے ثمرہ مراد وکامرانی کا چنا، اور اپنی مراد دل کو پہنچا، اللہ تعالیٰ سب کسی کا مدعا ومراد اسی طرح بر لاوے بہ تصدق جناب پنج تن دائمہ علیہ الصلاۃ والسلام''۔45

ادارہ ادبیات اردو میں اس کتاب مرغوب الطبع کے دو نسخے خود مترجم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے محفوظ ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ مترجم نے اپنے حلقۂ احباب میں اس کو تقسیم کرنے پر بھی محنت کی تھی۔

چاردرویش:

یہ بھی حسین علی خان کی کتاب ہے۔46 اس کے سبب تالیف میں بیان کیا گیا ہے:

''بندہ کو پانچ فرزند تصدق پنجتن پاک عطا فرمائے ہیں، بندہ ان کو اپنے حواس خمسہ جانتا ہے، اور پنج گانہ میں جناب الٰہی سے ان کی صحت کی دعا مانگتا ہے... غرض ان میں سے برخوردار ولایت علی خاں طال اللہ عمرہٗ وقدرہٗ تعریف قصہ چاردرویش کی سنے اور نہایت مشتاق ہوا کہ کہیں سے قصہ چاردرویش بہم پہونچے کہ خریدوں یا مستعار ملے، تو نقل نویسی کروں مگر دستیاب نہ ہوا، تب بندہ نے ان کی گرانی خاطر سے اندیشہ کیا اور دل سے کہا کہ تجھ کو کچھ شغل دنیا سوائے بیکاری کے نہیں ہے، مثل مشہور ہے: بیٹھے سے بیگار بھلی، یہ خیال کرکے ارادہ کیا کہ قصہ چاردرویش فارسی زبان میں نظم کروں، پھر اسی برخوردار نے کہا کہ بندہ چاہتا ہے کہ اس قصے کو زبان اردو میں آپ قلمبند فرمادیں کہ خواص وعام اور وضیع وشریف سمجھیں اور قوت پاویں، خیر مامور مجبور، اس واسطے یہ قصہ اگرچہ سابق ہی زبان اردو میں لکھا گیا ہے اور چھاپ بھی ہوا ہے اور حال میں ہندی میں نظم بھی کیا ہے۔ بندہ بھی پاس خاطر عزیز برخوردار معزلکھتا ہے کہ جو سنے لذت پاوے''۔

نسخہ آصفیہ ناقص الآخر ہے اس لیے کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ بہ صورت موجودہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ حسین علی خاں اس ترجمے کو پورا کرسکے تھے یا نہیں۔

ہمیشہ بہار

یہ حسین علی خاں کی تیسری کتاب ہے۔اس کے سبب تالیف میں بیان کیا گیا ہے:

''کتاب بہار دانش شیخ عنایت اللہ نے زبان فارسی میں بہت عبارت رنگین و مسلسل و دقیق و نقلیں عجایب و کہانیاں نادر اور نصیحتیں جو وزیر و امیر و حکیم و ندیم و امراء و اعیان جہاندار سلطان کے تئیں بیوفائی عورتوں کی تمہیں لکھی ہیں، اکثر اوقات مجلس میں شغل اس کتاب کا رہتا تھا، اور سب اہل محفل کو جو بہرہ علم سے رکھتے تھے بشناشت حاصل ہوتی تھی، اور لاعلم اس کی فہم کی لذت سے محروم رہتے، کئی صاحبوں نے کہے کہ اگر اس کتاب کا ترجمہ زبان ہندی سے ہو تو سب باعلم و بے علم کی سمجھ میں جو یہ کہانیاں و نقلاں جو رنگین ہیں آئینگی اور کئی منشیوں نے بہوت سی کتابیں فارسی کی بموجب فرمایش انگریزوں کے ترجمہ ہندی سے جو قریب الفہم ہوتا ہے کیے ہیں، مجھے جو بیکاری و خانہ نشینی تھی اپنے وقوف کے موافق دقائق و طول کلامی کو موقوف کر مطلب چیدہ کر کے ہندی جو زبان اپنی تھی وہ ہی بول چال سے ترجمہ کیا، عہد میں مسند نشینی نواب کیواں جناب معلا القاب رستم دوراں حاتم زماں

ہست کیواں جناب و نجم سپاہ زیب بخش سریر و چتر و کلاہ

جانشین سکندر ثانی ناصر الدولہ یعنی آصف جاہ

قائم رکھے اللہ تعالی اسے مع اولاد و سلطنت کے تا دور قیامت، سخاوت اس کی اگر حاتم زندہ رہ کر آنکھوں سے دیکھتا تو آپ کو ایک اونی بیلہ برداروں سے جانتا کہ یکسر دم توڑی کا مارتے ہیں، پرداخت و پرورش اعلی و ادنا و مسکین و فقیر و سالک و مجذوب کی بہ درجہ ملحوظ ہے اور اس کی دست سخا کے آگے اشرفی حکم خرمہرہ کا رکھتی... مترجم اس کا سید حسین علی خاں جو زادبوم بھی شہر فردوس رشک ہے،.... ہمیشہ بہار نام رکھا''۔47

ادارۂ ادبیات اردو میں بعض دوسری کتابوں کی طرح اس کتاب کا نسخہ بھی بخطِ مترجم ہے۔ یہ نسخہ ناقص الآخر ہے۔اس لیے اس میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔زبان ان کتابوں کی خاصی حد تک صاف ہے۔

حیدرآباد میں نواب شمس الامرا کی سرپرستی میں اردو نثر میں نصابی اور علمی ضرورتوں کے مطابق بہ کثرت کتابیں لکھی گئی تھیں۔ یہاں اس سلسلے کے بعض ارباب قلم کا مجملاً تعارف کرایا جاتا ہے۔

3-مست

اس شخص یعنی رتن لال مست کے حالات اس طرح تحریر کیے گئے ہیں:

''رائے رتن لال، چنپا لعل کے بیٹے اور نتج رائے کے پوتے تھے، قوم کے کائستھ تھے۔ ان کا خاندان شمالی ہند سے ارکاٹ چلا آیا تھا، چنپا لال ارکاٹ سے حیدرآباد آئے۔ پہلے راجا نتج دنت کے اور پھر مہاراجا چندو لال شاداں کے متوسل ہو گئے۔ دربار نظام سے رائے کا خطاب پایا۔ رتن لال 1222ھ (1897) کے لگ بھگ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم و تربیت عمدہ پیمانے پر ہوئی، انھیں شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی، تخلص مست تھا۔ شاعری میں میر شمس الدین فیض ان کے استاد تھے۔ میر فرید الدین آفاق کے توسط سے نواب شمس الامراء تک رسائی حاصل کی اور ان کے دارالترجمہ میں ملازم ہو گئے''۔

1253ھ (1837) میں رتن لال نے ایک کتاب منتخب البصر کے نام سے تیار کی تھی۔ اس میں مذکور ہے کہ:

''اس علم میں اگرچہ ایک کتاب مبسوط فارسی زبان میں موسوم بہ رفیع البصر لکھی ہوئی صاحبزادہ محمد رفیع الدین خاں المخاطب بہ عمدۃ الدولہ بہادر خلف الصدق نواب شمس الامراء بہادر کی ہے، اور وہ کتاب جامع ہے تمام قواعد کلیہ دور نما کو اور حاوی ہے اشکال دقایق مجسمہ کو- یہ بندہ عاصی پُر معاصی رتن لعل ولد چنپا لعل کہ نمک خوار اس دولت ابد مدت کا ہے، وقت تیاری اس کتاب کے زبان ہدایت بنیان صاحبزادہ موصوف سے بیان ہر شکل سے سرفراز ہوا کرتا تھا معلومات اس علم کی حاصل کیا اس لیے مصدر حکم نواب صاحب قبلہ ممدوح کا ہوا کہ وہ کتاب بہت بڑی قابل مُنتخبوں کے ہے، تو کوئی رسالہ مختصر ایسا لکھ کر گزرانے کہ اس میں اس کی اصطلاحات اور اسما اور قواعد کلیہ لکھے ہوئے

ہوں تا کہ مبتدیوں کو پہلے معلومات اس کی اصطلاحات وغیرہ کی جلد ہو جائے بعدہٗ کچھ اس کتاب کا پڑھنا مبتدیوں کو آسان ہوگا، اس واسطے اس عاصی نے حسب الحکم واللا کے اس کتاب رفیع البصر سے قواعد آسان منتخب کر کے یہ رسالہ مختصر اردو زبان میں بہ طریق سوال وجواب شاگرد اور استاد کے ملاحظہ مبارک میں گزرانا"۔

اس رسالے کی ابتدا ان کلمات سے ہوتی ہے:

"بعد حمد اس صانع کے جس نے اشکال گوناگوں سطح ہستی پر منقش کیا اور نعت اس کی محبوب کی کہ جس نے آب ورنگ شریعت سے اجسام جہاں کو جلوہ دیا، درود اوپر اس کے اور آل واصحاب اس کے، اہل بصر پر پوشیدہ نہ رہے کہ یہ رسالہ ہے موسوم بہ منتخب البصر بیچ علم دور نما کے کہ اسے علم انظار بھی کہتے ہیں"۔

خاتمہ اس طرح ہے:

"یہ رسالہ تمام ہوا بعون اللہ تعالیٰ اور حسن توفیق اس کے اور اس کی تاریخ کا مادہ اس قطعہ میں موزوں ہے قطعہ

مرتب جب ہوا یہ سب رسالہ بحق سید ابرار نامی
تجسس کی جو میں نے اس کی تاریخ کہی کل عقل نے انظار نامی

1253ھ

یہ کتاب چھ مقالوں پر مشتمل ہے۔

4-شاہ علی

یہ بھی شمس الامرا کے متوسلین میں سے تھے۔ ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ" شاہ علی کا وطن ادھونی تھا، یہاں سے وہ حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہ ہیئت اور ریاضی کے جید عالم تھے اور اس حیثیت سے نواب شمس الامرا کے متوسل تھے۔ متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے بعض کے قلمی نسخے محفوظ ہیں اور ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

انوار بدریہ- علم ریاضی کی نسبتوں کے بیان میں ہے،

ترجمہ بحر الحیات (حیات سمندر)- جو نو ابواب پر مشتمل تصوف کی ایک کتاب ہے۔

افضل الآداب آصفیہ۔علم آداب واخلاق کے بیان میں

ان کے علاوہ دو کتابیں یہ بھی ہیں مصباح الافلاک، تذکرۂ رشیدیہ

شاہ علی کے وقیع ترین علمی کاموں میں شرح چغمنی کا ترجمہ بھی ہے، شرح چغمنی علم ہیئت کی عربی زبان میں ایک مشہور کتاب ہے، شاہ علی نے اس کا جو ترجمہ کیا ہے وہ ایک مقدمہ اور چوبیس ابواب پر مشتمل ہے، مصنف نے اس کے مقدمے میں لکھا ہے کہ:

''جس قوم میں زبان مروّج سے جو فن تحریر وترقیم پاتا ہے ہر طالب اس قوم سے نہایت آسانی کے ساتھ اس فن کا فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ بہ نسبت دوسری زبان کے کم مدت میں وہ فن حاصل اور اس میں کامل ہوتا ہے، کیونکہ جو مدت وہاں معرفت الفاظ میں جاتی ہے وہ تحصیل معانی میں کام آتی ہے، امیر کبیر شمس الامرا محمد فخر الدین خان بہادر نے بسا فنون ریاضی اور علوم طبیعی کے تئیں کہ جن کا رواج فقط گروہ عیسوی میں تھا زبان اردوے معلّٰی اور فارسی شیریں ادا میں نہایت توضیح اور تنقیح کے ساتھ منقول و محمول فرمایا تا ہندو فارس کے خاص وعام ان کے مطالعے سے اپنی اپنی عقل کو تیزی اور فکر کو ترقی دیویں، اے منصفو چشم انصاف سے دیکھیے تو اب ہم پر یہ امر واجب ولازم ہو گیا ہے کہ اس خورشید بے نظیر کی تالیفات اور تصنیفات تازہ کی تعلیم وتعلم کے رواج سے مدرسۂ ریاضی کے تئیں مانند ریاض رضواں کے سیراب کریں تا علوم وفنون اپنی زبان مروج میں زیادتی پکڑیں اور کم ہمت لوگ تضیع اوقات کو چھوڑیں نظر بریں اس ذرۂ بے مقدار شاہ علی متوطن قلعہ اودنی نے مشہور شرح چغمنی کو زبان ہندی میں بہ عبارت سلیس وصاف ترجمہ کر کے اسی مہر منیر کی رائے روشن سے مسائل اصل میں تقدیم وتاخیر اور مسئلۂ ضعیف کو قوی سے بدل کیا، الحمد للہ توجہ سے اس خورشید ضیا کے کوکب اس کتاب کا حضیض ناتمامی سے نکل کر ایک دقیقہ مقدمہ کا اور چوبیس درجے گفتگو کے طے کر کے اوج تمامی کو پہنچا اور بہ مناسب نام مبارک کے ساتھ اسم شمس الہیئت کے سے شرف پایا اور ہر گاہ کہ اس کتاب میں سوال تلمیذ اور جواب استاد سے طرز بنی ہوئی ہے، امید بالغ نظروں سے یہ ہے کہ روئے انصاف سے داد

دیویں"۔

کتاب شمس البہیت ایک سو اڑسٹھ اوراق پر محیط ہے اور اس کا زمانۂ تالیف 1250 ھ (1834) کے قریب خیال کیا گیا ہے۔

5-محمد جعفر

یہ اردو نثر میں حنفی فقہ سے متعلق ایک مختصر رسالے کے مصنف ہیں جس کا نام "روح الاسلام والایمان" ہے، اس میں مصنف نے کہا ہے کہ:

> "کمترین خاکپائے عالم فیر خواہ ولایق اُمت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محمد جعفر ملازم سرکار نواب مستطاب معلی القاب نواب شمس الامرا بہادر امیر کبیر یوں عرض کرتا ہے کہ میرے سردار نامدار دوام اللہ اقبالہٗ کا امیر کبیر پرورش فرمائے،...خلایق پناہ سُنّی مذہب حنفی مشرب مدظلہ العالی نے اس خادم کو حکم کیے کہ تو واسطے تعلیم لڑکوں کے زبان ہندوی میں مسائل فقہ کے لکھ"۔

شمس الامرا کے مدرسے کے لیے جو کتابیں لکھی گئی تھی عموماً سوال و جواب کی صورت میں تھیں، تاکہ طالب علموں کو آسانی سے یاد ہو سکیں۔ یہ رسالہ فقہ بھی محمد جعفر نے اسی طور پر لکھا تھا، ادارہ ادبیات کا جو قلمی نسخہ ہے اس کا آخری ورق پھٹا ہوا ہے اس لیے تر قیمہ نہیں ہے۔

6-محمد صالح

اس شخص کے حالات تو معلوم نہیں البتہ اس کے بارے میں اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ رنگون تک گیا تھا، اس کو اپنے مذہب سے محبت تھی، چنانچہ قیاس کہتا ہے کہ اس علاقے میں بھی اس نے اپنے مذہب سے متعلق کم و بیش گفتگو کی ہوگی، اور اس طرح محدود پیمانہ پر ہی سہی اس کے واسطے سے وہاں تک زبان اردو پہونچ رہی تھی۔

محمد صالح 1250ھ (1834) میں حیدرآباد پہنچ گیا تھا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اس نے اپنا ضخیم رسالہ فیضِ عام کے نام سے مکمل کر لیا تھا۔ یہ رسالہ تین سو سے زائد صفحات میں سمایا ہے اور ہر صفحہ پر پندرہ سے پچیس تک سطریں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی تکمیل میں خاصی مدت صَرف ہوئی ہوگی۔ یہ صورتِ حال اس حقیقت کی غماز ہے کہ رسالہ کا آغاز مصنف نے رنگون میں قیام کے زمانہ

میں کیا ہوگا۔

آغاز:

"الحمد لِلّٰہ الّذی ھدانا للایمان وأبعدنا عنِ الشّرک وَالطُّغیان، وَالصّلاۃ، والسّلام ..... للضّلالۃِ والبدعۃِ، امابعد! کہتا ہے بندۂ حق جو راست گو فقیر سراپا تقصیر غلام العلما محمد صالح عفا عنہ کہ بارہ سے پچاس میں اس فقیر کا گذر رنگون طرف ہوا، تقضارا پندرہویں کو شعبان المعظم کی ایک جاے.....لالہ میاں کر کے مشہور تھا اور ایک ہندو جس کا....."۔

خاتمہ:

"آخرت میں خاص شفاعت سید المرسلین کی ہماری اور ان کی نصیب کرے اور نیچے لواے محمدی کے ہم سب کا حشر کرے، آمین یا رَبّ العالمین بحقّ رسولہ محمد وَآلہ الطاھرین وَصلّی اللّٰہ عَلٰی خیر خَلقہٖ محمد وآلہٖ وَاَصحابہ اَجمعین، وَآخر دَعوانا اَنِ الحمد لِلّٰہ ربّ العالمین، تمت تمام شد"۔

"ان اقتباسوں سے ظاہر ہے کہ مصنف عالم مذہب تھا۔ اس کی کتاب کے بارے میں افسر امروہوی کی رائے ہے کہ:

"فیض عام میں فقہی مسائل ہیں، مصنف نے ان مسائل کو بڑی چھان بین اور تحقیق وتفتیش کے بعد قلمبند کیا ہے۔ عبارت مدلّل اور مسائل متنازعہ کے حوالے درست ہیں۔ پوری کتاب میں چھ فصلیں ہیں، اور ان سے پہلے مقدمہ ہے۔ جس میں فیض عام تصنیف کرنے کی وجہ بیان کی ہے"۔

7-لا اعلم

عالمگیر اورنگ زیب کے عہد کے قاضی محمود کی مثنوی مَن لگن کی کسی شخص نے فرہنگ تیار کی تھی 52۔ اس نے کتاب میں کسی بھی جگہ اپنے نام کو ظاہر نہیں کیا ہے۔ البتہ یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ کام اس نے نواب شہامت جنگ کی ایما سے کیا ہے۔ افسر امروہوی نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ:

''نواب شہامت جنگ حیدر آباد دکن کے ایک رئیس اور سہ ہزاری منصب دار تھے۔
انھیں نواب محبوب علی خاں نے یہ خطاب دیا تھا''۔52

فرہنگ کے مخطوطہ کے بارے میں جو کتب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی میں ہے افسر مرحوم نے کہا ہے کہ:

''مصنف نے ایک مختصر سا مقدمہ ابتدا میں لکھا ہے۔ جس میں سبب تصنیف بیان کرنے کے بعد زبانِ اردو کے بارے میں اپنی معلومات زیادہ نہ ہونے کا عذر کیا ہے۔ اس کے بعد مثنوی سَن نگن کے الفاظ اور معنی لکھے ہیں''۔

آغاز:

''سب تعریفاں اللہ تعالیٰ کی جو ہر مخلوق آئینہ اس کا ہے اور درود اور سلام نازل ہو... مجھ اوپر باعث عالم کے جو نوران کا ہر کاین سے باہر ہوا''۔

خاتمہ:

''باب الیا- یکساں- ایک شخص، یوز- چیتا، یکا- ایک یوک، نصیب، یکن- ایک، یکندر- یکساں اور تمام''۔

مخطوطہ کے آخر میں ترقیمہ نہیں ہے جس سے اس کے بارے میں کسی قدر معلومات کے حصول کا امکان تھا۔

مطبع شمس الامرا

عہد آصف جاہی کے معزز اور نام بر آوردہ اُمرا میں سے ایک ابوالخیر خاں تیغ جنگ بھی تھے۔ جن کا انتقال 1165ھ (1752) میں ہوا تھا۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے ابوالفتح خاں تیغ جنگ نے کارہائے نمایاں انجام دیے اور شمس الامرا کے خطاب سے ممتاز ہوئے۔ انھوں نے 1205ھ (1790) میں وفات پائی۔ ان کے فرزند محمد فخر الدین خاں 1194ھ (1780) میں برہانپور میں پیدا ہوئے اور بڑے ہو کر اپنے پدر والا قدر کے خطاب سے شرف یاب ہوئے۔ فخر الدین خاں شمس الامرا ثانی نے 1279ھ (63-1862) میں حیدر آباد میں رحلت کی۔

شمس الامرا ثانی کی توجہ سے حیدر آباد میں اردو نثر کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ انھوں نے یورپ کی مختلف زبانوں سے بھی علمی موضوعات سے متعلق کتابوں کے اردو میں ترجمے کرائے اور اپنے دار الترجمہ میں تیار ہونے والی کتابوں کی طباعت کے لیے ایک سنگی مطبع بھی قائم کیا جنوبی ہند میں اردو کی کتابوں کو چھاپنے والا پہلا مطبع یہی ہوا۔ نصیر الدین ہاشمی نے شمس الامرا کے دار الترجمہ میں تیار ہونے والی بائیس کتابوں کے نام درج کیے ہیں اور لکھا ہے:

''اس دور میں نہ صرف سائنس کی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں بلکہ کئی فنون کی کتابیں تصنیف

تالیف ہوئیں۔ تفسیر، فقہ، تاریخ، سوانح، فلسفہ، ریاضی، ہیئت، منطق وغیرہ ہر ایک فن کی کتابیں مرتب ہوئی ہیں"۔

شمس الامرا کی سرپرستی میں اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی کے زمانے میں جن لوگوں نے ترجمہ وغیرہ کا کام کیا تھا ان میں سے بعض کا احوال اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ مزید تفصیلات اگلی جلد میں آئیں گی۔

شمس الامرا نے اپنا سنگی مطبع بہ گمان غالب 1246ھ (1830) میں یا اس سے چند ماہ پیشتر خود اپنی ڈیوڑھی میں قائم کیا تھا۔ اس میں جو کتابیں پہلے سے چھپ کر شائع ہوئی تھیں ان میں سے ایک بدرالدین نامی کسی شخص کی تالیف علم عروض سے متعلق ہے۔

(2) اورنگ آباد

شہر اورنگ آباد کو دکن کے علاقے میں مرکزی حیثیت حاصل رہی تھی۔ لیکن انگریزی سیاست نے اس کی اس کیفیت کو بھی باقی نہیں رہنے دیا۔ جس زمانے میں دہلی میں اکبر شاہ ثانی تخت نشین تھے، اورنگ آباد میں راجا مہپت رام حاکم تھے۔ لیکن راجا کے خیال و عمل انگریزوں کو پسند نہیں تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ راجا ہی نہیں اس کے متوسلین بھی پریشان رہتے تھے، بعض لوگ دل برداشتہ ہو کر اورنگ آباد سے کسی دوسرے مرکز کی طرف چلے جاتے تھے، چنانچہ شیخ حفیظ بھی جو راجا مہپت رام کے مقرب تھے۔ بالآخر وہاں سے حیدرآباد چلے گئے تھے۔

اورنگ آباد کے شاعروں نے مثنوی کی صنف کی طرف توجہ زیادہ کی تھی، غزل محض رسمایا ضرورتاً کہہ لیتے تھے، نثر کو بھی اس مرکز پر فروغ حاصل نہیں ہو سکا تھا۔

1-شوق:

انھوں نے قصہ چار درویش کو زبان اردو میں نظم کیا تھا، اپنی اس مثنوی کو مکمل کر لینے کے بعد مصنف نے نثر میں اپنے حالات لکھنے شروع کیے تھے، ان کا خلاصہ یہ ہے:

''شوق تخلص، محمد علی نام، 1181ھ (1767-68) میں بہ مقام اورنگ آباد پیدا

ہوئے، تاریخ تولد نیک ذات سے نکلتی ہے، آباواجداد مشہد کے رہنے والے تھے،
1181

جد مادری کا وطن سبزوار تھا، شوق کے والد میر عبد السلام خاں تھے، جو 1185ھ (1771-72) میں اورنگ آباد چھوڑ کر حیدر آباد چلے گئے، وہاں پہونچنے کے دو تین سال بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا، شوق نے تاریخ کا ایک قطعہ کہا، آخری شعر یہ ہے۔

عیاں اسم تاریخ بے تعمیہ امارت پناہ میر عبد السلام

1188ھ (1774)

علوم فارسی وعربی کی تعلیم شوق نے شاہ محمد وزیر سے حاصل کی تھی۔ انھوں نے 1203 (1788-89) میں وفات پائی، شوق نے تاریخ کہی۔

قلم سال تاریخ تحریر کرد شدہ وصل جنت محمد وزیر

1203ھ

شوق کو کوئی تیرہ چودہ سال کی عمر میں شاعری کا شوق ہوا۔ اسد علی خان تمنا اور نگ آبادی سے مشق سخن کی۔

محمد علی خان شوق نے شاید سب سے پہلے قصہ چہار درویش کو زبان اردو میں نظم کیا تھا۔ ادارۂ ادبیات میں اس کا جو نسخہ ہے وہ ناقص الطرفین ہے۔ بہ صورت موجودہ اس کے شروع اور آخر کے دو دو شعر یہاں لکھے جاتے ہیں۔

ابتدا

تھا صحرائے محشر سادہ ہولناک تھی سوزندہ جوں آگ اس جا کی خاک
وہاں کی تو رہ تیغ سے تیز تھی وہاں کی ہوا تو شرر بیز تھی

خاتمہ

بمن گفت سال وفاتش خرد بہ بوئے جناں رفت صمصام جنگ

1196ھ

غرض چشم اسی غم سے تھی اشکبار کہ پہلا سفر ہوگیا رو بکار

2-عمر

ان کا نام معتبر خاں اور عمر تخلص تھا، اورنگ آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے مزید حالات کچھ معلوم نہیں۔ انھوں نے مثنوی یوسف زلیخا اردو میں لکھی تھی۔ جو تیرہ سطری مسطر پر سوا دو سو سے زیادہ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ سالِ تصنیف 1250ھ (1834) کے قریب خیال کیا گیا ہے۔ مثنوی اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

الٰہی غنچۂ امیدِ جاں کھول دیکھا آئینہ طوطی کی زباں کھول

مختلف تفسیروں سے حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ اخذ کر کے شاعر نے نظم کیا ہے۔ اس کے خاتمہ کے اشعار یہ ہیں۔

عمر اب ختم کر اس داستاں کو سخن گوئی سے ساکت کر زباں کو
نبیؐ پر بھیج صلوات وتحیات رکھ ان کا نام درد جاں دن رات

3-غلام نبی

یہ اورنگ آباد کے کوئی مجہول الحال شاعر تھے۔ جنھوں نے چھوٹی چھوٹی چند مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں اکثر عنوان فارسی میں ہیں۔ عربی زبان میں بھی ان کی ایک نعت لکھی ہوئی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ شخص صاحب علم تھا اور عربی، فارسی اردو تینوں زبانوں سے واقفیت رکھتا تھا۔ غلام نبی نے اپنے نام کو ہی تخلص کے طور پر نظم کیا ہے۔ ان کی جو منظومات دستیاب ہیں، یہ ہیں:

1- درود نامہ: اس میں درود شریف کی مختلف شکلیں، ان کو پڑھنے کے طریقے اور فائدے بیان کیے گئے ہیں۔ 3 اس کے موضوعات یہ ہیں:

حکیم سنائی کا خواب ایک فقیر کا یہودی سے سوال کرنا
یحییٰ بن معاذ کا ایک رات درود شریف کا ناغہ ہونا
عبداللہ بن عباس کی روایت ایک اعرابی کا رسولؐ مقبول کے پاس آنا
سید حسن رسول نما کا ارشاد مریدوں کو حلیہ وشمایل مبارک رسولِ مقبولؐ
اسناد اسمار رسول اللہ ﷺ

ابتدا

عجب کچھ فوائد کا صلوات ہے　　زیارت مدینہ کی ہر رات ہے
وہ روضہ مبارک کے قربان ہوں میں　　تصدق بہر لحظہ ہرآن ہوں میں

خاتمہ

نہ اتمام اسناد نام نبیؐ　　کہاں تک لکھے گا غلام نبیؐ
کیا نعت میں رب نے نازل کلام　　ہو بندوں سے کیونکر فضیلت تمام

2-دعانامہ:

اس مثنوی کا مصنف نے کوئی نام مقرر نہیں کیا تھا، یہ نام اُسے ڈاکٹر زور نے دیا ہے۔[4] ہر مہینے محرم، صفر وغیرہ میں مختلف موقعوں پر جن دعاؤں کا پڑھنا مناسب ہے ان کو عربی میں لکھا ہے، ہر دعا سے پہلے اور اس کے بعد اس کے فوائد اور طریقے نظم کیے ہیں۔

ابتدا

ارے گلزار معنی کے شناسا　　کہ نور گلستانِ نور آسا
خیابانِ عبادت کے جو ہیں گل　　نہ گل کر بلکہ کل کر شوق سے کُل

خاتمہ

درازی عمر ودولت آئے باقی　　عدن میں آپ ہیں کوثر کے ساقی
زقوت طاعت وروشن ہوں آنکھیں　　ضیا دل ہو بدن صحت ہوں آنکھیں
ظفر اعدا کے اوپر دیوے مولا　　عشا کے بعد رکعت بیس دولا

اس مثنوی کے اوراق بے ترتیب ہوگئے ہیں۔

3-سخاوت نامہ:

یہ مثنوی ناقص الاول بتائی گئی ہے۔ اس میں بخیلوں کی حکایتیں اور سخاوت کے فائدوں کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کا بھی اصل نام معلوم نہیں ہوسکا ہے۔ یہ نام ڈاکٹر زور نے اس کے مشمولات کے پیش نظر مقرر کیا ہے، خاتمہ کے اشعار یہ ہیں۔

یہ سُن بات دل کو لگی میرے آگ　　یکایک اٹھیں آنکھیں غفلت سے جاگ

لے آ سب ارم اس کے تئیں میں دیا کہا قوت بچوں کا کر بے ریا
مراج یہی حق کرے گا قبول ہوئی شاید اس سے سعادت حصول

اس مثنوی کے بعد چند صفحات میں اسمائے الٰہی کے ورد کے فوائد مثنوی کی صورت میں بیان کیے گیے ہیں۔

پہلی مثنوی کے اٹھارہ، دوسری کے بیس اور تیسری کے پچاس صفحے ہیں، ہر صفحے پر 21 سطریں ہیں۔ان تینوں کا زمانۂ تالیف قریب 1250ھ (1834) بتایا گیا ہے۔

4-ہمرنگ

انھوں نے سورۂ عَم کی تفسیر لکھی ہے،اس کے شروع میں اپنا نام بھی تحریر کیا ہے اس طرح:

''بہترین تفسیر حمد الٰہی ہے اور خوشتر تقریر نعت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم،

امابعد! بیت

عرض کرتا ہے دوستداروں سے آشنا یوں سے غمگساروں سے

زاویہ نشین کوچۂ گمنامی و بے استعداد طالب منصب وارستگی وآزادی فقیر عزیز اللہ ابن میر عالم الحسینی القادری النقشبندی اورنگ آبادی المتخلص بہ ہمرنگ عفا اللہ عنہ وعن والدہ''۔6

اس تفسیر کا سبب تالیف مصنف نے اس طرح قلم بند کیا ہے:

''جب دیکھا میں اکثر تفسیریں کلام اللہ کی زبان عربی اور فارسی میں واقع ہیں اور کم علمی بعضے اہل علم دریافت سے معنی ان کے مانع، اگرچہ بعضے عزیزوں نے زبان دکھنی وہندی آمیز میں تفسیر جزو اخیر کی لکھے ہیں لیکن بہ سبب الفاظ دکھنی کے لطف زبان ہندی کا پورا نہیں پاتا اور دل یاروں کا واسطے اس مطالعے کے رغبت کم لاتا اس واسطے خاطر قاصر میں اس فقیر کے آیا کہ تفسیر جزو اخیر کی زبان ہندی میں کہ بالفعل اورنگ آباد کے لوگوں کا محاورہ ہے لکھے اور بعض فوائد کہ دوسری تفسیروں میں نہیں ہیں کتب معتبرہ سے جمع کر کے اس میں داخل کرے کہ عوام اس سے باوجود قلت بضاعت کے فائدہ تمام اٹھاویں اور اس فقیر کو دعائے مغفرت میں یاد ولاویں''۔7

اس تفسیر کے بارے میں نصیرالدین ہاشمی نے اطلاع دی ہے کہ:

"یہ سورۂ عم کی تفسیر ہے مگر سورۂ الحمد شروع کو بھی شامل کرلیا اور نفس مضمون کے پہلے فائدہ کے عنوانات کے تحت بسم اللہ کے فضائل اور فوائد بیان کیے گئے ہیں"۔

اور اس کے خاتمہ کی عبارت حسب ذیل ہے:

"خدا کا احسان اور انعام اور نبیؐ پر درود وسلام کہ عون نہایت احمدی اور مدد روحانیت صمدی نے یہ تفسیر خوش تقریر تمام کی اور فکر قصیر کا اس فقیر کے پورا کام اب خدا کرے کہ محبوب انام کے ہووے اور مرغوب خاص اور عام کے قطعہ

محنت اور کوشش بسیار ستی اے ہمرنگ — جب یہ تفسیر تمام ہوئی بہ عونِ صمدی
نام میں چاہا رکھوں ایسا کہ نکلے تاریخ — فکر کر دل نے اُٹھا بول چراغ ابدی

1221ھ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے کتاب کا تاریخی نام "چراغ ابدی" رکھا ہے جس سے اس کا 1221ھ (1866) میں مکمل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

5- دودھ دلیا:

ہمرنگ کی یہ دوسری تصنیف ہے، اصلاً یہ مثنوی ہے۔ لیکن اس کا دیباچہ نثر میں لکھا ہے:

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ ذی الجود وَالکرام والفضل وَالانعام وَالصَّلاۃ وَالسَّلامَ عَلیٰ محمد ماحی الظلام وعَلیٰ آلہ الکرام وصحبہ العظام وحمد وسپاس الٰہی کا زبان جاں کی بے بہا مٹھای ہے کہ نان وحلوا کو دنیا کی اس کی نسبت لذت میں کچھ رسائی نہیں ..... یہ چند بیتیں بیان میں دودھ دلیے کے ہیں کہ باوجود بے استعدادی کے نفس کی بیداری کے فریادی فقیر عزیز اللہ ابن میر عالم الحسینی القادری النقشبندی اورنگ آبادی المتخلص بہ ہمرنگ احسن اللہ حالہ ومالہ محبوں سے اظہار کرتا ہے اور مخلصوں سے گوش گزار قطعہ

پارۂ الماس کی یہ بیتیں ہیں — ان کو آنکھوں سے دیکھنا لذت

سال تاریخ سنیے ہمرنگ سے دودھ دلیا ہوا ہے با لذت

1244ھ (1809)

اس مثنوی کا آغاز ان شعروں سے ہوا ہے ۔

اے پرستار ِ جہانِ پُر جفا اے گرفتارِ نگارِ بے وفا

بھول کر غافل نہ ہو یادِ وطن کان سے دل کے سُن اے پیمان شکن

مثنوی کے تعارف میں ڈاکٹر زور نے لکھا ہے:

"یہ ایک اصلاحی مثنوی ہے جس میں بے عمل علماء اور خود غرض مشائخین کی مذمت کی گئی ہے.... دنیا کی عام حالت کے اظہار کے بعد اصل موضوع شروع کیا ہے، جس میں زیادہ تر ان مشائخوں اور صوفیوں پر طنز کیا ہے جو گانے بجانے یعنی قوالی کو جائز سمجھتے ہیں، شاعر نقشبندی مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس لیے وہ قوالی کو ناجائز قرار دیتا ہے، مصنف شاعر سے زیادہ ناصح اور واعظ معلوم ہوتا ہے، کلام میں پختگی اور شستگی نہیں ہے، بلکہ بالکل خشک اور زاہدانہ ہے"۔

اس مثنوی کے خاتمے کے دو شعر یہ ہیں ۔

اس زمانہ میں جو ایماں سے گیا سو بڑا وہ سازوساماں سے گیا

بارہ سو تیئیس سنہ ہجری تمام تین سو تیرہ ہے بیتوں پر ختام

1223 313

اوپر جو شعر نقل کیا گیا تھا اس سے 1223ھ کے عدد برآمد نہیں ہوتے اس کی تاویل دو طرح سے کی جا سکتی ہے۔

اول یہ کہ بعض تاریخ گو ایک دو کے فرق کو جائز قرار دیتے ہیں اور دوم یہ کہ یہ مثنوی 1223 کے آخری دنوں میں شروع کی گئی ہو اور تکمیل کے وقت نیا سال شروع ہو گیا ہو، واللہ اعلم۔

مشفق خواجہ مرحوم نے ہمرنگ کی ایک اور مثنوی فقہِ منظوم کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ 1225ھ (1810) میں لکھی گئی تھی۔[9]

ہمرنگ اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ قاسم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان

بہت مختصر تھا:10۔

دیوان کہ بردو مجود کہ دیباچہ اس خود نوشتہ دور سنہ یک ہزار دو صد و ہشت بہ اشارۂ استاد کامل خود تدوین فرمودہ، ایں احقر مشاہدہ نمودہ"۔

استاد کا نام مولوی غلام کبریا اور کامل تخلص تھا، وہ مرشد آباد کے رہنے والے تھے۔

فائق کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمرنگ کا مزار بمبئی میں ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ آخر عمر میں وہ بمبئی چلے گئے تھے اور 1268ھ (1852) سے پہلے کسی وقت انھوں نے وفات پائی تھی۔

(3) کرنول

امیر ابن الامیر نواب غلام رسول خان بہادر کی سرپرستی میں اس زمانے میں کرنول کو بھی ایک قابلِ ذکر علمی وادبی مرکز کا درجہ حاصل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں نثر نویسی کی طرف زیادہ توجہ رہی ہے۔

1-سعید الدّین:

ان کے تفصیلی حالات معلوم نہیں۔ ان کے بارے میں فی الوقت جو کچھ کہا جاسکتا ہے یہ ہے کہ شاہ سعید الدین نام تھا۔ کرنول کے رہنے والے تھے اور اردو نثر پر قدرت رکھتے تھے، چنانچہ دو کتابیں ان سے یادگار ہیں:

1-تحقیق الایمان: افسر امروہوی نے اس کتاب کے بارے میں جو اطلاعات قلم بند کیے ہیں مختصراً یہ ہیں:

> ''شاہ عبدالحق دہلوی کی کتاب تکمیل الایمان کے مفصل بیانات کا شاہ سعید الدین نے اختصار کے ساتھ اردو میں ترجمہ کرکے اس کا نام تحقیق الایمان رکھا ہے، اس کتاب میں بہشت ودوزخ سزا وجزا گناہ کبیرہ کی تفصیلات کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کے جواز پر بھی بحث کی گئی ہے''۔1

ابتدا:

''حمد بے حد خاص اللہ تعالیٰ کو سزاوار رہے کہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کہ جس کی یگانگت کی دلیل راسخ ہے اور شکر وسپاس اُس ذات پاک کو بجا ہے کہ قُل ھُوَ اللّٰہ اَحَد اَللّٰہ الصّمد جس کی وحدانیت کی برہان واثق ہے''۔

خاتمہ:

''یعنی واقف رہو تم کہ تحقیق کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے، اور تحقیق کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے، اور رحمت کرنے والا ہے، شکر ہے اللہ تعالیٰ کا یہ رسالہ کا ختم خدا کے خوف اور امیدوار اس کی رحمت پر ہوا، عاقبت بخیر باد''۔

یہ کتاب ستّر ہے سطری مسطر پر پچانوے صفحوں پر محیط ہے، اور سالِ تصنیف اس کا 1240ھ (1824-25) ہے۔

2-مصباح الصّلاۃ:

یہ شاہ سعید الدین کرنولی کی دوسری کتاب ہے۔[2] یہ فتح محمد برہانپوری کی تصنیف مفتاح الصّلاۃ کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم کا کہنا ہے کہ جب میں تکمیل الایمان کے ترجمہ سے فارغ ہوا تو کئی مہربان دوستوں اور کرم فرماؤں نے مفتاح الصّلاۃ کا ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ یہ ترجمہ اس فرمائش کی تکمیل ہے۔ اس ترجمہ کے دیباچے میں مترجم نے نواب کی جو مدحت کی ہے اس کے مطالب اس طرح ہیں:

''نواب فلک جناب خورشید رکاب فطانت میں فلاطون، دانائی میں ارسطو، بہادری میں بہرام، عدالت میں نوشیرواں، سخاوت میں حاتم، شجاعت میں رستم، متشرع اکمل، دینداری میں بے بدل، ۔

خدا اس کی دولت کو قائم رکھے شہادت ورفعت کا دائم رکھے
عدالت سدا اس کا ہووے کثیر کہے سارے عالم یہ ہے بے نظیر
یہ حاکم سلامت رہے ماہ و سال ہر اک اس کے سایے میں پاوے کمال
الٰہی دعا میری کرنا قبول مقاصد تمام اس کے ہووے حصول

جتنے وصف امیری اور وزیری کے چاہئیں خدا نے ان کی ذات میں جمع کیا ہے۔ غرض قسمت کی خوبی ملک کرنول کی تھی۔ جو ایسا حاکم مسند نشیں ہوا۔ جس کے بیٹھنے سے ایک عالم راحت پایا اور انواع واقسام کی بدعت موقوف کرا کر شرعی احکام جاری کرایا۔ امیر ابن الامیر کریم ابن الکریم نواب غلام رسول خان بہادر دام اقبالہ کے عہد میں سن بارہ سو یکتالیس ھ (1825-26) میں صاف ہندوستانی زبان سے ترجمہ کیا"۔3

ڈاکٹر زور نے کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

"اس مصباح الصلاۃ کو چار ابواب اور چالیس فصلوں پر منقسم کیا ہے۔ اس کی زبان صاف اور سلیس ہے۔ یہ کتاب ایک سے زائد بار چھپ چکی ہے۔ اس میں طہارت اور نماز کے تمام مسائل بیان ہوئے ہیں۔ مترجم نے بیچ بیچ میں اپنے اشعار بھی تحریر کر دیے ہیں"۔

2-ظہور علی:

مولانا فضل رسول بدایونی نے مولوی اسماعیل شہید وغیرہ کی کتابوں تقویۃ الایمان اور کتاب التوحید کی غلطیوں کی وضاحت کی تھی۔4 ان کے ایک مرید محمد ظہور علی نے ان تفصیلات کو قلمبند کر لیا اور پھر ہندوستان کے مشاہیر علما وصوفیا سے اس مسئلہ میں جو مراسلت ہوئی تھی اس کو بھی اس میں شامل کر لیا اور اس طرح 1250ھ (1834) سے پہلے ایک رسالہ تیار کر لیا، اس کا نام انھوں نے "ردِ وہابیہ" رکھا۔

کرنول کے نواب نے بھی سید احمد شہید وغیرہ کے مسلک کو قبول کر لیا تھا اور وہ بھی انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے، لیکن جلد ہی انگریزوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے۔ اس کے بعد سید احمد شہید کے عقیدت مندوں کے لیے وہاں پر زمین تنگ ہو گئی اور ان کے رد میں جو رسالے لکھے گئے تھے وہاں بہت مقبول ہوئے۔ ظہور علی کا رسالہ ردِ وہابیہ بھی انھیں میں سے ایک تھا۔

3-شہوار:

پرانے شاعر تھے اور کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ کرنول کے رہنے والے تھے، خواجہ میر درد کے شاگرد حافظ تاج الدین مشتاق دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ ان کے ایک مسدّس

سے معلوم ہوتا ہے کہ سلسلہ قادریہ میں مرید تھے۔

آلِ رسولؐ فاطمہ کے دل کے چین ہیں　　اور مرتضیٰ علی کے یقین نور عین ہیں
پوتے حسن کے میرۂ حضرت حسین ہیں　　دینِ نبی کے نام خدا زیب وزین ہیں
میں سلسلہ میں قادریہ کے اسیر ہوں　　دل سے مرید حضرتِ پیرانِ پیر ہوں
ہیں چشتیاں گھرانے سے بس مجھ کو اعتقاد　　اور خاندان قادریہ کی ہے دل میں یاد
لوں نام دستگیر تو بر آتی ہے مراد　　شہوار ہوں سخن کے جواہر ملیں زیاد
گو فدوی معین وفرید ونصیر ہوں　　دل سے مرید حضرتِ پیرانِ پیر ہوں

شہوار حیدرآباد بھی گئے تھے لیکن وہاں انھیں کامیابی اور خوشحالی میسّر نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک مسدّس سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے وطن میں بھی وہ بے وطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور عموماً گرفتار درد ورنج ومحن رہے تھے۔

کجی کرے ہے اگر مجھ سے پیر چرخ کہن　　ہے تس پہ بدروشی کی روش پہ دور زمن
تمام اہل جہاں بھی اگرچہ ہیں دشمن　　بے فکر دل ہو گرفتار درد ورنج ومحن
مدد پہ اپنی جو شہوار ہینگے پانچوں تن　　محمدؐ است وعلی فاطمہ حسین وحسن
نہ کیوں کہ شہرۂ عالم ہو اپنی بے وطنی　　ہے باوجود سخنگوئی ہم بے سخنی
اگرچہ فکر سے مجھ کو وطن میں بے وطنی　　معنوں کے دل ہے غنی
مدد پہ اپنی جو شہوار ہینگے پانچوں تن　　محمدؐ است و اعلی فاطمہ حسین وحسن

شہوار صاحب دیوان شاعر تھے۔ لیکن ان کے دیوان میں اکثر غزلیں مستزاد اور سنگلاخ زمینوں میں ہیں۔ غزلوں میں مخمس، مسدّس اور ترکیب بند ہیں، زیادہ کلام آلِ نبیؐ کی منقبت، نوحوں اور مرثیوں پر مشتمل ہے۔ تعجب یہ ہے کہ شہوار کے دیوان میں جس کا سال ترتیب 1230ھ (1815) بتایا گیا ہے، ظفر اور ناسخ کی غزلوں کی تضمین بھی موجود ہے۔ دیوان ردیف وار مرتب ہے، باب الالف کی پہلی غزل کا مطلع یہ ہے۔

اے سائیں جی اس میل سے ہر بار ہمارا　　ہے　　عشق　　صدا　　را
اور سرگرد اَرنی کو سنا دیکھو خدا را　　ہے　　عشق　　صدا　　را

نظیر اکبر آبادی کے کلام کے پس منظر میں اگر شہوار اور بعض دوسرے دکنی شاعروں کے دواوین پر نظر کریں تو خیال ہوتا ہے کہ کلام کا فطری انداز یہی تھا زمانے کی روش اور استادوں کی تربیت کے فیض سے غزل گوئی کا چلن زیادہ سے زیادہ ہوتا گیا تھا۔ دکن کے علاقوں میں شاگردوں کی تربیت وغیرہ کا وہ طور نہیں تھا جو دہلی اور لکھنؤ وغیرہ میں رہا ہے۔ اس لیے یہاں غزل گوئی کو حاوی رجحان کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکی۔

4- جوہر:

نصیر الدین نقش نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''جوہر تخلص، ملک محمود، مولدش بیگن پلی، صاحب دو دیوان و تذکرہ، تلمیذ جناب حافظ محمد تاج الدین مشتاق علیہ الغفران، آوردہ اند کہ مشار الیہ بہ علتے از حسین علی خاں نواب بیگن پلی آزردہ شدہ در قمر نگر عرف کرنول رفتہ بہ ماہوار دو صد روپیہ نزد غلام رسول خاں نواب مرحوم بہ سلک ملازمت منسلک گردیدہ، ہمدراں جا انتقال یافت، کدامی دیوان بہ نظر راقم آثم نہ رسیدہ''۔

جناب افسر صدیقی نے ان کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ملک محمود کے بڑے لڑکے غلام حسن گوہر تخلص کرتے تھے اور دوسرے لڑکے غلام حسین کا تخلص شہوار تھا۔ شہوار تاریخ روسائے بیگن پلی کے مصنف ہیں''۔

روسائے بیگن پلی کے حالات شہوار نے متفرق طور پر لکھے تھے۔ ان کو کتاب کی صورت میں مرتب کرنے کا کام شہوار کے بیٹے شہباز نے کیا تھا اور اس کتاب کا سال تصنیف 1326ھ بتایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ شہوار اور دیوان شہوار (مرتبہ 1230ھ) کا مصنف ایک شخص نہیں ہو سکتا، دونوں کے درمیان زمانی فصل زیادہ ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ دونوں کے بزرگوں میں سے کسی کا تخلص جوہر تھا۔ اس میں جوہر اور شہوار کے معنوی ربط کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جوہر کا سال ولادت 1194ھ (1780) ہے۔ ان کے بیٹے کا دیوان 1230ھ (1815) میں مدوّن ہو جائے، یہ بات کسی طرح قرین قیاس نہیں ہے۔

جوہر نے اپنی مثنوی جوہرِ عشق میں اپنے حالات نظم کیے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے:

''ملک محمود جوہر تخلص عرب قوم نوایت میں حضرت جعفر طیار کی اولاد سے تھے۔ ان کے جدِ امجد ملا احمد علی عادل شاہ کے عہد میں بیجاپور آئے۔ ملا احمد کو اورنگ زیب نے کرنول کا قاضی بنا کر روانہ کیا۔ ان کے ایک بیٹے غلام علی نے کرنول میں سکونت اختیار کی۔ دوسرے بیٹے ملا محمود نے بنگن پلی کا رخ کیا۔ ان کے فرزند قاضی احمد وہاں کی مسند قضایت سے سرفراز ہوئے۔ ان کے بیٹے صبغۃ اللہ نے باپ کی جگہ لی۔ ملک محمود جوہر کے باپ قاضی عیدروس انھیں صبغۃ اللہ کے بیٹے تھے، عیدروس کے بڑے بیٹے بنگن پلی کے قاضی ہوئے۔ اس مقام پر جوہر نے بنگن پلی کے نوابوں مرزا محمد، فضل علی، حسین علی خاں، منصور الدولہ، احمد علی خاں کی جو ان کے خاندان کے مربی تھے، تعریف کی ہے۔ جوہر کے زمانے میں شہیار الملک بنگن پلی کے نواب تھے اور جوہر کے سرپرست بھی۔ جوہر کو افسوس تھا کہ انھیں وطن چھوڑ کر حیدرآباد آنا پڑا۔ نواب احمد علی خاں کی مدد سے وہ حیدرآباد میں بہرہ ور ہوئے۔ یہاں کے شاعروں کے فیض صحبت سے طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہوئی۔ اس وقت ان کے بھائی بند حیدرآباد اور کرنول میں موجود تھے''۔

حیدرآباد پہنچ کر جوہر نے ایک مثنوی جوہر عشق کے نام سے لکھی۔ حمد، نعت اور منقبت کے بعد انھوں نے ''توصیف نواب سکندر جاہ'' کے عنوان سے اشعار لکھے تھے۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

جہاں میں ہے مشہور اس کا خطاب　　نظام علی خاں سکندر نواب
وطن اس کا فرخندہ بنیاد ہے　　جو مشہور اب حیدر آباد ہے
خدایا بہ حقِ علیؓ ولی　　سلامت رہے دولتِ آصفی

جوہر عشق میں بقول ڈاکٹر زور صاحب پانچ ہزار ابیات ہیں اور غالباً اتنی طویل مثنوی حیدر آباد میں جوہر کے بعد کسی نے نہیں لکھی۔ مثنوی کے آخر کے چند شعر یہ ہیں۔

جو یہ سال ہجری ہے اے دوستو　　ہزار و دو صد اور چہل پر ہیں دو
بفضل خدا و رسول کرام　　کہ اس کا ہوا جوہر عشق نام

الٰہی جہاں میں یہ مشہور ہو　　مرا نام نیکی سے مذکور ہو
مرا قصہ جس کے ہو خاطر پسند　　خدایا تو کر اس کے طالع بلند

اس مثنوی کی زبان صاف اور سلیس ہے، بیان میں روانی اور دلکشی ہے۔ موقع بہ موقع شاعر نے صنعتوں وغیرہ کا بھی صَرف کیا ہے۔

5-واقف:

نصیرالدین نقش نے ان کا حال اس طرح لکھا ہے:

"واقف تخلص، بابا شاہ حُسینی عرف میراں صاحب مصنف قصہ چندر بدن ومہیار ومجموع العاشقین وصاحب دیوان است، از سکنائے بیگن پلی وکرنول، حال از جہان گذاراں وداع شد"۔

اس کی مثنوی چندر بدن ومہیار کے کئی قلمی نسخے انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانے میں محفوظ ہیں 11۔ اس کا سال تصنیف 1227ھ (1812) بتایا گیا ہے، کراچی میں جو نسخے محفوظ ہیں ان میں سے ایک تصنیف کے صرف دو برس بعد کا لکھا ہے۔ یعنی اس کی کتابت 1229ھ میں ہوئی تھی۔

اس مثنوی میں ابواب کو جلوہ کہا گیا ہے، مثلاً:

جلوۂ اول: حمد میں　　جلوۂ دوم: مناجات میں
جلوۂ سوم: نعت میں　　جلوۂ چہارم: منقبت حضرت علیؓ میں
جلوۂ پنجم: منقبت حضرت گیسودراز میں　　جلوۂ ششم: سکندر جاہ ولی حیدرآباد کی تعریف میں، وغیرہ

مصنف کا کہنا ہے کہ مقیمی نے اپنی مثنوی دکھنی زبان میں لکھی تھی۔ اس کے زمانے میں زبان ہندی (اردو) کا چلن ہے۔ اس لیے اس نے اس قصہ کو اپنے وقت کی مروّجہ زبان میں نظم کیا ہے۔

اس مثنوی میں حمد کے دو شعر یہ ہیں ۔

تری ہی ذات کو یارب بقا ہے　　بجز تیرے جو کچھ ہے فنا ہے
نہ والد والدہ تجھ کو وَلَد ہے　　خداوند تو اَللہ الصَّمد ہے

تاریخ اختتام شاعر نے اس طرح نظم کی ہے ۔

سنہ ہجری سے دیکھا میں نے الحال تھا بارہ سو بو ستائیسواں سال

1227ھ

اہلِ کرنول کی اس زمانے میں زبان خاصی حد تک صاف تھی۔ البتہ اکثر لفظوں کا تلفظ قدیمانہ تھا۔

حواشی

(1) حیدرآباد

1-نقش	ص87
2-ایضاً	ص162تا163
3-تذکرہ مخطوطات جلد1	ص105
4-گلشن بے خار	ص61
5-مخطوطات آصفیہ جلد1	ص39
6-تذکرہ مخطوطات جلد1	ص203
7-نقش	ص60تا61
8- گلشن بے خار	ص30
9- ایضاً	ص109
10- ایضاً	ص114
11-اردو مخطوطات انجمن جلد5	ص99تا101
12- ایضاً جلد5	ص298
13-گلشن بے خار	ص15
14-نقش	ص28
15-اردو مخطوطات آصفیہ جلد1	ص130
16-اردو مخطوطات انجمن جلد5	ص218

17- نقش ص95

18- اردو مخطوطات آصفیہ جلد 1 ص49 ت 50

19- گلشن بے خار ص176

20- نقش ص149

21- ایضاً ص94

22- تذکرہ مخطوطات جلد 1 ص160 ت 162

23- ایضاً جلد ا ص163

24- نقش ص105

25- اردو مخطوطات انجمن جلد 6 ص10 ت 11

26- نقش ص117

27- تذکرہ مخطوطات جلد 4 ص266 ت 229

28- اردو مخطوطات آصفیہ جلد 2 ص268

29- اردو مخطوطات آصفیہ جلد 1 ص53 ت 54

30- تذکرہ مخطوطات جلد 1 ص233 ت 234

31- ایضاً جلد 3 ص60 ت 61

32- ایضاً جلد 2 ص53

33- اردو مخطوطات آصفیہ جلد 1 ص234 ت 235

34- تذکرہ مخطوطات جلد 1 ص371

35- اردو مخطوطات آصفیہ جلد 1 ص371

35- اردو مخطوطات انجمن جلد 5 ص167 ت 169

37- اردو مخطوطات آصفیہ جلد 1 ص218

38-اردو مخطوطات انجمن جلد5 ص187

39- تذکرہ مخطوطات جلد3 ص337

40-دکن میں اردو ص505

41-تذکرہ مخطوطات جلد3 ص55تا60

42-اردو مخطوطات آصفیہ جلد2 ص34

43-ایضاً جلد2 ص36

44-اردو مخطوطات انجمن جلد2 ص30تا32

45-اردو مخطوطات آصفیہ جلد2 ص51تا53

46-تذکرۂ مخطوطات جلد1 ص164تا165

47-ایضاً جلد1 ص165تا167

48-ایضاً جلد1 ص166تا167

49- اردو مخطوطات آصفیہ جلد1 ص238،ص273

50- تذکرۂ مخطوطات جلد1 ص272 وجلد4 ص207

51-اردو مخطوطات انجمن جلد2 ص200تا201

52-ایضاً جلد6 ص61

53-دکن میں اردو ص520تا523

(2)اورنگ آباد

1-تذکرۂ مخطوطات جلد1 ص119تا121

2-اردو مخطوطات آصفیہ جلد1 ص91

3-تذکرۂ مخطوطات جلد5

4-ایضاً جلد5 ص230تا232

5-ایضاً جلد5	ص231 تا232
6-اردو مخطوطات آصفیہ جلد2	ص31 تا32
7-بمبئی کے اردو مخطوطات	ص24 تا26
8-ایضاً	ص258 تا259،
تذکرۂ مخطوطات جلد2	ص109 تا110
9-جائزہ مخطوطات جلد1	ص532
10-مجموعہ نعت جلد2	ص532

(3) کرنول

1-اردو مخطوطات انجمن جلد2	ص68 تا70
2-ایضاً جلد2	ص151 تا152
3-تذکرہ مخطوطات جلد5	ص145 تا146
4-ایضاً جلد3	ص258 تا263
5- تذکرہ مخطوطات جلد3	ص258 تا263
6-نقش	ص56 تا57
7-نقش	ص197
8-اردو مخطوطات انجمن جلد3	ص19
9-تذکرہ مخطوطات جلد3	ص221 تا224
10-نقش	ص174
11-اردو مخطوطات انجمن جلد5	ص55 تا58

کرناٹک

اور

متعلقات

(1) میسور	432
(2) کرناٹک	449
(3) مدراس	473

(ا) میسور

1-حیات—میر محمد حیات 433
2-عبدالغفور 446

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ان کے بیشتر اخلاف کلکتہ میں آ کر سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ اور میسور کی رونقیں رفتہ رفتہ سب مٹ گئیں۔ کچھ مدت کے بعد جب حالات معمول پر آئے تو اہل دانش نے اس علاقے کے مذہبی معاملات کی طرف بھی توجہ کی۔

1-حیات

میر محمد حیات نام تھا، میسور کے رہنے والے، اپنے زمانے کے بڑے عالموں میں سے تھے۔ اپنے نام کی برکت سے لمبی عمر پائی تھی۔ غلام محمد علی عبدالرؤوف بہ امیران امیر مسوری نے ان کی وفات کی تاریخ کہی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 1281ھ (1864-65) میں انھوں نے رحلت کی تھی۔

از سر آب حیات اے بہ امیراں خضرم — آہ صد آہ حیات دو جہاں رفتہ بگفت

2 + 1279=1281ھ

میر حیات اردو نظم و نثر دونوں پر قادر تھے۔ انھوں نے دونوں میں چھوٹے بڑے متعدد رسالے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان رسالوں کو کسی نے یکجا کر دیا ہے اور اب اس مجموعہ کی کیفیت اس طرح ہے:

''اس کتاب کے تین مجموعے ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

مجموعۂ اول: عشر العشرہ نام ہے، اس میں دس رسالے ہیں۔

مجموعۂ دوم: حضرات خمسہ نام ہے، اس میں پانچ رسالے ہیں۔

مجموعہ سوم: کشف کبریٰ نام ہے، اس میں تین رسالے ہیں۔"

یہ تمام کتاب آیات واحادیث کا ترجمہ ہے، یہ مجموعہ بنگلور سے چھپ کر شائع ہوا تھا، سرورق پر اس کا نام اس طرح تحریر ہے:

"اضافات بقطب دائرۂ ولایت حضرت مولانا میر محمد حیات صاحب قدس سرہٗ

کتاب المسمّٰی مصباح الحیات"

طباعت کا سال کہیں درج نہیں ہے۔ حضرت مولانا نہال مخدومی ساکن کڑپہ نے، خدا ان کے درجات بلند تر کرے از راہ علم نوازی یہ مجموعہ راقم کے پاس ارسال کیا تھا۔ ذیل میں ترتیب وار ہر رسالہ کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے۔

1-سراج العقائد-منظوم

ابتدا:

کروں ابتدا میں بحمدِ خدا عدم سے ہمیں اُس نے پیدا کیا

اس رسالہ میں جن عقائد کا بیان کیا گیا ہے ان میں سے بعض یہ ہیں۔

اولو العزم چھ ان میں افضل تمام بھی ان میں محمدؐ علیہ السلام
ہیں نوح اور ابراہیم وآدم صفی ہیں موسیٰ وعیسیٰ محمدؐ نبی
نبوت خدا ختم اُن پر کیا بھی اس تن سے معراج اُن کو دیا
سب اصحاب میں چار ہیں یک دلی ابو بکر وعمر، عثمان وعلی

خاتمہ

حیات یہ قاعدہ لکھا مختصر کہو اپنے دل سے دعا خیر کر
سراج العقائد ہوئی اب تمام بحقِّ محمدؐ علیہ السلام

تمام شد سراج العقائد بر مذہب سنت جماعت۔

2-سراج الفقہ منظوم

ابتدا:

کہو دم بدم حمد سبحان کا کہ ہے قوت مرے دل وجان کا

اس میں متعدد عنوانوں کے تحت فقہ کے مسائل کا بیان کیا گیا ہے، بعض عنوان یہ ہیں:

1-در بیان عقیدہ　　2-در بیان پنج فرض بنائے اسلام

3-در بیان چہار مذہب سنت و جماعت　　4-در بیان اقسام وضو

5-در بیان فرائض وضو　　6-در بیان سنت ہائے وضو

خاتمہ کے دونوں شعر معمولی سے فرق کے ساتھ وہی ہیں، یعنی۔

حیات اس فقہ کو لکھا مختصر　　کبھو دل سے اپنے دعا خیر کر

سراج الفقہ اب ہوئی ہے تمام　　بحق محمد علیہ السلام

نصیر الدین ہاشمی نے بغیر کسی حوالے کے اس کا سال تصنیف 1244ھ (1828-29) لکھا ہے۔1

3-مرآت الاحکام-منظوم

ابتدا:

اللہ اللہ ذکرِ حق ایمان ہے　　مصطفیٰ کا نعت میرا جان ہے

اس میں بھی الگ الگ احکام کے بیان کے لیے الگ الگ عنوان قائم کیے ہیں، مثلاً:

1-در بیان بنائے اسلام　　2-در بیان احکام نکاح

3-در بیان احکام رضاع　　4-در بیان احکام طلاق

حاشیہ پر بعض مسائل کی وضاحت نثر میں بھی ہے، مثلاً:

سن بیاں طلاقِ رجعی کا یقیں　　تا کہے تک اس کے تیں طلاق نہیں

حاشیہ: ''یعنی دو طلاق تک رجوع جانے، جب تین طلاق دئے بغیر حلال کے جائز نہیں،

اس رسالے کا اختتام اس طرح کیا ہے

در بیانِ خاتمہ

اس فقہ کو لکھا ہے سید حیات　　تو دعا کر حق میں اس کے دل کے ساتھ

اے خدا ایمان پر کر خاتمہ　　اب بحق مصطفیٰ اور فاطمہ

مرآت الاحکام ہوگئی اب تمام مصطفاؐ پر ہو درود اں اور سلام
تمام شد کتاب مرات الاحکام"۔

4-تاج الفرایض- منظوم

ابتدا:

اللہ اللہ تو ہے خیرُ الوارثین ہیں محمدؐ رحمتٔ لِلعالمیں

اس میں بھی فرائض کا بیان الگ الگ عنوانوں کے تحت نظم کیا ہے۔ جہاں کوئی مسئلہ آ گیا وہاں اس پر بطور عنوان "مسئلہ" لکھ دیا ہے، دو ایک عنوان یہ ہیں:

در بیان احکام الفرایض در بیان مراتب اقسام ورثہ

اول از اصحاب فرایض پدر است دوم از اصحاب فرایض جد صحیح است

سوم از اصحاب فرایض مادر است چہارم از اصحاب فرایض جدّ صحیحہ است

آخری عنوان یہ ہے: در بیان ذوی الارحام

اس رسالے کے خاتمے کے دو شعر یہ ہیں ۔

گرچہ ہے یہ مختصر تفصیل سات اس قدر بچوں کے تیں ہے بس حیات

بھائی جاں تاج الفرایض ہوگئی تمام مصطفیؐ پر ہو درود اں اور سلام

تمام شد تاج الفرایض

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نظمیں حیات نے بچوں کی تعلیم کے لیے لکھی تھیں۔

5-تاج النصائح منظوم

ابتدا

رَبّنا یا رَبّنا یا رَبّنا کس زباں سے ہو سکے تیری ثنا

اس رسالے کے مباحث یہ ہیں:

در بیانِ علم در بیان محبت در بیان ذکر حق در بیانِ رضائے حق

در بیان شرم و غیرت در بیانِ احسان

خاتمہ اس رسالے کا اس طرح ہے:

بھائی جان تاج النصائح ہوئی تمام مصطفیؐ پر ہو درود اں اور سلام

تمام شد تاج النصائح

6-آدابِ سعادت۔ منظوم2

ابتدا۔

یا اِلٰہی یا رَحیمی یا کریم یا قدیمی یا حکیمی یا علیم

اس کے موضوعات اس طور پر ہیں:

در بیانِ آداب حق تعالیٰ در بیانِ آداب رسول علیہ السلام

در بیانِ آداب اصحاب محمد مصطفیؐ دائمہ اربعہؓ

در بیان آداب پدر و بزرگانِ دیگر

اس کے خاتمہ میں حیات نے اپنے رسالوں اور خود اپنے بارے میں بعض باتیں کہی ہیں،

''در بیانِ خاتمۂ کتاب

نا مجھے ہے لفظ و معنی کی خبر نا ردیف اور قافیہ پر ہے نظر

بھائی جان ہے نام میرا سن حیات یہ دعا کر حق میں اس کے دل کے سات

اے خدا ایماں پہ اس کا خاتمہ کر بحقِ مصطفیؐ اور فاطمہؓ

بھائی آداب السّعادت ہوئی تمام مصطفیؐ پر ہو درود اں اور سلام

تمام شد کتاب آدابُ السّعادت''۔

7-احوال النبیؐ۔ منظوم

ابتدا:

اللہ اللہ وردِ جاں ہے دَمبدم او کیا موجود، ہم سب تھے عدم

اس رسالے کے بیانات اس طور پر ہیں:

در بیان فضایلِ احوالِ محمد علیہ الصلاۃ والسلام

در بیانِ فضایلِ محمد نبی علیہ الصلاۃ والسلام

در بیان موجبِ خلقت محمدی علیہ الصلاۃ والسلام

در بیان ولادت نبی علیہ الصلاۃ والسلام

یہ رسالہ ''در بیان فضیلت درود خواندن'' پر ختم ہوتا ہے، اس بیان میں یہ اشعار بھی ہیں۔

پڑھ درود اں مصطفیؐ پر اے پسر ہووے تیرا خاتمہ ایمان پر
جو درود اں اُن پہ بھیجے با صفا اُس کے حامی ہیں محمد مصطفیؐ
پڑھ درود اں مصطفاؐ پر اے حیات پائیگا تو رحمتِ حق اور نجات
بھائی احوالِ نبیؐ اب ہوئی تمام مصطفیؐ پر ہو درود اں اور سلام

تمام شد احوال النبیؐ

ان میں سے پہلے شعر سے یہ بات بخوبی ظاہر ہے کہ یہ رسالہ بھی حیات نے بچوں ہی کے لیے لکھا تھا، تعجب ہے کہ اس کے تعارف میں نصیر الدین ہاشمی نے مصنف کا نام ''محمد حیات خاں حیات'' لکھا ہے۔

8-نور الہدایہ-منظوم

ابتدا:

یا الٰہی یا الٰہی یا رَحیم یا حَکیمی یا حَکیمی یا کَریم

اس رسالے کے مطالب کی تقسیم اس طور پر کی گئی ہے:

در بیان ایمان در بیان موجبِ خلقت انسان
در بیان گفتنِ قابضِ ارواح پیش از قبضِ روح
در بیان فریب دادنِ ابلیس در حالتِ سکرات

آخری بیان ذیل کے عنوان سے نظم کیا ہے:

در بیان شفاعت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم، اور اس کا آخری شعر یہ ہے۔

بھائی جان نور الہدایہ ہوئی تمام مصطفاؐ پر درود اں اور سلام

تمام شد کتاب نور الہدایہ

9-شفاعت نامہ-منظوم

ابتدا:۔

اللہ اللہ ہے تو رحمٰن اور رحیم تو عطا کر ہم کو راہِ مستقیم

اس کے بیانات اس طور پر ہیں:

در بیان خصوصیت شفاعت رسولِ مقبولؐ

در بیان شفاعت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم

اختتام:

اب شفاعت نامہ یہاں سے ہے تمام مصطفاؐ پر درود اں اور سلام

تمام شد شفاعت نامہ

10-دیدار نامہ منظوم

ابتدا:

اللہ اللہ اوّل وآخر توئی اللہ اللہ باطن وظاہر توئی

اس رسالہ میں عنوان اس طور پر قلمبند کیے گئے ہیں:

در بیان اثبات رؤیت او تعالیٰ در بیان تجلی نمودن حق تعالیٰ

در بیان دیدار دادن حق تعالیٰ در بیان کیفیت تجلیِ عام

اس کے خاتمے کا شعر بھی ویسا ہی ہے۔

ہوگیا دیدار نامہ اب تمام مصطفاؐ پر ہو درود اں اور سلام

تمام شد دیدار نامہ

یہاں پر اس مجموعہ کا پہلا حصہ جو دس نظموں پر مشتمل ہے اور جس کا نام عشرۃ المبشرہ ہے ختم ہو جاتا ہے۔

11-تاج العقیدہ منظوم

میر محمد حیات کی تصانیف کے دوسرے حصے یعنی حاضراتِ خمسہ کی یہ پہلی نظم ہے۔ یہ نظم بھی مثنوی کی صورت میں ہے اور اس میں کُل اکتیس شعر ہیں۔

ابتدا:۔

حمدِ حق کے بعد ہے نعتِ رسولؐ اس بیاں کو دل سے کر اپنے قبول

اس میں اسلام کے پانچوں ارکان اور ختم نبوت، معراج، اور طہارت وغیرہ سے متعلق مضامین نظم کیے گئے ہیں۔ آخری شعر یہ ہے ۔

ہو گیا تاج العقیدہ اب حیات　　پڑھ درود اں مصطفاؐ پر، ہے نجات

تمام شد تاج العقیدہ۔

12-شرف الایمان

یہ حاضرات خمسہ کے سلسلے کا دوسرا رسالہ ہے۔ اس میں قرآن پاک کی بعض آیتوں اور حدیثوں وغیرہ کا اردو نثر میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

ابتدا: ۔

''اشہد أن لا إلٰہ الا اللہ...الخ

تصدیق دل سے بولتا ہوں میں جو نہیں ہے کوئی معبود اور موجود مگر اللہ ہے۔ جو ایک ہے اور بے شریک ہے اور تصدیق سے بولتا ہوں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم بندے خدا کے اور پیغمبر خدا کے ہیں۔ اے عزیز محمدؐ کی ثنا میں اور فضیلت میں تمام قرآن شریف ہے، اس کی دو آیتیں یہ ہیں''۔

اس رسالے میں چاروں خلفا اور اصحاب کبار کی بزرگی اور فضیلت کا بیان نثر میں کیا گیا ہے، خاتمہ میں یہ دو شعر ہیں ۔

یہ حدیثاں صحیح ہیں اور مشہور　　ہے لکھا اس کے تئیں حیات ضرور

شرف الایماں ہے جو اس کا نام　　ہو نبیؐ پر درود اور سلام

13-نجات نامہ

یہ بھی نثر میں ہے اور پہلے رسالے سے مربوط ہے۔ چنانچہ عنوان اس طرح قائم کیا گیا ہے:

''اختتام کتاب شرف الایمان وآغاز کتاب نجات نامہ''۔

ابتدا:

''اشہد أن لا إلٰہ إلا اللہ ....الخ معنی کلمہ کا یہ ہے۔ تحقیق عبادت کا لینا

اللہ کو سزاوار ہے۔ وہ ایک ہے، اس کو شریک نہیں ہے، محمد پیغمبر برحق ہیں۔
شرطاں ایمان کی دو ہیں۔ عقل اور بلوغ اور ارکان ایمان کے دو ہیں۔ دل
سے سچ جاننا اور زبان سے اقرار کرنا جو اللہ ایک بے شریک ہے، محمد صلی اللہ
علیہ وآلہ واصحابہ وسلم پیغمبر برحق ہیں"۔

اس رسالے میں تمام نمازوں کی تفصیل اور نکاح، ذبیحہ، فاتحہ، وغیرہ کے طریقہ کا بیان کیا گیا ہے۔ رسالے کا اختتام ان شعروں پر ہوا ہے۔

ہو گیا ہے نجات نامہ اب کر قبول اس کے تئیں یارب
بضرورت لکھا ہے اس کو حیات ہو نبیؐ پر درود اور صلوات
تمام شد نجات نامہ۔

14 -نور الاسلام۔ اردو نثر

آغاز:

"بعد حمد خدا کے اور نعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے فقیر عرض کرتا ہے جو جس قدر حدیثاں سیکھنا اور سکھانا ہر ایک مومن پر لازم اور واجب ہے اس قدر مختصر کیا ہے تا مومن راہ ہدایت کی لیویں، اور امید نجات کی پاویں، قولہ تعالیٰ: ﴿فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَالنُّورِ الَّذِي أَنْزَلْنَا﴾ فرمایا: ایمان لاؤ تم اللہ پر اور رسول پر اس کے اور ایمان لاؤ تم قرآن پر جو نازل کیا ہم نے اوپر حضرت محمد صلعم کے، اے عزیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں....."۔

اس رسالے کے مطالب کئی فصلوں میں منقسم ہیں، مثلاً

فصل کلمہ کے بیان میں فصل وضو کے بیان میں
فصل بیان میں نماز جماعت کے فصل بیان میں روزے کے

اس کا خاتمہ بھی اسی طور پر دو شعروں پر مشتمل ہے نظم

ہوگئی اب یہاں حدیث شریف ہے لکھا اس کے تئیں حیات نحیف
نور الاسلام ہے جو اس کا نام ہو نبیؐ پر درود اور سلام
تمام شد نور الاسلام۔

15-ہدایت نامہ اردو نثر

یہ اس حصۂ حاضرات خمسہ کا آخری رسالہ ہے، اس کا عنوان اس طور پر قائم کیا گیا ہے:

''شروع ہدایت نامہ--- سوالاں عیسائی کے اور جواباں محمدیؐ کے ہیں۔ حوالہ سطر اور کتاب سبب اختصار کے ترک کیا گیا ہے''۔

ابتدا:

''ایک روز عیسائی اور محمدی ایک جاے بیٹھے تھے۔ گفتگو میں عیسائی نے محمدیؐ سے کہا کہ میرے چند سوال یہ ہیں۔ اگر اس کا جواب دو تو میں تمھارے دین کو برحق جانوں گا۔ لیکن جواب مختصر ہووے، محمدیؐ نے کہا میں حاضر ہوں، سوال کرو''۔

اس کے بعد عیسائی کے سوال اور پھر محمدی کے جوابات قلم بند کیے گیے ہیں، رسالے کے آخر میں مذکور ہے کہ:

''عیسوی نے محمدی سے جواب باصواب سن کر کہا مذہب تمھارا برحق ہے، محمدی شکر اللہ کا کرتا ہے۔ نام اس رسالہ کا ہدایت نامہ رکھا ہے اور بھائیوں کے حق میں کہتا ہے! اے بھائیو... دین محمدی پر ثابت قدم رہو.... اس قادر مطلق سے ڈرو جو جان اور جسم دونوں کو جہنم میں ہلاک کرے''۔

''تمام شد ہدایت نامہ''۔

16-مفتاح الایمان منظوم

یہاں سے تیسرا مجموعہ کشف کبریٰ شروع ہوتا ہے، جس میں تین رسالے شامل ہیں۔ ان میں سے پہلا رسالہ مفتاح الایمان ہے، جو خاصا ضخیم ہے

ابتدا:

کروں میں نام اللہ در دِ جاں کا کہ وہ معبود ہے دونوں جہاں کا

اس رسالے کے مطالب کے عنوان اس طور پر ہیں:

در نعت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات

اول علم ایمان ہر عاقل و بالغ فرض است، و بدون درستی ایمان ہیچ طاعت سود نہ می دہد،

بدیر بطریق اجمال ایماں آوردن بر ہر مومن مسلماں فرض است۔

میر محمد حیات نے اس رسالے کے آخر میں گیارہ شعر خاتمہ کے اور سات شعر تتمہ کے لکھے ہیں، ان میں سے کچھ یہ ہیں:

در بیان خاتمۂ کتاب مفتاح الایمان

بحمد اللہ کہ یہ مفتاح الایمان ہوئی آخر بحق شاہِ عرفاں
سن ہجری ا تھا اسوقت اے یار ہزار ودو صد وچالیس پر چار

تتمہ زحسب حال گوید

نہ مجھ کو لفظ ومعنی کی خبر ہے ردیف وقافیہ پر نا نظر ہے
کبھی یک بیت دکھنی میں لکھا میں ضرورت اس کے تئیں دکھنی کیا میں
عوام الناس کی میں گفتگو پر لکھا ہوں صاف اس کو اے برادر
تکلف نہیں کیا ہوں دیکھ منظوم کہ تا ہر اک کو ہووے صاف معلوم

یعنی اس رسالے کا سال تصنیف 1244ھ (1828-29) ہے۔ باقی رسالے بھی اسی سال کے آس پاس لکھے ہوں گے۔

میر حیات نے شاعری کے اصول وضوابط کی پابندی کے بجائے زیادہ خیال یہ رکھا ہے کہ اس کے مطالب بآسانی عوام الناس کی سمجھ میں آجائیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے بول چال کی زبان اختیار کی ہے اور اس زبان کو اس نے دکھنی کہا ہے۔ یہی زبان اور طرز بیان میر حیات کے تمام رسالوں میں ہے۔

17- آبِ حیات۔ منظوم

برہان الدین جانم اور پھر ان کے فرزند امین الدین اعلیٰ نے کائنات اور تخلیق کائنات سے متعلق تمام معاملات ومسائل کو پانچ پانچ پر تقسیم کر کے فکر وفلسفہ کا ایک نیا سلسلہ جاری کیا تھا جو دکن کے علاقوں میں بہت مقبول ہوا تھا۔ میر محمد حیات بھی اسی مسلک کے قائل تھے۔ ان کی بیشتر تصانیف میں اس کا اظہار ہوا ہے۔ اس منظوم رسالہ میں انھوں نے اسی نقطۂ نظر کو مدلل انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اکثر مسائل کی توضیح کے لیے میر حیات نے موقع بہ موقع حکایتیں بھی

نظم کی ہیں۔

یہ منظوم رسالہ آبِ حیات چونکہ فلسفیانہ مباحث پر مبنی ہے۔ مولانا نہال مخدومی ساکن کڑپہ کی دلی خواہش تھی کہ اردو نثر میں اس کی شرح لکھ دی جائے، ان کی خاطر سے راقم نے یہ کام شروع کیا تھا، نصف سے زیادہ لکھ کر ان کی خدمت میں روانہ بھی کر چکا تھا۔ لیکن ان کی وفات کے بعد کام کا وہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا اور پھر جو کچھ لکھا تھا وہ بھی گاؤخورد ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

رسالہ آبِ حیات پانچ ابواب میں منقسم ہے، اس طرح:

باب اول: بیانِ نصیحت　　باب دوم: سلوک کے بیان میں

باب سوم: ارشاد کے بیان میں　　باب چہارم: توحید کے بیان میں

باب پنجم: تنزیل کے بیان میں

ہر باب میں مطالب کی تقسیم مختلف عنوانات کے تحت ہوئی ہے مثلاً باب اوّل کے کچھ عنوان یہ ہیں:

در بیان بیوفائی دنیا و جفائے آں　　در بیان مکارم اخلاق

در بیان خصوصیت عمل بہ موجب درجہ اوست

خصوصیتِ عمل کی وضاحت کے لیے ایک حکایت میں کہا ہے۔

بولتا ہوں پانچ درجے اب تمام　　دیکھ کس درجہ میں ہے تیرا مقام

اور وہ پانچ درجے یہ ہیں: حیوان، درندہ، شیطان، فرشتہ، انسان۔

ان کی کیفیت بیان کرنے کے بعد مرشد کہتا ہے۔

آہ جس درجے میں داخل ہو مُوئے　　حشر اس کا ہے اُسی درجے منے

حشر کے دن صورت و منزل مقام　　ہے اسی درجہ میں اس کو والسلام

خاتمہ نو شعروں پر مشتمل ہے، جس میں شاعر نے دعائیں کی ہیں آخری شعر میں کتاب کا نام نظم کیا ہے۔

نام اس کا دل کہاں آبِ حیات　　مصطفیٰؐ پر ہوں درود اں اور صلوات

18-کلید معرفت۔نثر

یہ اس جز کا آخری رسالہ ہے، اس کی ابتدا اس طرح کی ہے:

''اللہ اللہ تمام حمد خدا کو سزاوار ہے۔ جو حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مظہر اسم اعظم کا بنایا ہے اور اس کے نور سے دو عالم کو موجود فرمایا اور انسان کامل کو اصطلاحات دیا اور اس کو تمام اس کا مظہر کیا۔ بعد حمد خدا اور نعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہر ہوئے جو یہ اصطلاحات اولیا کے ہیں، رازِ مخفی اور کلید علم معرفت کی ہے، اس رسالہ میں ہر حرف سے ایک باب لکھا ہے، مثلاً

باب الالف ادب اس کو بولتے ہے	باب الباء بصیرت وہ ہے،
باب التاء توحید وہ ہے	باب ث نہیں ہے۔
باب الجیم جمع وہ ہے	باب الحاء حال وہ ہے

باب الیاء میں مصنف نے لکھا ہے:

''یافت وہ ہے، جو وجود اور ہستی حاضر ہے اور ناظر ہے سو وہ ہے سب اس کو ہے، غیر حق نہیں ہے، نہیں کو کچھ نہیں یاد وہ ہے، جو غیر حق کو فراموش کرنا اور دریائے نور میں غرق کرنا خودی کو گم کرنا ہے''۔

اس رسالہ کے خاتمہ میں یہ تین شعر ہیں نظم

یہ رسالہ بسکہ عالیشان ہے — یہ رسالہ معرفت کی جان ہے
یہ رسالہ ہوگیا ہے اب تمام — سن کلید معرفت ہے اس کا نام
ہے لکھا اس کو ضرورت سے حیات — مصطفیٰ پر ہوں درود اں اور صلوات

19-باب المغفرت۔نثر

یہ ایک اور مختصر سا نثری رسالہ ہے جس کے آخر میں تین اور مختصر رسالے شریک کیے گیے ہیں۔ باب المغفرت اس بیان سے شروع ہوتا ہے:

''بعد حمد خدا اور نعت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے ظاہر ہووے جو ہر ایک کو فرض ہے، یہ تین حال پر ایمان لانا جو حقیقت میں کلمۂ توحید پڑھتا ہے اور مومن برحق ہوتا ہے، جو کوئی یہ تین حالت پر ایمان نہیں لاتا ہے اور زبان سے کلمہ پڑھتا ہے وہ مومن

نہیں ہوتا ہے۔ جو کوئی یہ تین حالت سے واقف ہوتا ہے وہ ولی خدا کا ہوتا ہے''۔

اس تمہید کے بعد تینوں ''حال کا'' اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، خاتمہ میں دو شعر لکھے ہیں۔

اس عقائد کو لکھا سید حیات　　یاد اس کو جو رکھا پایا نجات
جان باب المغفرت ہے اس کا نام　　مصطفیٰ پر ہوں ورود اں اور سلام

اس کے بعد ملحقات شروع ہوتے ہیں جو تین ہیں:

دستورالایمان　　زادالایمان　　نورالایمان

یہ تینوں بھی نثر میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے آخر میں دو دو شعر کا خاتمہ ہے جس میں رسالہ کا نام نظم کیا ہے، سید محمد حیات کے یہ جتنے رسالے ہیں سب براہ راست مذہب سے متعلق ہیں۔ زبان سب کی صاف اور رواں ہے، البتہ بعض قدیم الفاظ اور محاوروں کا صَرف ہوا ہے۔ ان میں سے صرف ایک دو رسالوں میں سال تصنیف کا بیان ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مخطوطات کے زمانۂ کتابت وغیرہ پر خیال کر کے نصیر الدین ہاشمی نے ان سب کو 1250ھ (1834) سے قبل کی تصنیف کہا ہے۔

2-عبدالغفور

میسور کے نثر نگاروں میں ان کا نام بھی ملتا ہے۔ افسر صدیقی امروہوی نے ان کی ایک نثری کتاب تجلیات الانوار کے تعارف میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

''تجلیات الانوار نثر کی یہ تصنیف سید عبدالغفور قاضی لشکر سمستان میسور کی کاوش کا نتیجہ ہے، وہ سید اسماعیل حسینی عرف حضرت بادشاہ قادری الملتانی کے مرید و تربیت کردہ تھے، 1207ھ (1792-93) میں بنگلور سے میسور آگئے تھے۔ یہاں پر میر محبوب علی خان نقشبندی القادری کی مجلس علمی میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا، اسی مجلس کے بعض ساتھیوں کی فرمائش پر موصوف نے ذکر جناب ولایت مآب اور عقد خاتون شفاعت انصاب کا تمام و کمال صحیح رواجوں اور دلچسپ حکایتوں سے ایک مختصر رسالے میں تحریر کیا، اس کا نام تجلیات الانوار ہے.....اس کو پانچ تجلیوں میں ختم کیا ہے، اور ہر

تجلی کا نام مجلس رکھا ہے:

پہلی مجلس نورِ نبوت کی تجلی — دوسری مجلس نورِ ولادت کی تجلی

تیسری مجلس نورِ عصمت کی تجلی — چوتھی مجلس نورِ عقد با کرامت کی تجلی

پانچویں مجلس نورین رسالت کی تجلیاں۔ اس میں دو جلوے ہیں۔ پہلا جلوہ عترت طاہرہ کی محبت کی فرضیت دوسرا جلوہ محبت کی حقیقت کا اظہار

خاتمہ میں خاتم الخلفاء کی فضیلتیں

آغاز:

''حق سبحانہٗ تعالیٰ نے فرمایا ہے، کہ اللہ تعالیٰ روشن کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا مثال اس کا یہ کہ ایک محل یا ایک محراب میں قندیل، اس میں ایک چراغ ہے، وہ چراغ بیچ قندیل کے یوں نظر آتا ہے گویا ستارہ چمکتا ہے، وہ چاروں جہت کو نور سے اپنے پُر نور کرتا ہے''۔

اختتام:

''کوئی مجنوں کہلایا کوئی مقہور، کوئی ملعون کہلایا تو کوئی مکفور، کوئی روسیاہ کہلایا تو کوئی عاقبت تباہ، مثل مشہور ہے کہ ع

پھرا خدا کے جو خاصوں سے وہ خدا سے پھرا

وَالسّلام علیٰ مَنِ اتّبع الہُدیٰ ----الخ''۔

(2) کرناٹک

1-ممتاز	452
2-انتظام الملک احمد اللہ خان	452
3-عبدالصمد	453
4-افتخار-نجف علی خاں	455
5-نامی- عزیزالدین	455
6-حق گو	463
7-الفت-محمد الفت	464
8-نامعلوم	467
9-نادر	468
10-قادر-قادر خان	470
11-مومن علی	470
12-حقیقت	471

آصف جاہ نے نور الدین خاں گوپامئوی کو کرناٹک کا صوبے دار بنایا۔ 1157ھ (1744) میں ان کی وفات کے بعد عمدۃ الامرا والا جاہ محمد علی خان بہادر مسند نشین ہوئے۔ باوجود یکہ یہ اپنے وطن سے بہت دور مقیم تھے۔ انھوں نے اس علاقے میں شامل کے معاملات کو جاری کیا اور خود کو ''امیر الہند'' کہلانا پسند کیا۔ ان کے بعد ان کے صاحبزادے نے بھی اس روایت کو قائم رکھا اور وہ نواب والا جاہ امیر الہند ثانی کہلائے، شاہزادہ مرزا اظفری گورگانی نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

> ''ہم نواب والا جاہ ثانی کے مکان پر پہونچے، نواب صاحب ایک فرشتہ سیرت اور خوبصورت بزرگ معلوم ہوتے تھے، ایک مدت سے ہم ایسی صورتوں کے بھوکے تھے، حق تو یہ ہے کہ اس نو سال کے عرصے میں یعنی قلعہ مبارک سے نکلنے کے بعد سے اب تک ایک کو بھی نواب صاحب کی طرح صحیح طور پر اخلاق محمدی سے متصف نہ پایا، خدا انھیں تمام آسمانی اور زمینی بلاؤں سے محفوظ رکھے''۔1

امیر الہند ثانی کی وفات کے بعد ریاست پر بالآخر انگریزوں نے قبضہ کرلیا اور ایک معاہدہ کی رو سے احمد اللہ خان بہادر کو نبی یار جنگ عظیم جاہ انتظام الملک منتظم الدولہ خطاب سے مدراس کا بے ملک والی مقرر کردیا، 1234ھ (1819) میں ان کی رحلت کے بعد محمد متو رخاں اعظم جاہ بہادر مسند نشیں ہوئے۔ 1241ھ (1825-26) میں ان کا انتقال ہوا تو حالت شیر خوارگی میں نواب محمد غوث خاں اعظم تخلص ان کے جانشین ہوئے۔

کرناٹک کے ان نوابین کو حکومت وغیرہ کے معاملات سے تو کچھ زیادہ تعلق نہیں رہا تھا۔ البتہ ان کا یہ کارنامہ قابل ذکر ہے کہ وہ خود صاحبانِ قلم تھے، اور اہلِ علم کے قدر شناس بھی تھے۔ ان میں سے بعض کے تصنیفی کاموں کا اختصار کے ساتھ تعارف کرایا جا رہا ہے۔

1-ممتاز

یہ عمدۃ الامرا محمد علی خاں کے صاحبزادے تھے۔ ان کی وفات کے بعد 1210ھ (1795) میں مسند نشین ہوئے اور چھ برس بعد 1216ھ (1801) میں فوت ہوئے۔ صاحب دیوان شاعر تھے۔ ان کے دیوان کے انتخاب کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔ ان کا ایک شعر یہ ہے۔

ٹک دل سے تو حجاب کا پردہ اٹھا کے دیکھ ہر ذرہ آفتاب ہے اپنے مقام کا

ان کی خوبیوں کا اعتراف اظفری نے بھی کیا ہے۔ ان کی سرپرستی سے کرناٹک کے علاقے میں اردو شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ ان کے اخلاف کو بھی ان کے اثر سے تصنیف و تالیف کا شوق ہوا۔

2-انتظام الملک

احمد اللہ خاں ان کا نام تھا، نبی یار جنگ عظیم جاہ انتظام الملک منتظم الدولہ بہادر خطابوں سے ممتاز تھے۔ سرکار انگریزی نے انھیں مدراس کا بے ملک والی مقرر کیا تھا۔ ان کا زمانہ 1216ھ (1801) سے 1234ھ (1819) تک کا ہے۔ یہ کئی زبانوں سے واقف تھے۔ ان کی صرف ایک کتاب کا مخطوطہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے جس کا نام ہے:

''انتظام الکلام فی بیان حیوانات الحلال والحرام''3

نصیر الدین ہاشمی نے اس کے تعارف میں تحریر کیا ہے کہ:

''مذاہب اربعہ (یعنی حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ، حنبلیہ) میں جن جانوروں کا کھانا حلال یا حرام ہے ان جانوروں کے اسماء ہندی، فارسی، عربی، و ترکی زبان میں حروف تہجی پر مرتب کر کے جدولوں میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس مختصر رسالے میں جو جانور حلال یا حرام ہیں ان کو آئینہ کی طرح ظاہر کیا گیا ہے''۔

اس کتاب کا آغاز ان کلمات سے ہوا ہے:

''اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد--الخ....مسئلہ ذبح دو قسم پر ہے۔ اختیاری اور اضطراری، ذبح اختیاری وہ ہے کہ مابین صدر اور تھڈی کے چار رگوں کو کاٹیں''۔

اور خاتمہ کی عبارت یہ ہے:

''ایک روایت میں تین روز تک اور ایک روایت میں چالیس روز تک قید کریں، اور دانہ اور چارہ نادیویں، تمت بالخیر''۔

3-عبدالصمد

یہ نواب محمد علی خاں والا جاہ کے بھتیجے اور نواب شکوہ الملک نصیر الدولہ نصرت جنگ کے جن کا اصل نام عبدالوہاب تھا، بیٹے تھے، خود ان کا خطاب دلیر جنگ تھا، یہ امیر الملک نواب عماد الدین خان بہادر کے والد تھے[4]۔ صاحب علم اور علم دوست شخص تھے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآنِ پاک کی تفسیر ہے جو چار ضخیم جلدوں میں مکمل ہوئی ہے، نصیر الدین ہاشمی نے اس کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''تفسیر وہابی، جلد اول، صفحات 592، مولف نے بیان کیا ہے کہ عربی اور فارسی میں بہت ساری تفسیریں ہیں لیکن دکھنی میں کم ہیں، بلکہ نہیں ہیں۔ اس لیے انھوں نے یہ تفسیر قلمبند کی ہے،....ایک آیت لکھی گئی ہے اور اس کے بعد اس کے لفظی معنی لکھ کر پھر مزید توضیح اور صراحت کی گئی ہے۔ ضخیم تفسیر کو سہولت کی غرض سے چار جلدوں میں مجلد کیا گیا ہے''۔[5]

آغاز:

''اللہ تعالی بڑا صاحب ہے کہ تمام آسمان کا اور زمین کا اور فرشتوں کا اور بہشت کا اور دوزخ کا اور ان میں کی چیزوں کا اور تمام عالم کا پیدا کرنے ہارا اور گناہوں کا بخشنے ہارا آخرت میں اور پالنے ہارا اور دینے ہارا رزق کا، مال کا اور ملک کا اور آبرو کا اور فتح کا بندوں کو اور دعا کا قبول کرنے ہارا دنیا میں''۔

اس تفسیر کی چوتھی جلد کا اختتام ان کلمات پر ہوا ہے:

''اور میں شیطان کی بدی سے پناہ چاہتا ہوں اور وہ ایسا شیطان ہے کہ آدمیوں کی خاطر میں وسوسہ ڈالتا ہے، وہ شیطان جنات اور آدمیوں میں سے ہے''۔

تفسیر کی مجموعی ضخامت چھبیس سو بہتر صفحوں کی ہے۔ اس کا نام مصنف نے اپنے والد عبدالوہاب کی رعایت سے رکھا ہے۔ شاید اس کی تکمیل میں ان سے مدد لی ہوگی۔

قصص الانبیا:

یہ عبدالصمد خاں کا دوسرا بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے قلمی نسخے حیدرآباد اور کراچی میں موجود ہیں۔ سبب تالیف میں مصنف نے لکھا ہے:

''میں اُمت میں ایک گنہگار ہوں، اور میرا نام عبدالصمد، نواب عمدۃ الوہاب خان بہادر نصرت جنگ کا فرزند ہوں، اور عالم کو فایدہ ہونے کے واسطے قصص الانبیا کی کتاب دکھنی زبان میں نثر میں بنایا ہوں، اور کیتی پیغمبراں کا احوال اس کتاب میں نہیں تھا سو دوسری کتابوں میں سے لے کر داخل کیا واسطے عالم کے''۔6

عبدالصمد خاں نے یہ کتاب 1250ھ (1834) سے پہلے مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد کئی لوگوں نے قصص الانبیا لکھ کر شائع کیے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے عبدالصمد خاں کی کتاب سے فائدہ اٹھایا تھا یا نہیں، نسخۂ حیدرآباد کے کاتب محمد نظام نے اپنے ترقیمہ میں کہا ہے کہ:

''.....مگو دریں کتاب احوال حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از معراج شریف تا وفات شریف از کتاب احیاء القلوب مندرج شدہ''۔

اس کتاب میں کُل پینتالیس عنوانات ہیں۔

ابتدا:

''اللہ تعالیٰ ایک ہے اور بڑا ہے، اور اس سے کوئی شریک نہیں اور کون پیدا کرنے ہارا، اور پرورش کرنے ہارا اور مارنے ہارا اور حشر کے روز جلانے ہارا ہے، اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ایسے پیغمبر ہیں کہ سب پیغمبروں میں افضل ہیں''۔

اختتام:

''میں سات مرتبہ کعبہ کا طواف کیا اس واسطے اللہ تعالیٰ مجھ کوں بخشا، اللہ تعالیٰ جب حجاج بن یوسف کوں اپنے فضل وکرم سے بخشا تو دیسا ہی اپنے کرم سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بخش''۔

اس کتاب کا نسخہ کراچی اپنے زمانہ کتابت کے لحاظ سے قدیم تر ہے۔اس کی کتابت 319 صفحوں پر 24 جمادی الاول 1252ھ (1836) کو مکمل ہوئی تھی۔

4-افتخار

ان کا نام بخت علی خاں تھا۔اور یہ والا جاہ نواب محمد علی خاں کے داماد تھے۔8ان کی ایک بیٹی آشمہ نے تین مثنویاں لکھی تھیں:

گلبنِ مہ رخاں (گلشن عاشقاں) گلشن مہ وشاں اور گلشن شاہداں

افسوس ہے کہ خود افتخار کے حالات اور ان کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔

(2)

والا جاہی خاندان کو علم دوستی اور شاعر نوازی کے لیے بھی شہرت رہی ہے۔یہاں بعض ایسے شاعروں کا احوال لکھا جاتا ہے جو ان کے دامنِ دولت سے کسی نہ کسی طور پر متعلق رہے تھے۔

5-نامی

ان کا نام کسی نے کچھ اور کسی نے کچھ لکھا ہے، خود انھوں نے اپنی مثنوی نو بہارِ عشق میں کہا ہے۔

ہے بس عاجز عزیز الدین نامی کہ اس کو دو جہاں میں کر گرامی

یہ حامد علی خاں کے بیٹے تھے۔ارکاٹ میں 1181ھ (1767) میں پیدا ہوئے تھے۔ حافظ محمد حسین اور محمد باقر آگاہ سے تعلیم پائی تھی۔عمدۃ الامرا نے ملک الشعرا خطاب عطا کیا۔ان کے خاندان سے قرابت ہوئی تو مستقیم جنگ کہلائے۔مدراس میں 1240ھ (1824-25) میں فوت ہوئے اور ساحل سمندر کے قریب اپنے باغ میں مدفون ہوئے۔

نامی نے والا جاہی خاندان کے کئی نوابوں کا زمانہ دیکھا تھا۔اپنی پہلی مثنوی نو بہارِ عشق میں انھوں نے عمدۃ الامرا اوّل کی مدح میں کئی اشعار شامل کیے ہیں۔کچھ یہ ہیں:

مدح عمدۃ الامرا

حکومت کے صدف کا قیمتی دُر　　جناب عمدۃ الامرا بہادر
نت اس کی ذات سے ہر شخص خرم　　سراسر ہے وہ اخلاقِ مجسم
خدا اس کو کیا ہر فن میں ممتاز　　زمینِ شعر کا ہے وہ سرفراز
نہیں دیکھا ہے ایسا نیک سردار　　ہے اس کو خسروی جگ کی سزاوار

اظفری کے بیان کی روشنی میں نامی کے ان شعروں کو دیکھیں تو ان کی صداقت نمایاں ہوگی۔

مثنوی نو بہارِ عشق کے بارے میں خود نامی کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے ۔

کیا میں مثنوی ہندی زبان سے　　عیاں ہے کچھ نہیں حاجت بیاں سے
مگر قصداً کہیں دو چار جا میں　　بیاں دکھنی زباں سیتی کیا میں
کیا اس بحر میں فکر اک مہینہ　　تو ماہ نو سا نکلا یہ سفینہ
کہا میں اس کو در عینِ جوانی　　رکھے حق جگ میں دایم یہ نشانی
اگرچہ اولیں تصنیف ہیگی　　ولیکن قابلِ تعریف ہیگی

شاعر نے سالِ تصنیف کا بیان ان شعروں میں کیا ہے ۔

کیا جب خامہ گلریزی کو اتمام　　رکھا میں نو بہارِ عشق اسے نام
کہا تاریخ ہاتف از مسرّت　　کہا نامی نے یہ شیریں حکایت
سن ہجری تھے بارہ سو پہ گیارہ　　کہ میں اس مثنوی کے تئیں سنوارا

ڈاکٹر زور کا کہنا ہے کہ اس مثنوی میں ساڑھے تین ہزار اشعار ہیں۔

اس مثنوی کا ایک نسخہ کراچی میں بھی ہے جس کے بارے میں افسر صدیقی امروہوی نے لکھا ہے کہ:

"ابتدا بھی ناقص ہے، اور آخر بھی مکمل نہیں، کسی موقع پر کاتب لکھتے لکھتے بھی چھوڑ گیا ہے"۔

مثنوی میں حمد و نعت، مناجات، عمدۃ الامرا ان کی بہن اور بیٹے کی توصیف کے بعد فارسی کی

مثنوی شیریں خسرو کا منظوم ترجمہ کیا گیا ہے۔

2- بہارستان عشق: یہ نامی کی دوسری مثنوی ہے۔ 11 جس کا سال تصنیف اس نے اس طرح نظم کیا ہے ۔

دیکھ یہ سر سبز کشت اہل عشق　　پھر کہاں ہے یہ بہشت اہل عشق

1223ھ

اس میں اپنے بارے میں اس نے کہا ہے۔

مفت گذری عمر سی سالہ بری　　کچھ نہیں اب تک کیا طاعت تری

راقم کے خیال میں لفظ ''سی'' کی قطعیت پر زور دینا صحیح نہیں ہے۔ بس یہ خیال کیا جانا چاہیے کہ اس وقت اس کی عمر تیس سال کے آس پاس تھی۔ اس مثنوی کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت نامی کے دو بیٹے تھے۔ حیدر حسین اور احمد حسین اور پہلے کی عمر سات برس کی تھی۔ نامی کے بھائی بہن بھی کئی تھے اور وہ بھی صاحب اولاد تھے۔ نامی کے اسلاف شمالی ہند (شاید گوپامئو) سے ارکاٹ پہونچے تھے اور نامی کی پیدائش چینا پٹن میں ہوئی تھی ۔

ہند ہے میرے بزرگوں کا وطن　　مولد اس عاصی کا ہے چینا پٹن

یہ بڑی بات ہے کہ نامی نے اپنے بزرگوں کے وطن کے بیشتر شاعروں کے بارے میں خاصی اچھی معلومات فراہم کر لی تھی، اس مثنوی میں اس نے کہا ہے۔

نظم میں ہندی کی اس کو ہے کمال　　ہے یقیں بھی آرزو ہیں بے مثال
اس کے مضموں سن کے ہے سودا کو درد　　آبرو کا شرم سے ہے رنگ زرد
آگے اس کے ہے ولی سر بر زمیں　　مظہر عاجز ہوا عزلت نشیں
فکر اس کی کا بیاں سُن کر بیاں　　سخت حیرت سی تھی کرتا ہے فغاں
سوز دیکھا جب زمین شعر کو　　خاکساری کی کیا ہے آرزو
بھیجے حشمت یہاں غلامی کا پیام　　میر بندوں سا کرے دائم سلام
اس سے ہے ممنون کو منت یہاں　　مصحفی ہے طفل ابجد خواں یہاں
... مطلع ممتاز گر کوئی سنائے　　حرا... ...

کیا کہوں ہے اس قدر روشن دماغ ہے سخن کی بزم کا تاباں چراغ

اس نسخے کے کاتب نے بھی شاعر کا نام عزیز الدین ہی لکھا ہے۔

اس مثنوی میں بھی نامی نے اپنی زبان کو ہندی کہا ہے۔

اس لیے میں کر کے اس کی پیروی بولتا ہونگا یہ ہندی مثنوی

گر زمانہ دیویگا فرصت شتاب بولونگا ہندی میں خمسے کا جواب

نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے نظامی کے خمسے کا جواب لکھا یا نہیں البتہ نظامی کی مثنوی شیریں خسرو کا ترجمہ نو بہار عشق کے نام سے وہ پہلے ہی کر چکا تھا۔

اس مثنوی بہارستانِ عشق میں حمد، نعت و منقبت، معراج کا حال، مناجات وغیرہ کے بعد عمدۃ الامرا کی مدح، نصیحت برائے اولاد اور حکایتِ ابلیس نظم کی ہے۔ پھر نظامی کی فارسی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ خاتمہ میں نامی نے اپنی اس مثنوی کے بارے میں کچھ ضروری باتیں نظم کی ہیں، اس طرح:

یوں کہا کھینچ کر کے آہ سرد اس کی اب تاریخ ہیگی داغدار

دیکھ یہ سر بسر کشتِ اہلِ عشق پھر کہا یہ بہشت اہل عشق

1213ھ

ہے تروتازہ جو یہ بستان عشق نام اس کا ہے بہارستانِ عشق

میں کیا جب اس کی بیتوں کا شمار پایا گنتی میں برابر دو ہزار

بھیج کر احمدؐ پہ صلوات وسلام مختصر کرتا ہوں قصہ والسلام

یہ مثنوی چھپ چکی ہے۔

3- وفات نامہ:

نامی کی اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔13 اس کے شروع کے شعر یہ ہیں۔

لائقِ حمد ہے اسی کی ذات جس کے قبضے میں سب کی موت وحیات

وہی بخشا ہے دو جہاں کو وجود وہی کرتا ہے سب کے تیں نابود

حمد، نعت، منقبت اور اپنے استاد باقر آگاہ کی مدح کے بعد آں حضرت صلعم کی وفات کا

تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ یہ وضاحت کی ہے کہ یہ مطالب شاہ عبدالحق کی کتاب مدارج سے اخذ کیے گئے ہیں۔

مثنوی کے آخر میں شاعر نے دو مرثیے بھی لکھے ہیں چنانچہ کہتا ہے ۔

اور شفاعت دے اس کی روز قیام　　مجھ کو یا ذو الجلال والاکرام
نامی اب تو وفات نامے کو　　ختم کر دو مرثیوں ہی پر

اس مثنوی کی تاریخ بھی اس نے اس طرح نظم کی ہے۔

ختم کر جب وفات کا احوال　　اس کی تاریخ کا کیا میں خیال
سن کے ہاتف نے یہ کہا روکر　　صلوات خدا ہو نبی پر

لیکن اس کے چوتھے مصرع سے تاریخ برآمد نہیں ہوتی ہے۔اس مثنوی کا نام مدینۃ الانوار بھی ہے اور یہ مثنوی چھپ چکی ہے۔

4-قصہ بی بی مریم:

نامی کی اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔نصیرالدین ہاشمی کے اندازہ کے مطابق یہ 1225ھ(1810) سے پہلے کی تصنیف ہے۔

آغاز:

محی الدین ہے سرور اتقیا　　محی الدین سر جملہ اولیا

اس میں حضرت مریم کے قصہ کو نظم کیا ہے۔قصہ قرآن شریف اور اس کی بعض تفسیروں سے اخذ کیا گیا ہے۔شاعر نے مثنوی کو چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔خاتمہ اس شعر پر ہوا ہے۔

ہوا باب ششم ختم اِس وضا　　نبیؐ پر درود اں کہوں با صفا

5-سلیمان نامہ:

اس مثنوی میں نامی نے حضرت سلیمان اور بلقیس کے قصہ کو نظم کیا ہے 15۔

آغاز:

سراؤں سدا اس سلیمان کو　　دیا جان جو جان و انسان کو
زمین وفلک اور عرشِ بریں　　ہوئی اس کی قدرت سے کرسی نشیں

اس مثنوی کے آغاز کی تاریخ شاعر نے اس طرح بیان کی ہے۔

جو پوچھا میں سالِ شروع کتاب　　کہا روضۂ حور سے کر حساب

1225ھ

یہ تاریخ دونوں کیا جو بیاں　　ہے آغاز وانجام اس سے عیاں

پھر اس مثنوی کی تکمیل کی تاریخ کا بیان اس شعروں میں ہوا ہے۔

ہوا ختم جب نسخۂ دلکشا　　میں تاریخ کی فکر کرنے لگا

یکا یک سروشِ سعادت سرشت　　کیا ہے ندا بوستان بہشت

1226ھ

شاعر نے مثنوی کو اس شعر پر ختم کیا ہے۔

اب یہ نظم کرتا ہوں میں اختتام　　بنامِ محمد علیہ السلام

مذکورہ تفصیلات سے ظاہر ہے کہ نامی نے یہ مثنوی 1225ھ (1810) کے آخر میں شروع کی اور 1226ھ (1811) کے اوائل میں مکمل کی تھی۔ اس میں 3900 سے زیادہ اشعار ہیں[16]۔

6- گنج قدرت:

افسر امروہوی نے نامی کی اس مثنوی کے بارے میں جو اطلاعات قلم بند کی ہیں، مختصراً یہ ہیں:

> ''یہ مثنوی نامی نے سلیمان نامہ (1226ھ) کے سات سال بعد (1233ھ) (1818) میں لکھی ہے۔ اس میں کل ابیات 2738 ہیں جو چھ مہینے میں لکھے گئے ہیں۔ اس میں شاہ عبدالقادر قادری مانکپوری کے حالات اور ان کی کچھ کرامتیں نظم کی گئی ہیں۔ نامی لکھتے ہیں کہ شاہ عبدالقادر سترہ برس کی عمر میں پیر کی تلاش میں گوالیار پہونچے اور شاہ محمد غوث شطاری کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔ دس برس مرشد کی خدمت میں رہ کر گوالیار سے بہ ارادۂ حج روانہ ہوئے۔ والدین سے اجازت لے کر لاہور ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچے، وہاں سات برس رہے۔ واپسی میں مالابار اور مالدیپ ہوتے ہوئے تھرتھر گئے۔ پھر جنجاور ہوتے ہوئے گوالیار پہونچے، 9 ذی الحجہ

978ھ (1570-71) کو 68 سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ ناگور میں دفن ہوئے،

نامی نے شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب بھی بیان کیا ہے"۔

یہ مثنوی نامی نے عظیم جاہ کے زمانے میں لکھی تھی۔ غالباً تعارف حاصل کرنے کے لیے اس میں شاعر نے والا جاہی خاندان کے ساتھ اپنی قرابت کا بھی بیان کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کی چچیری بہن کی شادی عبدالصمد خاں دلیر جنگ کے ساتھ ہوئی تھی۔

جو اس کی والدہ خواہر ہے میری　　اور ہمشیرۂ حقیقی ہے چچیری

پہلے مصرع میں "اس" کی ضمیر امیر الملک نواب عمادالدین خاں بہادر ابن عبدالصمد خاں کے لیے آئی ہے، قرابت کی دوسری صورت یہ تھی کہ نامی کے بیٹے احمد حسین خاں محی الدولہ کی خوش دامن عمادالدین خاں کی بہن تھیں اور ان کا نام نواب بیگم تھا۔

جو اس کی ہے بہن نواب بیگم　　رہے والدین میں بے رنج و بے غم
غرض بیٹا ہرا داماد اس کا　　مخاطب محی الدین سے جو ہیگا
ہے عرف احمد حسین اس کا زماں میں　　رکھے حق خوش اسے دونوں جہاں میں

یہ مثنوی حمد، مناجات اور نعت و منقبت، بیان واقعۂ معراج اور بیان سبب تالیف سے شروع ہوئی ہے۔ پھر شاعر نے شاہ عبدالقادر کے حالات نظم کیے ہیں، شروع میں عنوان کے طور پر یہ دو شعر لکھے ہیں۔

یہ ہے حمدِ خلاقِ حق کا بیاں　　کہ ہے ہر نشاں اس سے، وہ بے نشاں
بلا شک ہے وہ قادرِ ذو الجلال　　کمالوں کے جس کے نہیں ہے زوال

اور اس کے بعد حمد ان شعروں سے شروع کیا ہے۔

ہے لائق حمد کے وہ قادرِ حق　　فلک کو جو کیا برپا معلق
عجب کچھ اس کی قدرت ہے کہ یکسر　　زمیں پانی پہ ہے، پانی زمیں پر
نکالا سنگ کے سینے سے جوہر　　شکم سے ابر کے برسایا گوہر

شاعر نے مثنوی کا اختتام ان اشعار پر کیا ہے۔

شکایت کی حکایت کر کے موقوف　　کر اس کے ختم پر ہمت کو مصروف

یہاں نامی تو لکھ تاریخ اور نام　　بیاں کر جلد اس کا سالِ اتمام
بنی جب یہ کتاب با سعادت　　رکھا میں نام اس کا گنجِ قدرت
کیا میں فکر تاریخ نظامت　　کہا ہاتف نے اشعار کرامت
1233ھ
علیٰ روحِ نبی صلِّ وسلّم　　وآلِ بیتہٖ یا ربِّ مکرّم

اس مثنوی کے نسخہ کراچی کے بارے میں قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس کا کاتب بھی شاعر تھا، چنانچہ اس نے ترقیمہ میں خود اپنی طرف سے یہ پانچ شعر لکھے ہیں۔

امام الدیں بروزِ چار شنبہ　　کہ ہے جو بارویں تاریخ شعباں
ہے سنہ ہجرت سے بارا سو پہ چھیسٹھ　　ظہر کے وقت میں اے اہلِ باشاں
1266ھ
کتاب گنج قدرت لکھ چکا سب　　بہ افضالِ خدائے اِنس اور جاں
کرے اس کا مطالعہ گر کوئی شخص　　توقع اس سے میں رکھتا ہوں ہر آں
دعائے مغفرت حق میں مرے کچھ　　خدا سے چاہے وہ ازراہِ احساں

ان کے علاوہ نامی کی کم سے کم دو مثنویوں کا اور بھی ذکر ملتا ہے 18 یعنی:

بنارس نامہ یا قصۂ بنارس　　اور　　چمنستانِ برکات

ممکن ہے کہ اور بھی کوئی مثنوی لکھی ہو، مثنویوں کی کثرت اور کیفیت پر نظر کر کے غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نامی اپنے زمانے میں کرناٹک کے سب سے زیادہ مقبول اور کامیاب مثنوی نگار تھے۔ اردو شاعری کی روایت کے مطابق نامی غزلیں بھی کہتے تھے۔ چنانچہ نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے:

''شاعری میں باقر آگاہ سے تلمذ حاصل کیا۔ 19 عمدۃ الامرا ریس ارکاٹ نے نامی کو اپنے دربار کا ملک الشعرا قرار دیا تھا۔ کبھی نامی اور کبھی مستقیم بھی انھوں نے اپنا تخلص قرار دیا ہے اردو اور فارسی دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ دیوان مرتب کیا تھا۔

فارسی میں بھی نامی کی بعض تخلیقات محفوظ ہیں، مثلاً

ساقی نامہ، فردوسِ اعجاز، یا میخانۂ کیفیتِ نوبادہ

نامی کا نام اکثر جگہوں پر غلام اعز الدین خاں لکھا ہوا ہے۔ شاید یہ ان کا عُرفی نام ہوگا اور شباب کو پہونچنے کے بعد انھوں نے اختیار کیا ہوگا۔

6-حق گو:

کوئی شاعر تھا جس نے اپنی شخصیت کو مخفی رکھنے کے لیے یہ نام اختیار کیا تھا[20] اور اس نے ''بیانِ واقعی'' کے عنوان سے سولہ صفحوں کا ایک رسالہ لکھا تھا، اس کے مطالب کی کیفیت افسر امروہوی نے اس طرح قلمبند کی ہے:

''کوئی بزرگ مولوی سید محمد علی اُلفتی مدراس میں کسی دوسری جگہ سے آئے تھے، اور اپنے زورِ تقریر اور حسنِ اخلاق سے بہت سے اہلِ بدعت اور بے نمازی مسلمانوں کو سیدھے راستہ پر لگا دیا تھا۔ ان کی یہ مقبولیت اور شہرت عام ایک اور مولوی صاحب کو جن کا نام اسلمی صاحب تھا اور جو انھیں دنوں میں عرب سے آئے تھے بہت ناگوار گذری۔ یہ مخطوطہ انھیں کیفیات کے اظہار میں ہے، جس کے لکھنے والے کا نام پتہ نہیں چل سکا۔ مصنف نے اپنا نام صرف بندۂ حق گو لکھا ہے، مخطوطہ زیرِ نظر کا نام بیانِ واقعی ہے جو خود مصنف نے آخری حصہ میں بیان کیا ہے''۔

آغاز:

''بعد حمد اور نعت کے کہتا ہے بندۂ حق گو راست جو کوئی خوش ہو یا خفا برا مانو یا بھلا کہ سن بارہ سو چالیس پر پانچ (30-1829) میں ہر دم دائرۂ مرتضیٰ علی مصرعۂ چہارم رباعی لیک نیتی مولوی سید محمد علی اُلفتی مدراس میں مانندِ آیۂ رحمت کے نازل ہوئے اور وعظ کہنا شروع کیے''۔

اختتام:

''اول سے آخر تک کا ماجرا جو راست اور سانچا تھا مجملاً لکھا، دل سے اپنی ایک بات بھی نہیں لگایا، نام اس کا بیانِ واقعی رکھا

واللہ الموافق الصواب وَالیہ المرجع وَالمآب''۔

افسر صدیقی کے اقتباس میں اسلمی کا ذکر آیا ہے ان کا نام مولوی محمد سعید بتایا گیا ہے۔ ظاہراً یہ قضیہ مذہبی تھا۔ شاید اسلمی کی مناسبت سے مصنف حق گو نے محمد علی کے تخلص الفت کو الفتی بنا دیا ہے۔

7-الفت

ان کے بارے میں میر محمد خاں سرور نے اپنے تذکرے میں جو لکھا ہے یہ ہے:

"الفت تخلص، محمد الفت نام، شخصے ست کہ بہ نواح حیدر آباد، از تصنیفات او ہمیں دو بیت کہ در مبارکباد عید قرباں برائے کسے گفتہ بدست آمدہ"۔

عید قرباں کو مبارکباد کا سامان ہے ربع مسکوں وسعتِ میدان کا چوگان ہے
ذبح ہو جاوے عدو اور تن جدا بسمل رہے سر ترے قدموں پہ اس کا خود بخود قربان ہے

بُعدِ مکانی کے سبب سے سرور کو الفت کے صحیح نام اور مسکن کی اطلاع نہیں مل سکی تھی۔ اس کی مثنویوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارکاٹ میں رہتا تھا اور اس کا صحیح نام محمد علی تھا، بلحاظ عقیدہ یہ اثنا عشری تھا۔ اس کی تین مثنویاں دستیاب ہے،

1-دین دیپک

یہ الفت کی پہلی دستیاب مثنوی ہے۔ اس کے مخطوطۂ کراچی کی کتابت 1194ھ (1780) میں ہوئی تھی۔[22] اس لیے یہ مثنوی بالیقین اس سال یا اس سے پہلے کی تصنیف ہے، مثنوی کے خاتمہ میں شاعر نے اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

محمد علی شاہ الفت فقیر کیا ہے گنہ ہم کبیر و صغیر
نہ توشہ ہے نیکی و عمل کا اسے نظر تیری بخشش پہ دایم دھرے
نہ طاعت عبادت نہ حُسنِ عمل ولے ہے غلامِ علی از ازل
تو اس کے گناہاں پہ نا کر نگاہ نظر اپنی بخشش پہ رکھ یا الٰہ

حمد، نعت، منقبت علی و منقبت یازدہ ائمہ کے بعد اردو رسم خط کو صحیح پڑھنے کے قواعد کے لیے ایک عنوان قائم کیا ہے[23]۔ اس میں یائے معروف و یائے مجہول اور زیر زبر وغیرہ لکھنے کے طریقے بتائے گئے ہیں اور تاکید کی ہے کہ جو کوئی اس دین دیپک کو نقل کرے اس کو چاہیے کہ اس

قاعدے پر عمل کرے تا کہ کتاب صحیح پڑھی جائے۔ یہ بحث بہت اہم اور مفید ہے۔ اس بحث کے بعد شاعر نے سبب تالیف اور ابواب کی تفصیل وغیرہ کا بیان کیا ہے۔

مثنوی کے مطالب کو بیس ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ چوتھا باب نبوت اور پانچواں امامت سے متعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ امامیہ عقائد کے مطابق ہیں۔ ہر باب کا عنوان ایک شعر کی صورت میں ہے مثلاً

باب اول توحید کے ہیگا بیاں میں برمحل　　جو شرک کے تئیں دور کر، تحقیق کا بولے عمل

اور ۔

بستم جو باب ہے، ہے امر میں معروف کے　　اور نہی منکر سے سدا ہے مومناں کا یہ عمل

کتاب کا نام مصنف نے ان شعروں میں نظم کیا ہے۔

ہے اس دین دیپک میں سب یوں لکھا　　تامل سے پڑھنا ہے اس کو بھلا

اور ۔

جو دینی مسائل سے روشن ہے سب　　کیا دین دیپک اسے نام اب

2-ایمان درپن

یہ الفت کی دوسری دستیاب مثنوی ہے اور بہ ظاہر اسی سلسلے میں تصنیف ہوئی ہے۔ سبب تالیف یہ ہے۔

محمد علی اب تو مطلب طرف　　زباں کھول چل بحث مذہب طرف

سبب اس رسالے کی تالیف کا　　بیاں کر یہ نسخے کی تصنیف کا

کہ احمد علی نور چشم ایک روز　　کیا مجھ سے اظہار روہ دلفروز

جو ہے حسنیہ کا رسالہ جلیل　　ہے بحث مذاہب میں روشن دلیل

زبانِ عرب سے یہ نسخہ اتھا　　عجم میں سمجھ جس کا مطلق نہ تھا

سو ابراہیم استر آباد نے　　عربی کتیں فارسی کر لکھے

جو باشندۂ ہند ہیں بہ التمام　　علی ولی کے ازل سے غلام

بہ ہندی زباں تم کرو ترجمہ　　کہ حاصل کریں یہ سعادت ہمہ

کتاب کا اور اپنا نام شاعر نے اس طرح نظم کیا ہے۔

ارادہ کیا جب یہ لکھنے کتاب　　دیا اس کو ایمان در پن خطاب
محمد علی الفت اب ہو خموش　　ہے آگے تجھے بہت جوش و خروش

اس مثنوی میں ہارون رشید کی سادات دشمنی ظاہر کر کے اسے ملعون قرار دیا گیا ہے۔ یہ کوئی سوا دو ہزار شعروں کی مثنوی ہے۔ الفت کی مثنویوں کے نام پر خیال کریں تو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں عربی اور ہندی یا فارسی اور ہندی اصل کے لفظوں کو ترکیب دینا یا یکجا کرنا جائز سمجھا جاتا تھا۔

3۔ گلزار اعظیم

یہ محمد علی الفت کی آخر زمانے کی تصنیف ہے۔ اس کے بارے میں نصیر الدین ہاشمی نے لکھا ہے:

> ''مثنوی میں حمد و نعت، صحابہ کی مدح کے بعد سبب تالیف میں کہا ہے کہ مصنف نہایت تنگ دست تھا، والا جاہ کے دربار میں رسائی کے لیے اس نے یہ مثنوی لکھی تھی، سبب تالیف کے بعد محمد غوث خاں والا جاہ کی مدح و ستائش کی گئی ہے، اس کے بعد عراق کے شہزادہ ارجمند اور جواہر پری کے عشق کی داستان نظم کی ہے''۔25

نواب محمد غوث خاں بہادر والا جاہ 1239ھ (1824) میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد کوئی ڈیڑھ سال کی عمر میں ان کی جگہ 12 رجمادی الاول 1241ھ (23/ دسمبر 1825) کو مسند نشیں ہوئے۔ اس تاریخ سے پہلے ان کی مدح کے لکھے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ الفت کی یہ مثنوی بھی اس کے بعد کسی زمانے میں لکھی گئی ہوگی۔ اس مثنوی کے کاتب نے ترقیمہ میں 1234ھ لکھ دیا ہے، جو یقیناً غلط ہے، ممکن ہے کہ صحیح 1243ھ ہو۔

آغاز:

خدایا سزا تجھ کو حمد و ثنا　　ہے باقی تری ذات، باقی فنا
ہے ذرہ ترے نور کا آفتاب　　یہ پرتو ہے اس نور کا ماہتاب

خاتمہ:

دعا دیں احبا کو میرے سدا　　کہ رکھے خوشی سے یہ دنیا خدا
کچھ الفت سے اپنے یہ عاصی کو بھی　　نہیں بھول جانا دعا سے کبھی

معلوم ہوتا ہے کہ نوعمر نواب کے یہاں الفت کو رسائی حاصل نہ ہو سکی اور حالات نے اسے ترکِ وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ حق گو کے رسالے کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ الفت مدراس میں پہنچے اور وہاں مولوی اسلمی سے ان کا اختلاف ہوا۔

3- نامعلوم:

ارکاٹ کے کسی نامعلوم طبیب نے اپنے علم سے متعلق خوانِ نعمت کے نام سے کوئی بہتر صفحہ کی ایک مثنوی لکھی تھی۔ اس کے نسخۂ آصفیہ کا ترقیمہ اس طرح ہے:

''تمت الکتاب بعون ملک الوہاب در 1223ھ (1808) ماہ ربیع الاول تاریخ شانزدہم روز سہ شنبہ در قصبہ رائے پیٹھ متعلقہ محمد پور عرف ارکاٹ تحریر یافت''۔

نصیر الدین ہاشمی نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''یہ ایک منظوم طب کی کتاب ہے۔ اس میں مرض اور اُس کے نسخے لکھے گئے ہیں، مگر یہ نسخے دوا کے نہیں بلکہ غذا کے ہیں۔ یعنی غذا سے مرض کے دفع کرنے کا تذکرہ ہے''۔

آغاز:

اوّل میں شروع حمدِ خدا سوں کروں کتاب　　پھر نعتِ مصطفاؐ تو کہے میں بڑا ثواب
خالق نے خاصیت دیا ہر ایک شے منے　　پاؤنگا فائدہ جو ہر اس کے لیے منے
دکھنی نہ سمجھیو یہ بیا کھیان سب کرا　　کئی مفردات ہیں تو خواص اس کے دیکھ جا

اختتام:

نام خدا سوں جلد ہوا نسخہ اب تمام　　جو فیض لیویں اُس ستی دکھنی میں خاص و عام
داخل نہیں ہے ایک دوا سب غذا ہے دیکھ　　لیک اب معالجاتِ غذائی بجا ہے دیکھ
اسم است خوانِ نعمت نعمہ بست کم　　خوان نعمت الہٰ بکن شکر دمبدم

یہ کتاب 1223ھ میں یا اس سے پہلے کی تصنیف ہے۔

9- نادر

یہ ارکاٹ کا کوئی شاعر تھا جس کا نام اور حال کچھ معلوم نہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے اس کی دو مثنویوں کے نام لیے ہیں یعنی مثنوی رشکِ قمر و مہ جبیں

اور مثنوی نادر یا سفر نامۂ اعظم جاہ

پہلی مثنوی کے بارے میں کوئی بات معلوم نہیں ہے۔ دوسری کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ دستور کے مطابق یہ سفر نامہ حمد، نعت، تعریفِ اصحابِ کبار، مناقب محبوبِ سبحانی اور مدح امیر الہند والا جاہ نواب اعظم جاہ سے شروع ہوتا ہے 27ھ۔ اس میں اعظم جاہ کی بیگم، والدہ اور بھائی محمد علی خاں عظیم جاہ کے اوصاف بھی بیان کیے ہیں۔ شاعر کا کہنا ہے کہ وہ خود اور اس کا باپ بھی نواب ارکاٹ کے یہاں ملازم اور ان کے مقرب تھے۔ باپ نواب اعظم جاہ کا استاد تھا۔ اس لیے اسے پالکی کا اعزاز حاصل تھا، نواب خود اس کے مکان پر کئی بار تشریف لائے تھے، شاعر بچپن سے اعظم جاہ کا مقرب رہا تھا۔ اسے بندی خانہ کی داروغگی کا منصب حاصل تھا لیکن اپنے باپ کے اعزاز کے حصول کے لیے اس سفر نامے کی تصنیف کے وقت تک ترستا رہا تھا، مثنوی نادر میں اس نے کہا ہے۔

میرے باپ شہ کے جو استاد تھے — فقیر اور حافظ خوش آزاد تھے
تھے خوشحال شہ کی عنایت سے وہ — رہے تادم زیست عزت سے وہ
نہایت تھے قانع ہر اک صبح و شام — نہ ہرگز طمع سے تھا دنیا کا کام
تھا یادِ الٰہی میں بہت ان کا دم — رہِ حق میں تھے بے شک ثابت قدم
موے بعد آ شاہ کے خواب میں — ہوے ساعی ہم سب کے اسباب میں

آخری شعر سے ظاہر ہے کہ نادر کے باپ کو مرے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ مرنے کے بعد نواب کے خواب میں آ کر انھوں نے ''ہم سب'' (نادر اور متعلقین) کے لیے سفارش کی تھی۔

اس سفر میں نادر اپنے نواب کے ساتھ تھا۔ سفر سے واپس آنے کے بعد اسی سال میں اس نے اس کے احوال کو نظم کر ڈالا، سفر نامہ کچھ ضخیم نہیں ہے۔ گیارہ سطری مسطر پر کُل بیالیس اوراق میں سما گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کی تصنیف میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا ہوگا۔ مثنوی کے

خاتمے میں شاعر نے اس کی تاریخ اس طرح نظم کی ہے ۔

کیا ہے سفر جب شہِ نیک خو　　کہ بارہ سو اٹھتیسواں سنہ تھا دو
اس ہی سنہ میں کر فکر نظم کلام　　کیا اس سفر نامے کو اختتام
بہ دل جب کہ تاریخ کی فکر کی　　ندا ہاتف غیب نے تب یہ دی
صلہ اس کا تجھ کو ملے بہتریں　　یہ نادر ہوئی مثنوی آفریں

1238ھ (1823)

اس سفرنامے کے بارے میں ڈاکٹر زور نے جو کچھ لکھا ہے مختصراً یہ ہے:

"یہ کہنے کو تو نواب اعظم جاہ والی ارکاٹ کا سفرنامہ ہے، لیکن اس میں اس کے عہد کے اکثر مشاہیر کی خصوصیات اور سماجی و معاشی کیفیات بھی محفوظ ہوگئی ہیں، اس میں شاعر نے اعظم جاہ کے جملہ امرا ممتاز الامرا، اعظم الملک حفیظ اللہ خاں، شرف الملک، معتمد جنگ عبدالحمید خاں، وجیہ اللہ خاں اور قادر حسین کے حالات لکھے ہیں، پھر عالموں، مشائخوں اور طبیبوں کا ذکر کیا ہے، طبیبوں میں باقر حسین خاں اور شعرا میں اظفری کی خصوصیات بیان کی ہیں، دربار اور مسند وغیرہ کے ذکر کے بعد سفر کی تیاری امیروں، سپاہیوں کی ہمراہی، ڈیروں، قناتوں کی تفصیل، سفری مسجد، اور شان و شوکت کا بیان کیا ہے، سفر کا اصل مقصد درگاہوں کی زیارت وغیرہ ہے، اس لیے ناگور، نقر نگر وغیرہ کی طرف جانا پڑا، راستے میں جن مصیبتوں اور مسرتوں سے سابقہ پڑا اُن سب کی تفصیل بیان کی ہے"۔

مدراس کا نام اس زمانے میں اعظم نگر رکھ دیا گیا تھا۔ شاعر نے اپنے اس شہر کی بہت تعریف کی ہے۔ وہ اس کی آبادی کو حیدرآباد سے مشابہ بتاتا ہے ۔

وہ بستی سے یوں باغ آباد ہے　　گویا باغ میں حیدر آباد ہے

شاعر نے یہ مثنوی بہت محنت سے لکھی ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ اسے نواب کے یہاں سے متوقع بہترین صلہ ملا یا نہیں۔ زبان اردو میں شاید یہی سب سے قدیم سفرنامہ ہے۔

قادر:

قادر خاں ولد احمد خاں ارکاٹ کے رہنے والے تھے 28۔ انھوں نے شیخ یوسف مکی سے فنِ قرأت سیکھا تھا اور اس فن میں عمدہ مہارت پیدا کر لی تھی، طالبوں کے فائدے کے لیے انھوں نے اپنی زبان میں ایک مختصر رسالہ مفید القاری کے نام سے لکھا تھا۔ جو چودہ صفحوں پر محیط ہے۔

آغاز:

''اَلحمد لِلّٰہ رَبِّ العالمین، وَالصّلاۃ وَالسّلام عَلیٰ رَسولہٖ وَآلہٖ وَصحبہٖ وَمَن یتبعھم اَجمعین، یہ عاجز گنہگار قادر خاں فرزند احمد خاں سرخ کا، رہنے والا، شہر محمد پور عرف ارکاٹ کا، شاگرد قاری شیخ یوسف کی رحمۃ اللہ علیہ کا، اس رسالہ تجوید قرآن شریف کتیں اوپر قرأت حفص کے رسالوں سے عربی اور فارسی کے جمع کر کے واسطے طالبان اس علم کے جو باتاں کہ ضروری ہیں، سو سب لکھ کر رسالہ مفید القاری نام رکھا''۔

اختتام:

''بیچ تسہیل کے نزدیک حفص کی تسہیل بیچ کلام اللہ کے دو جا گا ہے، تسہیل اسے کہتے ہیں کہ درمیان الف اور ہمزہ کے پڑنا دوسرے ہمزہ پر تسہیل ہے مثال ءَ ءَ غَجَمِیٌّ کریں۔ اس کے ادا کرنے پر موقوف ہے، تمت الرسالۃ بعونہ تعالیٰ''۔

نصیر الدین ہاشمی نے اس رسالہ کا سالِ تصنیف قریب 1250ھ (1834) لکھا ہے۔

11-مومن علی

انھوں نے 1253ھ (1837) میں فنِ موسیقی سے متعلق ایک مختصر سا رسالہ ترانۂ عشق کے نام سے لکھا تھا۔ کتاب کے بارے میں انھوں نے جو معلومات قلمبند کی ہیں ان کا اختصار یہ ہے:

''میر مومن علی ذاکر حسین ابن میر حسین علی متوطن سواد بندر مچھلی پٹن، باعث ترقیم اس رسالے کا اس طرح بیان کرتا ہے کہ ایام جوانی و عہد شباب میں میرے والد رحمتِ حق کو پہنچے۔ بعد تھوڑے دنوں کے 1253ھ (1837) میں چند دوستان بے ریا و آشنایان باصفا اس عاجز سے کمال ارتباط رکھتے تھے سو فرمائے کہ والد مرحوم تمھارے،

یہاں کے سلطان الذاکرین تھے، مرثیہ خوانی میں ان کا نظیر و عدیل نہیں تھا، اب تم کو چاہیے کہ اپنے والد کا نام روشن کریں اور کچھ راگ وراگنی سیکھ کر مرثیہ خوانی وغیرہ کے سوزاں درست کریں، پس یہ بندۂ ہیچمداں ماہیت علم موسیقی کی اور اصطلاحات اور مقامات سُروں کے اور راگ راگنیاں اور بعض قواعد زبان ہما کھا کے استادان کامل عیار سے سیکھ کر حاصل کیا اور بادشاہ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں کہ مرزا خاں نام ابن فخر الدین محمد خاں نے کہ کتب ہائے قدیم سے کیفیت علم موسیقی کی کلہ دریافت کر کے فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا، سو اس کتاب سے انتخاب کر کے زبان اردو میں مختصر مفید جو دوستان شایق وطالبان لایق اس فن کو کام آوے لکھا، اس رسالہ کا نام ترانۂ عشق رکھا"۔

گیارہ سطری مسطر پر یہ رسالہ کُل اڑتالیس اوراق میں سما گیا ہے۔

میر مومن نے چند سال کے بعد انتخاب موسیقی کے نام سے ایک اور رسالہ لکھا تھا جو سوا تین سو اوراق پر محیط ہے۔ اس کا سالِ اتمام مصنف کے بھائی میر غلام حسین مجرم نے اس طرح نظم کیا ہے ؎

منتخب جس دم کیے مومن علی علوی نسب — علم میں نغمے کے محنت سے کتاب موسقی
سال اتمام اس کا مجرم نے کہا اس لطف سے — نام بھی ہیگا مناسب انتخاب موسقی 30

1270ھ

12-حقیقت

محسن نے جو اِن کے بیٹے ہیں ان کے بارے میں لکھا ہے:

"والد ماجد سوَلف سید شاہ حسین مغفور حقیقت خلف سید عرب شاہ وطن بزرگوں کا خوست، وہاں سے آ کے پہلے دہلی میں، بعدہٗ لکھنؤ میں سکونت اختیار کی، چینا پٹن مندراس میں ہمراہ کارکٹ صاحب بہادر کے پیرغشی ہو کر گئے تھے، وہیں وفات پائی، دیوانِ ریختہ، تحفۃ العجم، خزینۃ الامثال، صنمکدۂ چیں وغیرہ آٹھ جلد اس مغفور سے یادگار ہیں، ارشد تلامذہ قلندر بخش جرأت"۔ 31

حقیقت کرناٹک بھی گئے تھے اور وہاں انھوں نے ایک ضخیم مثنوی ہشت گلزار کے نام سے لکھی تھی، اس میں اشعار کی تعداد انھوں نے اس طرح بیان کی ہے ۔

شعر کتنے ہوے کیا جو شمار　　سات سو پینسٹھ اور چار ہزار

مثنوی میں کل اٹھارہ ابواب ہیں۔ان میں ایک باب کا عنوان یہ ہے:

"مدح امیر کبیر عبدالقادر خان ثابت جنگ"

اس سے ظاہر ہے کہ حقیقت کو خاندان والا جاہی تک رسائی حاصل ہو چکی تھی۔ اپنی مثنوی کی تکمیل کی تاریخ انھوں نے اس طرح بیان کی ہے ۔

نامۂ نامی جب ہوا یہ طے　　سنہ تھے پچیس اور بارہ سے
ختم جس روز مثنوی یہ ہوئی　　گیارہویں تھی ربیع الاول کی

اس کے اختتام کی تاریخ اس طور پر نکالی ہے ۔

اس کی تاریخ کا جو دھیان کیا　　بندے نے دل کا امتحان کیا
آسماں سے ندا ہوئی وہیں　　ہے پری خانہ زیب روئے زمیں

1225ھ(1810)

اسی سلسلے میں ذیل کے چند شعر قابلِ توجہ ہیں ۔

یعنی کیا زیست کا بھروسہ ہے　　اس سے بے اعتبار تر نہیں شے
یادگار اپنا کچھ تو یاں رہ جائے　　دم کا کیا اعتبار آئے نہ آئے
حق مطلق سے ہے یہ مجھ کو اُمید　　کہ رہوں اس سے زندۂ جاوید
اک تو تھا میں اسیرِ دامِ مرض　　مجھ کو انواع کے مرض تھے غرض
دردِ سر، سرفۂ اور نفث الدّم　　نزلے سے ناک میں تھا بہونچا دم
تپ، بوامیر اور دردِ مراق　　ان کے ہاتھوں سے بھی جینا شاق
اس طرح سے بہ عرصہ سہ ماہ　　مثنوی میں نے یہ لکھی ہے آہ
کیجیے ساعات کا حساب اگر　　نظم جن میں ہوئے ہیں یہ گوہر
بیس دن سے فزوں نہیں ہوتے　　بلکہ کم اس سے ہیں کہیں ہوتے

(3) مدراس 475

1-حالات محمد علی واعظ 476

2-کمتر 477

3-فیاضی سید محمد تقی 478

4-بدرالدولہ قاضی 479

5-مستعان مستعان علی 481

6-ندرت حکیم محمد یحییٰ 483

7-رونق عارف الدین خان 484

8-مسکین واصف مولوی محمد مہدی 485

9-کمتر قادر علی 487

حواشی 489

''ماہ ربیع الاول 1216ھ کی انیسویں تاریخ (1801) کو امیر الامرا بہادر مرحوم کے بیٹے کو (انگریزوں نے) مسندِ ریاست پر بٹھایا، انھیں کے نام نامی سے نوابی کی نوبت بجوائی، انھیں امیر الہند والا جاہ عظیم الدولہ کا خطاب دیا اور ان کے حالات و حیثیت کے لایق ماہانہ معاش اور سالانہ آمدنی کا پانچواں حصہ مقرر کر دیا، سارے مالی اور ملکی کاروبار پر خود قبضہ کر لیا''۔ 1

مدراس کے پورے علاقے پر سرکار انگریزی قابض ہو کر اپنے مخصوص طریقوں کے مطابق اصلاحات و ترقی کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ ہندستانی شرفا و امرا نے دل سے اُن کی برتری کو قبول کر لیا تھا۔ مرزا اظفری گورگانی نے دتی سے مدراس تک کی سیر کی تھی، وہ جس نتیجے پر پہونچے تھے یہ تھا:

''میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اگر ہمارے زمانے میں ہندوستانی زیادہ عقلمند ہوتے تو اس قوم (انگریز) سے مغلوب ہی کیوں ہوتے''۔ 2

پوری ہندستانی قوم صاحبانِ عالی شان کے مقابلے میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئی تھی۔ چنانچہ ان کی علمی کارکردگی کی رفتار بھی سُست پڑ گئی تھی۔ مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ ان کے علما بحث و مباحثوں میں مبتلا تھے اور بقول شخصے یہ قوم خرافات میں کھو کر رہ گئی تھی۔ اس سلسلے میں ایک قابلِ توجہ رسالہ یہ ہے۔

1- حالات محمد علی واعظ (احوال مدراس)

مصنف نے اپنا نام وغیرہ ظاہر نہیں کیا ہے۔ لیکن اتنی بات ظاہر ہے کہ وہ مدراس کا رہنے والا کوئی عالم تھا۔ ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے اس کے بارے میں جو لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

''اس میں وہ حالات بیان کیے ہیں جو سید احمد شہید کے خلیفہ اور داعی مولانا محمد علی رامپوری کے مدراس پہنچ کر مواعظ شروع کرنے کے نتیجے میں موافقت یا مخالفت کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ اس میں مدراس کے نوابی خاندان کے افراد اور متعدد عالموں کا ذکر ہے لیکن بنیادی کردار یہ دو ہیں

مولوی محمد علی رامپوری اور مولوی محمد جمال فرنگی محلی

محمد علی رامپوری کو مقام سوات سے ولایت علی عظیم آبادی کے ساتھ ہدایت و اصلاح کے لیے جنوبی ہند بھیجا اور دعا خیر فرمائی۔ محرم 1245ھ (1829) میں یہ مدراس پہنچ کر مولوی عبدالوہاب کے مدرسے میں مقیم ہوئے۔ چند روز میں شہر میں ان کے وعظ کی دھوم مچ گئی۔ ہزار ہا لوگ تائب ہو کر بیعت میں داخل ہونے لگے۔ نواب محمد خان عام خاص تہور جنگ نے دو سو آدمیوں کے ساتھ بیعت کی۔ بالاکوٹ کے حادثہ کی خبر سن کر مولوی محمد علی اپنے وطن واپس ہو گئے۔ چار برس بعد نواب عظیم بہادر کی والدہ کی درخواست پر دوبارہ مدراس پہنچے، اس بار اہل بدعت نے حکام کو آپ کے خلاف کر دیا۔ آخر پولس کے جبر سے بچنے کے لیے 1252ھ (1836) میں واپس ہوئے اور 1258ھ (1842) میں وفات پائی۔

جمال الدین احمد فرنگی محلی مدراس میں مقیم رہ کر ردِ وہابیت کے معرکہ میں پیش پیش رہے۔ مولوی محمد علی سے مسئلہ شفاعت پر مناظرہ کیا اور مجبور کیا کہ تقویت الایمان کی قابلِ اعتراض عبارتوں سے اپنی برات ظاہر کریں۔ انھوں نے دوبارہ برات نامہ پیش کیا، لیکن جمال الدین احمد اور ان کے ہم خیال علما نے کفر کا فتوی جاری کر کے انھیں واجب القتل قرار دیا۔ آخر مدراس کے چیف مجسٹریٹ نے مولوی محمد علی کو بہ حفاظت تمام بہ ذریعہ بحری جہاز مدراس سے کلکتہ روانہ کر دیا، ملا جمال الدین نے ان کے

مریدوں سے فرداً فرداً توبہ کرانی شروع کی۔ نواب محمد علی وللاجاہ کی بیوہ سے بھی مجبور کر کے توبہ کرائی گئی"۔

رسالہ کی ابتدا اِن لفظوں سے ہوتی ہے:

"سید دینداروں کو صاف معلوم ہو کہ مولوی محمد علی صاحب واعظ سید ہیں، کیونکہ اگلے دنوں میں نواب صاحب کے محکمے سے جو کاغذات رامپور بھیجنے کے لیے تحویل مدراس گورنمنٹ سیکریٹری کے ہوا سو اس میں اور کمپنی کی راہداری میں جو نواب صاحب ان کو پہلے کلکتے کو جانے کے وقت دلائے تھے"۔

خاتمہ کے کلمات یہ ہیں:

"حق بات تو یہ ہے کہ اشرار دنیا دار فقط اتنے ہیں اور باقی علانیک ذات صاحب معلومات اس بلائے عظیم اور طوفان بے تمیزی کے باعث کنارہ گیر ہو کر خدا اور رسولؐ کی خوشی کے لیے..... دربار سے ہاتھ اٹھا کر اپنے امور کو اللہ کے تفویض کیے ہیں، کیونکہ وہ بڑا... وَمَاعَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ"۔

2- کمتر

مدراس کے مخصوص حالات میں مذہبیات کو ہر چیز پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ اس علاقے میں جو تصنیفات دستیاب ہوئی ہیں بیشتر کا تعلق براہ راست یا بلاواسطہ مذہب سے معلوم ہوتا ہے۔ ان میں عموماً اپنے معتقدات کی برتری اور بتری کے جذبے کی بھی کارفرمائی جھلکتی ہے۔ کمتر تخلص کا کوئی شاعر تھا۔ جس کا نام اور احوال کچھ بھی معلوم نہیں ہے، اس نے ایک مثنوی "تحفۃ المذاہب" کے نام سے لکھی تھی جس کا آغاز ان شعروں سے ہوا ہے۔

بعد حمد خدا و نعت نبیؐ مدح حسنینؓ و فاطمہؓ و علیؓ
ہے جو باقی ائمۃ النجبا ان کو سمجھو کہ ہیں وہ آل عبا
ان میں افضل ہے پنجتن کی ذات سب ہوے ان لیے یہ موجودات

ان شعروں سے یہ حقیقت واضح ہے کہ شاعر کا مذہب اثنا عشری تھا۔ اس نے یہ مثنوی مدراس میں لکھی تھی۔ یہ بات ذیل کے شعر سے ظاہر ہے۔

ہے خدا کو ہزار شکر و سپاس ہوا نسخہ یہ نظم در مدراس

اس کا سال تصنیف شاعر نے ان شعروں میں بیان کیا ہے۔

اس کی تاریخ کا کیا جو حساب داغ بر دل دیا یہ نظم کتاب

1241ھ(1826)

گرچہ ہے مختصر یہ نظم کلام ولے نشتر ہے بر دل ظلام

شاعر نے اسے مختصر کہا ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ یہ مثنوی 164 صفحوں پر مکمل ہوئی ہے۔ اور ہر صفحہ پر دس سطریں ہیں۔ اس میں شاعر نے جو مطالب نظم کیے ہیں ان کی نوعیت کا اندازہ آخری مصرعے سے کیا جا سکتا ہے۔ اس مثنوی میں یوحنا نام کے ایک اسرائیلی کے بیان کردہ ان حالات کو نظم کیا گیا ہے جن سے متاثر ہو کر مصنف کے دل میں شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور وہ شیعیت کی طرف مائل ہو گیا، مصنف نے اپنی زبان کو ہندی کہا ہے۔

جس طرح تھا کتابہا میں لکھا اسے ہندی میں اس لیے ہوں کیا

تا سمجھ لیں تمام مردو اناس اور کریں اپنے مذہبوں کو قیاس

3-فیاضی

فیاض ویلوری کی وہ مجلس مشہور ہے۔ ان کے ایک پوتے سید محمد تقی نے اپنے دادا کے تخلص کی مناسبت سے خود کو فیاضی کہا، انھوں نے 1250ھ (1834) کے قریب ایک نثری رسالہ عقائد المؤمنین کے نام سے لکھا جو سولہ سطری مسطر پر بہتر صفحوں پر محیط ہے، مقصود اس رسالے سے یہ ہے کہ جو لوگ عربی، فارسی سے ناواقف ہیں وہ اپنے عقیدے کے مسائل کا اردو میں مطالعہ کر سکیں۔

سید محمد تقی کا مذہب اثنا عشری تھا۔ انھوں نے اپنے مسلک کے مطابق اس رسالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ شروع میں ایک مقدمہ بھی لکھا ہے۔ چوتھے باب میں امامت کے مسائل اور ائمہ اثنا عشر کے حالات و معجزات سے بحث کی ہے۔

آغاز:

"رسالہ عقائد المؤمنین من تصنیف سید محمد تقی فیاضی علیہ الرحمت، باشندگان قصبہ اول کنڈہ، نبیرۂ میر ولی فیاض مرحوم۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ رب العالمین، اللّٰھم صل علیٰ محمد و آلِ محمد وعجّل فرجھم، اما بعد! یہ خاکسار کتابیں عقائد کے مسائل اردو زبان میں لکھتا ہے"۔

یہ تعجب کی بات ہے کہ اتنے قدیم زمانے میں مدراس جیسے دور افتادہ مقام پر زبان کے لیے اس بے ساختگی کے ساتھ لفظ "اردو" کا استعمال کیا جاوے۔ رسالے کے آخر میں کوئی ترقیمہ نہیں ہے۔ افسر امروہوی نے کاتب کی جن غلطیوں کی نشاندہی کی ہے ان سے تحریر کی قدامت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ امکان ہے کہ کاتب نے جو بعد کے زمانے کا ہے متن میں دخل اندازی کی ہو، جس کے نتیجے میں موجودہ متن کی قدامت مشتبہ ہوگئی ہے۔

4- بدرالدولہ

یہ نصیرالدین ہاشمی کے پرنانا تھے، اُنھوں نے ان کے حالات اِس طرح قلمبند کیے ہیں:

"مولوی محمد صبغۃ اللہ المخاطب بہ قاضی بدرالدولہ، مدراس کے مشاہیر علماء سے تھے، 1211ھ (1796-97) میں پیدا ہوئے اور 1280ھ (1863-64) میں انتقال فرمایا، مدراس کی جامع مسجد میں مدفون ہیں، مشاہیر علمائے مدراس میں مثلاً مولوی عبدالعلی ملک العلماء وغیرہ سے تحصیل علم کی، نواب واللا جاہ غلام غوث کے عہد میں قاضی مدراس ہوئے، اور انتقال تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے، تفسیر، حدیث، فقہ کے ساتھ ہیئت اور طب میں بھی مہارت رکھتے تھے، ہیئت کے جدید مسائل سے بھی جو اہلِ مغرب نے دریافت کیے تھے واقف تھے، مطب کرتے تھے، فتوے دیا کرتے تھے، درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری تھا، تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی"۔8

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے بعض مزید اطلاعات فراہم کی ہیں، وہ یہ ہیں:

"ان کے والد کا نام محمد غوث تھا، ان کے انتقال کے بعد نواب اعظم جاہ نے انھیں صدر الصدوری کے عہدے کے ساتھ افتا کی خدمت بھی عطا کی، اور عمدۃ العلما بدرالدولہ کے خطاب سے نوازا، انھوں نے عربی میں اُنتیس، فارسی میں چوبیس، اور

اردو میں چودہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں"۔

یہاں ان کی صرف دو کتابوں کا ذکر مختصراً کیا جاتا ہے:

1-سوالاتِ گڈوِن

اس کتاب کے تعارف میں ڈاکٹر حامد اللہ ندوی نے جو لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

"لکھا ہے کہ قاضی صاحب کے عہد میں چونکہ انگریزوں کے ساتھ نوابانِ ارکاٹ کے تعلقات اچھے تھے مسلمانوں کی محفلوں میں عیسائیوں کا آنا جانا بھی تھا، 1242ھ (1826) میں ایک محفل میں ایک عیسائی گڈوِن (GOOD WIN) سے مذہبی بحث چھڑ گئی۔ اس نے دین اسلام پر اعتراضات کرنے شروع کیے۔ ایک شخص محمد ہادی نے جواب دینے شروع کیے۔ یہ مذہبی مناظرہ کئی دنوں تک جاری رہا، آخر گڈوِن نے دین اسلام قبول کر لیا۔ اس کی روداد قاضی صاحب نے مرتب کی ہے"۔

ابتدا:

"یہ رسالہ بیان میں سوالاتِ گڈوِن عیسوی اور جواباتِ محمد ہادی محمدی کے، اور عیسوی کے مسلمان ہونے میں واسطے معلوم ہونے مسلمان بھائیوں کے سن بارہ سو بیالیس ہجری نبوی (1826-27) میں لکھا گیا"۔

خاتمہ:

"تب اس کو کلمہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑھایا اور احکام وارکان مسلمانی کے سکھائے، اور نام اس کا مرزا ہدایت بیگ رکھا"۔

یہ رسالہ مدراس سے چھپ چکا ہے۔

2-ریاض النسواں

یہ فقہ شافعی کی کتاب ہے۔ ابواب اور فصل اس میں مختصر ہیں، بعض یہ ہیں:

ایمان، ارکان ایمان، طہارت، وضو، غسل، تیمم، نماز، نجاستیں، حیض، نفاس، مسح موزہ، نماز کے شرائط، روزہ، زکوٰۃ، حج، حلال وحرام، نماز جنازہ وغیرہ۔

آغاز:

''حمد لا انتہا اور ثنائے بے انتہا اس معبود حقیقی کی تئیں کہ جس نے بنی نوع بشر کو اشرف المخلوقات بنایا، اور اس کو تمیز حلال و حرام پہچاننے کی دیا، تا ہمیشہ اپنی عبادت میں مشغول رہے اور افعال بد سے اپنے باز آوے.....''

اختتام:

''.....اور حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں آخری وصیت یہی فرمائے کہ نماز پر تقید رکھو، اور باندیاں اور غلاماں کے ساتھ نیکی کرو، غرض احادیث بہت اس میں آئی ہیں اور یتیموں پر اور ہمسایہ کے لوگوں پر بہت رحم کرنا اور سب امور میں حق تعالیٰ پر توکل کرنا اور استغفار بہت کرنا مؤ صَلّی اللّٰہ عَلٰی خَلقِہٖ محمّد وَآلہٖ وصحبہٖ وسلّم''۔

کتاب کے نسخہ آصفیہ پر حافظ محی الدین حسین 1246ھ کی مہر ثبت ہے۔ ترقیمہ میں ہے کہ:

''کتاب ریاض النسواں فقہ شافعی بہ تاریخ بست وپنجم شہر ربیع الثانی 1263ھ (1847) روز دوشنبہ فقیر عبداللہ نیازی برائے حافظ محی الدین حسین صاحب در بندر میلاپور بہ اتمام رسید''۔

اس پر کئی برس پہلے کی مہر کا ثبت کرنا لاحاصل ہے۔ شاید 1264 کی مہر ہوگی۔ سہواً یہاں 1246 لکھ گیا ہوگا۔

نصیر الدین ہاشمی نے اس کتاب کی تاریخ تصنیف 1224ھ لکھی ہے۔ اس وقت مصنف کی عمر کوئی تیرہ برس کی ہوگی۔ جو اس کتاب کی تالیف کے لیے بہت کم ہے۔ یہاں بھی شاید سہو ہوا ہے، صحیح سال 1242ھ (1826-27) ہوگا، واللہ اعلم۔

5-مستعان

اس شاعر کا نام مستعان علی ہے، اس کی صرف ایک مثنوی باغ ارم کے نام سے دستیاب ہوئی ہے۔[9] اس کے شروع میں اس نے اپنے متعلقین کے لیے اس طرح دعا کی ہے:

مجھ کو، بھایاں کو، میرے ماں باپ کو　　سب میری اولاد اور احباب کو
دیکھنا یک چشم رحمت کی نظر　　تا دو عالم میں نہ ہو ہم کو ضرر

ایک جگہ اس نے اپنے نسب کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے ۔

تو مجھے انسان کی خلعت دیا　　نسل میں صدیقؓ کی پیدا کیا
شاہ علاء الدّین میرا جدِّ جد　　ہے فقیری میں اسے تیری مدد
رکھ مجھے ان کے قدم پر استوار　　واسطے صدیقؓ کے اے کردگار

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ شاہ علاء الدین صدیقی کون تھے۔

اپنے مرشد کا ذکر مستعان نے ان شعروں میں کیا ہے ۔

یہ مرا مرشد امام العارفیں　　شاہ اسماعیل ملتانی یقیں
عرف ان کا نام حضرت بادشاہ　　پیر ہیں پیروں کے اور شاہوں کے شاہ
خاندان ان کا ہے روشن آفتاب　　ہیں مرے اجداد جس کے فیض یاب
پر طفیل اس شاہ دیں کے دل مرا　　دین کے رستے طرف مائل ہوا

اپنے مرشد کی ہدایت پر مستعان نے تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ مثنوی مولانا روم بہت پسند آئی۔ اس کے انتخاب کا اس نے اردو مثنوی کی صورت میں ترجمہ کرنا شروع کیا

مثنوی تفسیر ہے قرآن کی　　مثنوی کیلی ہے کل عرفان کی
جو کہے حضرت جلال الدین روی　　ذات پاک ان کی تھی یک بحر علوم
دل میں یوں آیا کہ گر یہ فارسی　　ترجمہ ہو　　با زبانِ ہندوی
سہل تر مقصد کو پاویں دوستاں　　پر دماغ اس کے سمجھنے کا کہاں

سبب تالیف کے بیان میں شاعر نے کتاب کا نام اور اس کا سالِ تصنیف بھی بیان کیا ہے ۔

پس اے فردوس عالی ہو مقام　　اس لیے باغ ارم ہے اس کا نام
نام اس کا میں رکھا باغ ارم　　رکھ مدام اس کو خدایا محترم

1244ھ

سال بھی اِس نام سے ہے آشکار یک ہزار ودو صد وچہل وچہار

1244ھ(1828-29)

اس مثنوی کے نسخۂ حیدرآباد کا جو نہایت خوبصورت ہے ترقیمہ یہ ہے:

''الحمد للہ رب العالمین، تمت الکتاب بعون الملک الوہاب، بتاریخ بست دیکم شہر ذیقعدہ بروز شنبہ بہ وقت ظہر 1255ھ (1839) بہ حسب فرمائش مشفقی دکمری حضرت شیخ محمد عالم صاحب قبلہ، کاتب الحروف محمد بہاء الدین ولد عبدالغفور ساکن سات گڑھ، جملہ ابیات چہار ہزار چہار صد مع سیاہی وسرخی''۔

6-ندرت

ان کا نام حکیم محمد یحییٰ، تخلص ندرت تھا۔ مصطفیٰ علی خاں گوپامئوی کے جو مدراس کے قاضی القضات تھے، بیٹے تھے۔[1] یہ شاہ اسماعیل قادری ابن شاہ ابراہیم کے مرید تھے بلکہ ان کے آباواجداد بھی اسی خاندان میں مرید ہوتے آئے تھے، پیر کی صحبت میں ان کے خیالات تصوف کی طرف مائل ہوئے اور وہ مولانائے روم کی مثنوی کے مطالعے کی طرف متوجہ ہوئے۔ کچھ مدت کے بعد انھوں نے اس کے منتخب اشعار کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا تاریخی نام باغ ارم رکھا۔ چنانچہ ذیل کے شعروں میں ہے۔

نام اس کا میں رکھا باغ ارم رکھ مدام اس کو خدایا محترم

1244ھ

سال بھی اس نام سے ہے آشکار یک ہزار ودو صد وچہل وچہار

1244ھ(1828-29)

بہ ظاہر یہ اور مستعان کی مذکورہ مثنوی ایک ہی ہے، کسی غلط فہمی کے سبب سے اس کے دو نسخوں کو جداگانہ مثنوی خیال کر کے ان کے مصنف کی حیثیت سے دو الگ الگ نام مقرر کر دیے گئے ہیں۔ واقعی مصنف ندرت ہے نہ کہ مستعان، اس مخطوطہ کا ترقیمہ یہ ہے:

''تاریخ باغ ارم از حکیم محمد یحییٰ صاحب المتخلص بہ ندرت فرزند قاضی القضات حکومت مدراس مصطفیٰ علی خان بہادر گوپامئوی جعل الجنۃ مثواہ

یافت ایں نسخہ چو زیب ارقام بہ عنایات حکیم مطلق
ہاتھم گفت یکایک سالش بے بہا نسخہ عرفان حق

1244ھ(1828-29)

تاریخ کہنے والے اور خود کاتب کا نام اور سال کتابت وغیرہ معلوم نہیں ہوسکا۔ نسخہ قریب چار سو صفحوں پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر تیرہ سطریں ہیں، مثنوی کے تعارف میں ڈاکٹر زور نے لکھا ہے:

''پوری مثنوی میں اسی طرح کے (اردو نثر میں) سوا سو عنوانات ہیں، جن کی فہرست ابتدا میں لکھ دی ہے۔ جملہ ابیات دس ہزار سے زیادہ ہیں۔ فہرست عنوانات کے بعد تین صفحات اردو نثر کے ہیں، جن میں اردو املا کی بہت ضروری اور مفید باتیں لکھی ہیں مثلاً:

''ہا کی دو صورت ہیں، اگر ظاہر اور متحرک ہو تو یک چشمی لکھنا جیسا کہا۔ جہاں، تہاں وغیرہ، اگر ساکن اور مخفی ہو تو دو چشمی جیسا کھایا، گھایل، گھانس، گھڑا وغیرہ''

اس حصۂ نثر کی ابتدا عربی حمد و نعت کے بعد اس طرح ہوتی ہے:

معلوم کرنا رسم الخط کا واسطے صحیح لکھنے پڑھنے زبان ہندی کے بہت ضرور اور پُر فائدہ ہے''۔

اختتام:

''.....تفصیل اس اجمال کی مبسوط رسالوں سے ہی معلوم ہوگی، وَالسّلام''۔

یہ جُزو بہت قابل قدر و توجہ ہے، تحریر کے مسائل سے متعلق بحث اس سے پہلے الفت کی مثنوی دین دیپک میں بھی مختصراً ملتی ہے۔ اس تحریر کو بلا شبہ اوّلیت حاصل ہے، اس کے بعد یہ مسائل مذکورہ بالا تین صفحوں پر زیر بحث آئے ہیں۔ یہ بات دیکھنے کی ہے کہ املا اور تحریر کے معاملات و مسائل کی طرف پورے ملک میں غالباً سب سے پہلے کرناٹک اور مدراس کے اہلِ ذوق کو توجہ ہوئی تھی، اس اعتبار سے ان کے کاموں کی تحسین ضروری ہے۔

7- رونق

ان کا نام عارف الدین خان اور تخلص رونق تھا۔ حافظ محمد معروف کے بیٹے تھے اور ان کا وطن اصلی برہان پور تھا۔[11] وہاں سے یہ مدراس میں آکر رہنے لگے تھے ڈاکٹر زور نے ایک نثری رسالے کے تعارف میں لکھا ہے:

''کنز الرموز- قریب 1200ھ (1786) قدیم دکنی نثر کے اس رسالے کے مصنف اور اس کے سنہ تالیف کا پتہ نہ چل سکا۔[12] چونکہ محمد مہدی واصف نے اپنے اردو رسائل کے ساتھ اس کو نقل کیا ہے۔ ممکن ہے کہ انھیں کے بزرگوں یا ان کے والد محمد عارف الدین خاں رونق کی تالیف ہو۔ اس رسالے کو نو فصلوں اور ایک خاتمہ پر مرتب کیا گیا ہے۔

آغاز:

''الحمدُ للّٰہ علیٰ افضالہٖ وَالصّلاۃُ وَالسّلام علیٰ محمد وَآلہٖ اَجمعین، لیکن بعد یہ رسالہ ملیا ہُوا اوپر نو فصل کے، خاتمہ جو نام رکھیا سات کنز الرموز کے، و اَباللہ التوفیق۔ فصل اول: علماء کہیں ہیں جو دس چیز زیادہ کرتے ہیں حفظ کوں، اول کھانا کھانا حلاوت کا.....''

اختتام:

''.....آٹواں بامر دماں باادب رہنا، نواں تمام کے تئیں خیر کی توفیق دینا، یہ نوں فصل مرتب ہوئی بحق محمد وآلہ الامجاد، (کوئی ترقیمہ نہیں ہے)''۔

رونق اپنے زمانے کے معروف شاعروں میں سے تھے۔ ان کے تعارف میں زور صاحب نے لکھا ہے:

''متولد 1192ھ (1778) محمد باقر آگاہ کے شاگرد تھے، حیدر آباد میں وفات پائی تھی''۔[13]

بیاضوں میں رونق تخلص سے بعض غزلیں ملتی ہیں۔ ان کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انھیں رونق کی ہیں۔

8- مسکین و واصف:

یہ عارف الدین خان رونق کے بیٹے تھے۔ مولوی محمد مہدی نام تھا، اور دو تخلص کرتے تھے۔ یعنی مسکین اور واصف، ان کے حالات ڈاکٹر زور نے اس طرح لکھے ہیں:

''مدراس میں 1217ھ (1802) میں پیدا ہوئے، بعد تکمیل تعلیم انگریزوں کی تعلیم کے لیے سرکار کمپنی کے مدرسہ میں ملازم ہوئے، سترہ برس کی ملازمت کے بعد وہاں

سے سبکدوش ہوئے، 1262ھ (1846) میں نواب غلام غوث خان اعظم جاہ کے
دربار میں مترجمی کی خدمت پر مامور ہوئے، نواب کی وفات کے بعد حیدرآباد چلے گئے
اور مدرسۃ العلوم میں عربی کے استاد مقرر ہوئے، 1290ھ (1873) میں وفات
پائی، واصف فارسی اور اردو کے بڑے مصنف اور شاعر تھے"14

ان کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں:

دلیلِ ساطع، دلیل الشعرا، گلزارِ عجم، مختصر برہانِ قاطع، املا نامۂ واصفی، تذکرہ معدن الجواہر، ترجمہ جلد اول دُرِ مختار، ترجمہ آدابُ الصالحین، تحسینِ اخلاق، خلاصۃ التکمیل عقاید، مطلوب الاطباء، نفایس کلام، توصیف النبی۔

محمد واصف مہدی کے ایک فرزند عبدالکریم والا تھے۔ دوسرے ملّا عبدالقیوم، واصف کی درج ذیل تصانیف بھی ہیں:

تہذیب الاخلاق (عربی) ترجمہ رسولہ عشر ہر سالہ در بیان سلام رسالہ تعبیر خواب تذکرہ، حدیقۃ المرام (عربی)

یہاں دلیل ساطع کا مختصراً تعارف کرایا جاتا ہے، اس کے نسخۂ کراچی کے بارے میں افسر امروہوی نے لکھا ہے:

"دلیل ساطع۔ صفحات 451، سطور فی صفحہ 29، 30، سنۂ تصنیف 1248ھ
(1832) سنہ کتابت 1298ھ (1881)"15

دلیل ساطع میں ہندی الفاظ کے معنی و مطالب درج کیے گئے ہیں، تلفظ کی صحت کے لیے اعراب کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ آخر میں تذکیر و تانیث کے کچھ اصول بتا کر بہت سے مذکر و مونث اسما کی جدولیں دی گئی ہیں۔ دلیل ساطع نواب عظیم جاہ والی ارکاٹ کے عہد میں تصنیف ہوئی۔ املا کے لیے ٹ کے اوپر چار نقطوں کا نشان ہے۔ مصنف نے اڑتالیس کو اٹھتالیس، اڑتیس کو اٹھتیس اور اڑسٹھ کو اٹھسٹھ لکھا ہے۔

کرناٹک اور مدراس کی جن مختلف کتابوں کا اوراقِ گذشتہ میں ذکر کیا گیا ہے اعداد کا یہی تلفظ ان میں سے اکثر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ امیر مینائی کے تذکرہ انتخاب یادگار میں بھی

اس کی بعض صورتیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

واصف اپنے زمانے کے اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ان کا دیوان مدراس میں چھپ گیا تھا اور اس کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی کے کتب خانہ خاص میں موجود ہے۔

9-کمتر

مدراس کے رہنے والے کوئی علم دوست شخص تھے۔ان کا نام قادر علی تھا اور اکبر بیگ کے بیٹے تھے۔کمتر کے دو چھوٹے بھائی تھے۔محمد ابراہیم اور عبداللہ بیگ، مصنف نے پہلے کی تعلیم کے لیے اردو نثر میں فارسی کی معروف کتابوں مفتاح الصلوٰۃ، خلاصۃ الاحکام اور خزانۂ عبادت کو سامنے رکھ کر 1232ھ (1817) میں مصباح الصلوٰۃ کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔مصنف کی وفات کے بعد دوسرے چھوٹے بھائی نے اس کتاب کی ایک نقل تیار کی جو ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد میں محفوظ ہے۔[16]

آغاز:

''تمام تعریف سزاوار ہے اُس پروردگار عالم کو کہ اپنے لطف وعنایت سے امر ونہی کا حکم فرمایا، بھی اپنے کرم ونوازش سے راہ راست شریعت کو بتلایا.....''

خاتمہ:

''بندہ نواز وکارساز اس ترجمے کوں مشہور کر، اور تیرے حبیب کے واسطے اس رسالے کو منظور کر، اور میرے بھایاں کو جو کہ اس رسالے کے ترجمے کا سبب وہی ہیں راہ ہدایت دکھا، اور ان کو اپنے لطف واحسان سے علم شریعت سکھا، بھی تمام مسلمان بھایاں کو عبادت کی توفیق، شوق سے اس کتاب کے سعادت رفیق کر''۔

سب سے چھوٹا بھائی جس نے اس کتاب کو نقل کیا ہے مبتدی تھا۔اس لیے کاتب کی حیثیت سے وہ کم سواد اور زشت خط تھا، ترقیمہ کی عبارت یہ ہے:

''عنایت سے اللہ تعالیٰ کی کتاب مصباح الصلوٰۃ ترجمہ کیا گیا، میرے بڑے بھائی اور استاذ حضرت قادر علی صاحب قبلہ مرحوم کمتر تخلص، ساتویں تاریخ کو ماہ ربیع الثانی 1256ھ (1840) میں دوشنبہ کے روز ابراہیم بیگ لائس نایک مدرسے میں

ساتویں رجمنٹ کا ہے موافق التماس لیاقت مآب شمس الدین سپاہی تیسری ٹرپ کے،
توفیق دیوے اللہ تعالیٰ اس کو علم شریعت کے پڑھنے کی، الراقم فقیر محمد عبداللہ بیگ ابن
اکبر بیگ"۔

یہ کتاب سپاہی کے پڑھنے کے لیے نقل کی گئی تھی اور اُسی کی ملکیت میں رہی تھی سرورق پر اس کے دستخط موجود ہیں۔ ضخامت ایک سو چون صفحات اور فی صفحہ تیرہ سطر ہیں۔

قادر علی کمتر بظاہر معمولی درجے کے شاعر رہے ہوں گے۔ ان کا کلام ہمیں دستیاب نہیں ہو سکا۔

شروع میں ایک کمتر کا ذکر کیا گیا ہے بظاہر وہ اس قادر علی کمتر سے مختلف شخص ہیں۔

حواشی

میسور

1-اردو مخطوطات آصفیہ جلد 2	ص 115
2-اردو مخطوطات انجمن جلد 2	ص 168
3-اردو مخطوطات آصفیہ جلد 1	ص 198
4-اردو مخطوطات انجمن جلد 2	ص 198 تا 199

کرناٹک

1- واقعات اظفری	ص 126
2-اردو مخطوطات آصفیہ جلد 2	ص 113
3-اردو مخطوطات آصفیہ جلد 2	ص 143
4-اردو مخطوطات انجمن جلد 5	ص 356
5-اردو مخطوطات آصفیہ جلد 2	ص 29 تا 31
6-تذکرہ مخطوطات جلد 5	ص 220
7-اردو مخطوطات انجمن جلد 2	ص 46 تا 47
8-اردو مخطوطات آصفیہ جلد 1	ص 141 تا 143
9- تذکرہ مخطوطات	جلد 1 ص 93 تا 95
10-اردو مخطوطات انجمن جلد 5	ص 84 تا 85

11-ایضاً جلد5 ص247ت250

12-اردو مخطوطات آصفیہ جلد1 ص127ت128

13-اردو مخطوطات آصفیہ جلد1 ص195

14-ایضاً جلد1 ص88ت89

15-اردو مخطوطات آصفیہ جلد1 ص90

16-اردو مخطوطات انجمن جلد5 ص133

17-ایضاً جلد5 ص355ت358

18-ایضاً جلد5 ص248

19-اردو مخطوطات آصفیہ جلد1 ص88

20-اردو مخطوطات انجمن جلد3 ص42ت43

21-عمدۂ منتخبہ ص95ت96

22-اردو مخطوطات انجمن جلد2 ص109

23-تذکرہ مخطوطات جلد1 ص155ت157

24-ایضاً جلد1 ص157ت158

25-اردو مخطوطات آصفیہ جلد1 ص129ت130

26-ایضاً جلد1 ص292ت293

27-تذکرہ مخطوطات جلد1 ص141ت142

28-اردو مخطوطات آصفیہ جلد2 ص23ت24

29-جائزہ مخطوطات جلد1 ص1207ت1210

30-ایضاً جلد1 ص1211ت1216

31-سراپا سخن ص105

مدراس

1-واقعات اظفری ص151

2-ایضاً ص183

3-بمبئی کے اردو مخطوطات ص72ت75

4-اردو مخطوطات انجمن جلد2 ص173ت174

5-ایضاً جلد2 ص65ت66

6- اردو مخطوطات آصفیہ جلد2 ص101

7-بمبئی کے اردو مخطوطات ص84ت86

8-اردو مخطوطات آصفیہ جلد2 ص101ت102

9-تذکرہ مخطوطات جلد1 ص104ت106

10-ایضاً جلد5 ص208ت210

11-اردو مخطوطات انجمن جلد6 ص153

12-تذکرہ مخطوطات جلد5 ص157ت158

13-ایضاً جلد1 ص288

14-ایضاً جلد5 ص158ت159

15- اردو مخطوطات انجمن جلد6 ص153ت154

16-تذکرہ مخطوطات جلد2 ص128ت129

بیرونِ ملک

(1)ایران وافغانستان	495
(2)نیپال	499
(3)برما	501
(4)لنکا	507
(5)فرنگ	509
حواشی	513

(1)

ایران وافغانستان	495
1-محمود حافظ محمود خان	496
2-سفیر غلام نبی خاں	497
3-خواجہ فریدالدین	498
4-خورشید خورشید احمد	498

ہندوستان کی قدیم ترین داستانوں میں بھی جمبودیپ اور سراندیپ وغیرہ کا ذکر ملتا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ یہاں کے قدیم باشندوں کو بیرونِ ملک کے مقامات سے بخوبی دلچسپی رہی ہے۔ان سے متعلق اپنی معلومات کو وہ لوگ قصے کہانی کی صورت میں ڈھال کر خاص وعام میں مشتہر کرتے رہتے تھے۔

برصغیر ہند شروع سے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم رہا ہے۔عالمگیراورنگ زیب نے جو نہایت بیدار مغز اور اولوالعزم بادشاہ گذرا ہے ہر قسم کے رشتوں اور تعلقات کو نظر انداز کر کے مغرب سے مشرق تک اور شمال سے جنوب تک پورے ملک ہندوستان کو متحد کر کے، اسے ایک جھنڈے کے نیچے لاکر، ایک اکائی کی صورت دے دینے کی جو سعی کی تھی۔تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

مغل سلاطین کی بخشی ہوئی رعایتوں سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے بنگال کے علاقے میں اپنے قدم جما لینے کے بعد کلکتے کو دارالامارت کی حیثیت دے دی، رفتہ رفتہ جنوبی ایشیا میں ان کی عملداری قائم ہوگئی اور کچھ شک نہیں کہ اس صورت حال نے پورے خطے کو ہر اعتبار سے ترقی دینے میں غیر معمولی کردار ادا کیا تھا۔

عالمگیراورنگ زیب کی جدوجہد نے زبان اردو کو مختلف جہتوں سے ترقی دے کر اسے ملک گیر زبان کا درجہ عطا کر دیا تھا۔پھر انگریزی عملداری کے پھیلاو نے اِس نکھری سُتھری ترقی پذیر زبان کو نئے نئے علاقوں اور ملکوں تک پہونچا کر وہاں بھی رواج پانے اور پھلنے پھولنے

کے جدید مواقع پیدا کیے اور اس طرح اسے ایک بین الاقوامی زبان کی حیثیت حاصل کر لینے کی راہ پر ڈال دیا۔

شمال مغرب کے مسلم ممالک مثلاً افغانستان ایران وغیرہ کے ساتھ مغلیہ سلطنت کے عمدہ روابط تھے اور ان میں سے بعض کے ساتھ سفارتی تعلقات بھی تھے محمد شاہ بادشاہ کے زمانے کا ایک واقعہ اس طرح تحریر کیا گیا ہے:

''سالم آفندی، ایلچی روم، از راہ سورت وارد شدہ، بہ اورنگ آباد رفت و ہماں جا اوائل محرم 1159ھ (1746) فوت شد''۔

اس زمانے میں جن مختلف ممالک کے باشندے ہندوستان میں مقیم تھے ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

کابلی، ایرانی، تورانی، سلجوقی، جزائری، حبشی، اور رومی، فرنگی، ارمنی وغیرہ

ان سب کا ہندوستان میں آنا جانا بھی تھا، چنانچہ ان کی زبانوں میں ایک دوسرے سے الفاظ اور اصطلاحات کے لین دین کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

شمال میں نیپال، مشرق میں برما اور جنوب میں لنکا وغیرہ اگرچہ ہندوستان میں شامل نہیں تھے، انگریزوں کے دور اقتدار میں اس ملک کی جو تاریخیں لکھی جارہی تھیں، ان میں ان ممالک کے واقعات بھی شامل ہوتے تھے، اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی کے زمانے میں ہندوستان (بہ شمول پاکستان اور بنگلہ دیش) کی حدوں سے نکل کر زبان اردو مذکورہ ممالک تک پہنچ گئی تھی، اس وقت چونکہ رابطہ ایک حد تک ابتدائی مدارج میں تھا، اس زبان کے نقوش بھی اسی نوعیت کے تھے، رفتہ رفتہ ان میں استحکام اور مضبوطی کی صورت آتی گئی۔

1- ایران و افغانستان

ہندوستان اور افغانستان کے مابین روابط قدیم بھی ہیں اور کئی طرح کے بھی ہیں۔ اپنے تذکرے میں حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے شاہ عالم ثانی کے زمانے کے ایک وقائع نویس کا ضمناً ذکر کیا ہے، اس طرح:

''محمود تخلص، مردے است حافظ قرآن مسمی بہ محمود خاں کہ اسم سامی خود را بہ تمامہ جا بے تخلص

جامی دہد، وے از افاغنۂ سہرند و مرد ہوشمند، خوش اختلاط، نیک ارتباط است، پدر والاقدرش
بہ وقائع نگاری محالات آن نواح از قبل حکام دارالحکومت کابل عزّ امتیاز داشت''۔

محمود کے والد اور ان کے متعلقین کے واسطے سے بھی یہ گمان غالب زبان اردو کابل کے علاقے میں پہنچ رہی تھی۔ اکبر شاہ ثانی کے وقت میں ہندوستان کے علمی حلقوں میں ممالکِ عالم کے حالات سے جس حد تک دلچسپی تھی اس کا اندازہ ''جہاں نما'' نامی ایک کتاب سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے مخطوطہ کراچی کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

''جہاں نما، صفحات ستانوے سطور بیس تا چھبیس سنہ تصنیف: قبل از 1847ء
(1263ھ)

جہاں نما ایک قسم کی تاریخ ہے۔ جس میں بعض ممالک کا تعارف پیش کیا گیا ہے، ابتدا میں کرۂ زمین کا رقبہ، قطر اور محیط، برّ اعظموں کی تقسیم، اس کے بعد تمام دنیا کے ممالک کے نام، حکومت کی تقسیم۔ رقبہ مربع میل، آبادی فی مربع میل، زاجد ھانی، زاجد ھانی کی آبادی، ایک نقشے میں ظاہر کیے گئے ہیں۔ ان ممالک کی تعداد ایشیا میں چھبیس، افریقہ میں سینتیس، یورپ میں تینتیس، شمال وسطی امریکہ میں سترہ، جنوبی امریکہ میں تیرہ، سات ممالک ان کے علاوہ ہیں۔ جن میں آسٹریلیا بھی شامل ہے۔ یہ ممالک مجموعی طور پر ایک سو تینتیس ہیں۔ مصنف نے اسپین ایران اور افغانستان کے حالات نہایت تشریح سے لکھے ہیں''۔

سلطنت دہلی سے اتحاد و اتفاق کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ایران کے بادشاہ نے کلکتہ میں سرکار کمپنی کی عملداری کو تسلیم کر لیا تھا اور انھوں نے کلکتہ میں اپنا سفیر بھی بھیج دیا تھا، شیخ غلام ہمدانی مصحفی نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''غلام نبی خاں سفیر تخلص کہ از پیش وائی ایران بہ رسم رسالت بہ کلکتہ آمدہ، وصاحب کلان کلکتہ رسم استقبالش بجا آوردہ اورا بسیار عزت وتوقیر کردہ واز پری چہرۂ قوم خود مجلس رقص ترتیب دادہ واز آنجملہ حورنژادے بہ تیغ غمزۂ خونریز قتیل خنجر عشقش ساختہ وبہ نظرہائے پنہانی آن مہمار .... حسن وناز را نواختہ، مشارالیہ این غزل حسب حال

خود در شان او گفتہ....

امشب جمال یار من دارد تماشائے دگر　　یا آں کہ من می بینمش بہتر ز شبہائے دگر

مرزا قادر بخش صابر نے سرکار کمپنی کی طرف سے شاہ ایران کے یہاں بھیجے جانے والے سفیر کا حال اس طور پر قلمبند کیا ہے:

''آں شخص جواد الدولہ سید احمد خاں....ان کے جد مادری نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ پہلے سرکار انگریزی سے توسل شایستہ رکھتے تھے اور پیشگاہ گورنمنٹ ہند سے سفارت شاہ ایران پر مامور ہوئے اور اپنے حسن تدبیر سے انگریز اور بادشاہ ایران میں عہود اور مواثیق کے دل خواہ استحکام دیا، انگریز کی طرف سے اس امر خطیر کے صلے میں ایک عہدۂ جلیلہ کے ساتھ نامزد ہوے یعنی مملکت 'اودھ' میں پولیٹیکل اجنٹ ہو گئے، بعد موت حضرت شاہ جہاں آباد میں آے اور بادشاہ مجاہد اکبر شاہ ثانی کی نظر عنایت سے سرفراز ہو کر عہدۂ وزارت سے مشرف ہوئے''۔

سفیروں اور ان کے عملے کے تبادلے کے اثر سے زبان اردو کو دوسرے ملک کے پایۂ تخت میں پہنچنے کے جو مواقع ملے ہوں گے ان پر خیال کرنے کی ضرورت ہے۔

سرکاری سطح کے ان معاملات سے قطع نظر بعض صاحب علم ہندوستانی بھی ایران جاتے تھے، چنانچہ صابر کے تذکرے سے ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''خورشید تخلص، خورشید احمد لکھنؤ مولد، دہلوی مسکن...اوائل میں شاہ رؤوف احمد سے، خاندان نقشبندیہ میں بیعت کر کے اجازت ارشاد مریدین با اخلاص حاصل کی، پھر شاہ سعد اللہ حیدر آبادی اور شاہ احمد سعید سے فیضیاب ہو کر اجازت لی اور...اقصائے نواحی ہندوستان اور خراسان اور ماوراء النہر اور ولایت فرغانہ اور بلخ اور بخارا اور سمرقند میں سیر کی...اشعار فارسی در بیشتہ طرز خوش اور روش دلکش کے ساتھ کہتا ہے...''۔

اردو کے ان کے دو شعر نمونہ کے طور پر یہاں نقل کیے جاتے ہیں ۔

کہاں پہلو میں دل خورشید جس کو ہم تسلی دیں　　جو کچھ تھا آنسوؤں کے ساتھ خوں ہو کر نکل آیا

نوید وصل یہ مانا کہ جھوٹ ہے خورشید　　کسی طرح کوئی تسکین اضطراب تو دے

(2)

نیپال

بیتاب کشن نرائن

شمال کی سمت میں ایک لمبی پٹی کی طرح تین پہاڑی ریاستیں پھیلی ہوئی ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں: بھوٹان، سکم اور نیپال

ان میں سب سے بڑی نیپال کی ریاست ہے، اس کے بارے میں لکھا ہے:

''وسعت: آٹھ ہزار مربع میل، سالانہ آمدنی بتیس لاکھ روپے، سرکار (انگریزی) سے عہد نامۂ آشتی ہے''۔

ہندوستانیوں اور نیپالیوں کا ایک دوسرے کے ملک میں مدت سے بے روک ٹوک آنا جانا رہا ہے چنانچہ دونوں کی زبانوں کی اجنبیت بھی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے میں ہے:

''بیتاب تخلص، کشن نراین، قوم کھتری، ساکن بنارس، راجا شہر نیپال کے اعزہ میں سے ایک دو شخص شہر بنارس میں بود و باش اور عزت و اعتبار کے ساتھ عمر بسر کرتے ہیں، یہ موزوں طبع ان دنوں اس بلند مرتبت کی سرکار میں ملازم اور صاحب اعتبار ہے، یہ دو شعر اس کے اشعار سے منتخب ہو کر درج تذکرہ ہوئے۔

بکھرے بالوں میں ہے یوں ماتھے پہ افشاں کی چمک جیسے بدلی میں ہو نقشہ کرمک شب تاب کا

پتلیاں آنکھوں کی کب خائف ہوں بحر اشک سے مردمِ آبی کو کچھ خطرہ نہیں سیلاب کا

(3)

برما

(1) مولوی رمضان الحق 503

(2) محمد صالح 504

(3) مسرور سید محمد علی 504

برما کا ملک ہندوستان کے مشرق میں واقع تھا، انگریزوں نے اس پر بھی قبضہ کر لیا تھا، چنانچہ ان کے دور میں یہ دونوں ملک عملاً ایک ہو گئے تھے۔ مغلوں کے وقت میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں اسلامی تعلیم کے مراکز قائم ہو چکے تھے۔ ان میں دور دراز تک سے کسب فیض کے لیے طالب علم آتے تھے۔ برما کے مسلمان بھی اپنے اخلاف کو اس غرض سے یہاں بھیجتے تھے۔ یہ سلسلہ انگریزوں کے دور میں بھی جاری رہا تھا۔ چنانچہ ذیل کے اقتباس سے بھی ظاہر ہے:

''حکیم مولوی رمضان الحق (1893 تا 1959) پُر جوش مبلغ، اعلیٰ پایہ کے طبیب، بڑی ہی تنظیمی صلاحیتوں کے مالک تھے، اپنے وطن محمدی میں ایک دار العلوم قایم کیا جس میں برما، بنگال اور افغانستان تک کے طلبا تعلیم پاتے تھے''۔

وہ زمانہ تھا جب ممالکِ مشرقی مثلاً چین جاپان ہی نہیں امریکہ جانے کے لیے بھی برما سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ شیو برت لال کے حال میں مذکور ہے کہ:

''2 اگست 1911 کو شیو برت لال لاہور سے نکلے، کلکتہ پہنچے۔ وہاں سے 22 اکتوبر کو جہاز سے رنگون کے لیے روانہ ہوئے.... سنگاپور جاوا ہوتے ہوئے دسمبر میں سین فرانسسکو پہنچے''۔

شیو برت لال کا کہنا ہے کہ رنگون سنگاپور جاوا وغیرہ مقاموں پر ہندوستان سے آنے والوں میں ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمان زیادہ ہوتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے کتب خانہ میں ایک قلمی کتاب ''فیض عام'' ہے، اس کا

سال تصنیف 1250ھ (1834) بتایا گیا ہے۔اس کے مصنف کے بارے میں لکھا ہے:

''مصنف نے اپنا نام محمد صالح لکھا ہے وہ 1250ھ میں رنگون میں تھا اور چند روز کے بعد حیدر آباد آ گیا تھا۔یہیں اس نے فیض عام کی تکمیل کی''۔

یہ ایک مقدمہ اور چھ فصلوں پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔اس کی تالیف میں مصنف کو خاصا وقت لگا ہوگا۔اس بنا پر قیاس کہتا ہے کہ اس کام کو مصنف نے رنگون کے قیام کے زمانے میں شروع کیا ہوگا،اس کے آغاز کی عبارت یہ ہے:

''الحمد للہ الذی ہدانا للایمان وابعدنا عن الشرک والطغیان والصلاۃ والسلام..... للضلالۃ والبدعۃ اما بعد! کہتا ہے بعد حق جو راست گو فقیر سراپا تقصیر خادم العلماء محمد صالح عفی عنہ کہ 1250 بارہ سے پچاس میں اس فقیر کا گذر رنگون طرف ہوا، قضارا پندرھویں کو شعبان المعظم کی ایک جاے....لالہ میاں کر کے مشہور تھا اور ایک ہندو جس کا....''۔

اور کتاب کا خاتمہ ان فقروں پر ہوا ہے:

''آخرت میں خاص شفاعت سید المرسلین کی ہماری اور ان کی نصیب کرے،اور نیچے لواے محمدی کے ہم سب کا حشر کرے،آمین یارب العالمین بحق رسولہ محمد وآلہ الطاہرین وصلی اللہ علی خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین،آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین،تمت تمام شد''۔

اس طرح یہ بات ظاہر ہے کہ برما کے شہروں میں مقیم اور وہاں سے گذرنے والے ہندستانی صاحبان علم وہاں بھی اپنے علمی کاموں کے سلسلے کو جاری رکھتے تھے اور ان کے اثر سے ان شہروں میں بھی زبان اردو کم وبیش رواج پا رہی تھی۔افسوس کہ اس علاقے کی اردو کی تحریروں کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے۔

ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ نے اپنے تذکرے میں اردو کے ایک ایسے شاعر کا بھی ذکر کیا ہے جس نے برما کے علاقے کی سیر کی تھی۔لکھا ہے:

''مسرور تخلص،سید محمد علی ولد سید علی طباطبائی نواسہ میر شیر علی افسوس باشندۂ کلکتہ،شعر

عاشقانہ اچھا کہتے تھے۔ کلام اپنا راقم کو دکھلاتے تھے۔ اطراف ایران و پنجاب
و ہندوستان و رنگون وغیرہ بہت سے ملک و شہر کی سیر کی تھی۔ عین شباب میں تیسویں شہر
ذی الحجہ 1280ھ (1864) کو انتقال کیا"۔

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے ؎

دل اور پھر گیا ہے اس یار بدگماں کا — تاثیر آہ دیکھی دیکھا اثر فغاں کا
مشکل ہماری کیسی آسان ہجر میں کی — احسان مانتے ہیں ہم مرگِ ناگہاں کا
مضمون میرے شعر کا کیا سمجھیں کوردل — ہوتا ہے نور بھی کہیں چشم رکاب میں
نہ وفا گل میں ہے نے نالۂ بلبل میں اثر — باغ عالم کی ہوا اے گلِ رعنا بدلی

(4)

لنکا

1-باجن	508
2-ناصر	508

ملک ہندوستان کے جنوب میں بُندے کی صورت میں جو جزیرہ ہے اسے اب سری لنکا کہتے ہیں اور زمانۂ قدیم میں اس کا نام سیلون تھا۔ شیخ بہاءالدین باجن نے اپنی تالیف خزینۂ رحمت میں اپنے سفر کا بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایں فقیر تا طرف سندھ قریب خراسان و طرف دکن تا قریب سرحد سیلان مسافر بود''۔

سیلون یا سری لنکا کی زبان اور معاشرت وہی تھی جو جنوبی ہند کے علاقے معبر (صوبۂ مدراس) کی ہے۔ دونوں کے علمی معاملات بھی کم و بیش یکساں تھے چنانچہ زبان اردو بھی معبر سے ہوتی ہوئی سیلون تک پہنچ گئی تھی۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ایک قلمی بیاض کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''طویل نظم امداد نامہ بطور مخمس ایک ایسی بیاض میں درج ہے جو 1207ھ (1792-93) اور 1235ھ (1819-20) کے درمیانی زمانے میں بہ اوقات مختلف لکھی گئی ہے.... اس طویل نظم میں جن مقامات کے اولیاء کا ذکر ہے ان کے نام بہ لحاظ حروف ابجد ترتیب دے کر ذیل میں درج کیے جاتے ان سے شاعر (ناصر) کی معلومات اور سیاحی کی وسعت کا بھی اندازہ ہو سکے گا''۔

اس میں لنکا کے ''شاہ ننھے'' کا نام بھی آیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کے بعض شاعر اس دور افتادہ جزیرے تک بھی جاتے تھے اور ان کے واسطے سے ان کی زبان اردو بھی وہاں کسی نہ کسی طور پر پہنچ رہی تھی۔

(5)

فرنگ

1- ٹائپ اور طباعت 511

2- علمی ادارے 511

یورپی اقوام میں سب سے پہلے ہندوستان کے سواحل پر قدم رکھنے کا شرف پرتگالیوں کو حاصل ہوا۔ ان کے بعد فرانسیسی اور ڈچ آئے، پھر انگریزوں کی آمد ہوئی۔ اس سلسلے میں مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے:

''اہلِ فرنگ کا آنا اور ان کی خاطر داری

979ھ (1571-72) میں ابراہیم حسین مرزا نے بغاوت کر کے قلعہ بندر سورت پر قبضہ کر لیا، بادشاہی لشکر نے جا گھیرا اور خود اکبر بھی یلغار کر کے جا پہونچا، سوداگران فرنگ کے جہاز ان دنوں میں آتے جاتے رہتے تھے، مرزا نے انھیں لکھا کہ اگر تم آؤ اور اس وقت میں میری مدد کرو تو قلعہ تمھیں دیدونگا، وہ لوگ آئے مگر بڑی حکمت سے آئے .... جب لڑائی کے پلے پر پہنچے تو دیکھا کے سامنے کا وزن بھاری ہے، جھٹ رنگ بدل کر ایلچی بن گئے اور کہا کہ ہم تو اپنی سلطنت کی سفارت پر آئے ہیں، دربار میں پہونچ کر تحفے تحائف گزارنے اور خلعت وانعام کے ساتھ مراسلہ کا جواب لیکر رخصت ہوئے''۔

اکبر اعظم کے عہد سے اکبر شاہ ثانی کے وقت تک اس ملک نے ہر طرح کے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ یہاں تک کہ اکبر کے ملک پر باہر سے آنے والے فرنگیوں کا قبضہ ہو گیا اور انھوں نے اپنے ملک کی مصنوعات وغیرہ سے اپنی اس نئی عملداری کے گوشہ گوشے کو رونق عطا کی۔

علم و دانش کی ترویج و اشاعت کے معاملے میں ان کا بڑا کارنامہ چھاپہ خانوں کا قیام ہے،

سید مقیت الحسن نے اس بارے میں لکھا ہے:

''عربی فارسی اردو ٹائپ مسٹر چارلس ولکنس نے اٹھارہویں صدی کے نصف آخر (بارہویں صدی ہجری کے ربع آخر) میں وضع کیے،...کلکتہ میں انھوں (انگریزوں) نے ایشیائی اور ہندوستانی مضامین پر کام کرنے کے لیے دو موقر ادارے قایم کیے: ایک ایشیاٹک سوسائٹی، جس کا قیام 1784 (1198ھ) میں عمل میں آیا دوسرا کالج آف فورٹ ولیم جو 1800 (1215ھ) میں بنیاد پذیر ہوا....سب سے پہلی کتاب جو اس (نستعلیق) ٹائپ میں چھاپی گئی وہ فرانسس بالفور کی ایڈٹ اور ترجمہ کی ہوئی ''انشائے ہرکرن'' تھی جو 1781 (1195ھ) میں کلکتہ سے شائع ہوئی)....

دوسری اہم کتاب گاسٹ کی ڈکشنری انگلش اینڈ ہندوستانی ہے جو پہلی بار 1786 (1200-01ھ) میں شائع ہوئی''۔

علمائے یورپ میں سے جنھوں نے مشرقیات کے مطالعے میں اختصاص کیا مستشرق کہلانے لگے تھے۔ ان مستشرقین کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہندستانی زبان (اردو) کی قواعد مرتب کرنے کی سعی کی تھی۔ اس سلسلہ کی ابتدائی کاوشوں میں ایک جون جو شواکنٹلر کی ہندستانی قواعد (Dessertation Selectae) ہے جو اصلاً ڈچ زبان میں تھی۔ پھر اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا۔ یہ کتاب پہلی بار 1743 (1156ھ) میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔

زبان اردو کی قواعد سے متعلق کام کرنے والوں میں شاید سب سے معروف شخصیت ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی ہے، اس کی کتاب ہندستانی زبان کی گرامر (A Grammar of a Hindustani Language) پہلی مرتبہ 1796 (1210-11ھ) میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کے بعد قواعد اور لغت وغیرہ کی تالیف کا سلسلہ چل پڑا۔

مستشرقین نے زبان اردو کو ہر طرح اپنا لیا تھا۔ تصنیف، تالیف اور ترجمے کے علاوہ اہل یورپ میں سے متعدد لوگوں نے اردو میں شعر گوئی بھی اختیار کر لی تھی۔ مولوی محمد سردار علی نے ایک

تذکرہ ''یورپین شعرائے اردو'' کے نام سے مرتب کر کے 1344ھ (1925-26) میں حیدرآباد سے شائع کر دیا تھا، جس میں انگریز فرانسیسی اور پرتگیزی شعرائے اردو کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اردو کلام کے نمونے درج کیے تھے۔ ان مستشرقین میں سے متعدد نے اپنے ملک میں واپس جا کر بھی اس شوق کو باقی اور جاری رکھا تھا۔ اس طرح یہ زبان اردو اکبر شاہ ثانی کے وقت تک یورپ کے کئی ملکوں میں پہنچ گئی تھی۔

حواشی

1-تاریخ محمدی ص134

2-اردو مخطوطات آصفیہ ص262

1-ایران وافغانستان

3-مجموعہ نغز جلد 2 ص173

4-اردو مخطوطات انجمن جلد 3 ص131 تا 132

5-ریاض الفصحا ص131 تا 132

6-گلستان سخن جلد 1 ص241

7-ایضاً جلد 1 432 تا 433

2-نیپال

1-تواریخ نادر العصر ص33

2-گلستان سخن جلد 1 ص312

3-برما

1-ہادی ہریانہ ص168

2-شیو یرت لال ورمن اور خدمات ص69 تا 70

3-اردو مخطوطات انجمن جلد 2 ص220

4-سخن شعرا ص432

4-لنکا

1-مقالات شیرانی جلد1 ص165

2-تذکرہ مخطوطات جلد5 ص95

5-فرنگ

1-دربار اکبری ص66

2-کلکتہ کے قدیم اردو مطابع ص20ت24

3-کتابیات قواعد اردو ص57ت58

4-ایضاً ص51

ماخذ

الف- کتابیں

(متن میں جن کتابوں یا رسالوں سے بحث کی گئی ہے ان کے نام یہاں درج نہیں کیے گئے ہیں

1	آب بقا (تذکرہ)	خواجہ محمد عبدالرؤوف عشرت	بار اول نامی پریس لکھنؤ جنوری 1918 (1336ھ)
2	آب حیات	مولوی محمد حسین آزاد	پہلا آفسیٹ ایڈیشن 1982 اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ
3	آب حیات کا تنقیدی مطالعہ	پروفیسر سید مسعود حسن رضوی	بار اول، کتاب نگر، لکھنؤ 1953
4	آثار الشعرا (تذکرہ)	حافظ سید محمد ممتاز علی بھوپالی حافظ تخلص	(ناقص الطرفین) 1307ھ (1890)
5	آثار بنارس (تاریخ)	مولانا عبدالسلام نعمانی	مکتبہ ندوۃ المعارف، بنارس جنوری 1963
6	آرائش محفل	میر شیر علی جعفری متخلص بہ افسوس	پہلی بار، 1945 انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی
7	اردو داستان	ڈاکٹر سہیل بخاری	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اول 1987
8	اردو رباعیات	ڈاکٹر سلام سندیلوی	نسیم بکڈپو لکھنؤ بار اول 1963
9	اردو شاعری میں منظر نگاری	ڈاکٹر سلام سندیلوی	نسیم بکڈپو لکھنؤ اگست 1968

10	اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول نومبر 1972
11	اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی 1953
12	اردو مثنوی شمالی ہند میں (صحیفۂ اغلاط)	ڈاکٹر گیان چند جین	انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ 1969
13	اردو مخطوطات	(خدا بخش جنوبی ایشیائی علاقائی خدا بخش اورنٹل پبلک سمنار 1987 کے مقالات)	لائبریری، پٹنہ 1999
14	اردو میں مرثیے کا ارتقا- ابتدا سے انیس تک	ڈاکٹر مسیح الزماں	کتاب نگر لکھنؤ، پہلی اشاعت 1981
15	اردو میں سائنسی ادب کا اشاریہ	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	مقتدرہ قومی زبان، کراچی طبع اول 1981
16	اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ	ڈاکٹر محمد ایوب قادری	ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور طبع اول 1988
17	اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (آصفیہ) کے اردو مخطوطات جلد اول	نصیر الدین ہاشمی	مطبع ابراہیمیہ حیدر آباد دکن، 1381 ہجری (1961)
18	ایضاً جلد دوم		مطبع اعجاز مشین پریس، حیدرآباد دکن، 1381ھ (1961)
19	افسانۂ لکھنؤ	آنا جوشرف، مرتب: سید محمود نقوی	نشاط پبلیکیشنز، دہلی 1985
20	انتخاب دواوین	مولوی امام بخش صہبائی، مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی	شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی اشاعت اول 1987
21	انتخاب رغمی	مولوی عظیم الدین رغمی (مولف) ڈاکٹر محمد انصار اللہ (مرتب)	تاج پرنٹنگ پریس علی گڑھ 1981

22	انتخاب کلام الٰہی بخش خاں معروف	مرتب: عتیق احمد صدیقی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1991
23	انتخاب ناسخ (شیخ امام بخش ناسخ)	مرتب: رشید حسن خاں	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی اپریل 1972
24	انتخاب یادگار (تذکرہ)	امیر احمد امیر مینائی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ پہلا ایڈیشن 1982
25	انشائے بہار بے خزاں	مولوی غلام امام شہید الہ آبادی	مطبع آئین ہند دہلی
26	باندہ اور غالب	صالحہ بیگم قریشی	بُندیلکھنڈ پریس جھانسی 1994
27	برار کی تمدنی و علمی تاریخ۔ مسلم عہد حکومت میں	ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل	سلمان فائن آرٹس، ناگپور 2001
28	برہن کی کہانی یعنی محمد مقصود مقصود لکھنوی کا بارہ ماسہ	محمد انصار اللہ	مکتبہ جامعہ علی گڑھ اشاعت دوم 1979
29	بمبئی میں اردو (1914) تک	ڈاکٹر میمونہ دلوی	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی بار اول ستمبر 1970
30	بہار بے خزاں (تذکرہ)	احمد حسین سحر، مرتب: نعیم احمد	علمی مجلس، دہلی 1968
31	بہارستان ناز (تذکرہ)	حکیم فصیح الدین رنج، مرتب: خلیل الرحمٰن داودی	مجلس ترقی ادب، لاہور مارچ 1965
32	بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقا 1857 تک	سید اختر احمد اختر اورینوی	شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ، مارچ 1957
33	بھوپال ادب کے آئینہ میں	ڈاکٹر محمد نعمان	سیفیہ آرٹس، کامرس، اینڈ لا کالج بھوپال 1994
34	بیگمات اودھ	شیخ تصدق حسین	کتاب نگر لکھنؤ 1956

35 پری جمال بیگمات شاہان اودھ خواجہ عبد الرؤوف عشرت لکھنوی حمیدیہ پریس دہلی ستمبر
مرتب: مولانا عبدالسلام رامپوری 1935

36 بیخ آہنگ میں مکاتیب غالب مرزا اسد اللہ خاں غالب مرتب: دل پبلیکیشنز بمبئی اپریل
کالیداس گپتا رضا 1989

37 پنجاب میں اردو حافظ محمود خاں شیرانی مرتب: خورشید مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد
احمد خاں یوسفی 1988

38 پہیلی نامہ (مختلف شاعروں کی مولف الطاف رسول دہلوی مطبع نارائنی دہلی
پہیلیاں) 1976 (1293ھ)

39 تاریخ آصفی (اردو ترجمہ تنقیح مرزا ابو طالب اصفہانی ترجمہ: ڈاکٹر ادارۂ صبح ادب، دہلی 1968
الغافلین) ثروت علی

40 تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ، ترجمہ اردو: مطبع منشی تیج کمار لکھنؤ 1963
مرزا محمد عسکری

41 تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند مدیر خصوصی: گروپ کیپٹن سید فیاض پنجاب یونیورسٹی لاہور 1971
اردو ادب حصہ سوم محمود

42 تاریخ اودھ جلد سوم حکیم محمد نجم الغنی خاں رامپوری مطبع مطلع العلوم مراد آباد اگست
1912

43 تاریخ گجرات وسیلۃ الظفر لآل پروفیسر سید ابو ظفر ندوی ندوۃ المصنفین دہلی صفر
مظفر 1378 (ستمبر 1958)

44 تاریخ محمدی مرزا محمد بن رستم ہندوستان پرنٹنگ ورکس رامپور
مرتب: امتیاز علی عرشی طبع اول 1960

45 تاریخ محمودی شاہ عبدالستار علوی جھنجھانوی، ترجمہ: ادارۂ مطبوعات مدرسہ نور محمد
(کتاب الشہادات) ڈاکٹر تنویر احمد علوی جھنجھانہ ضلع مظفر نگر

46	تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول (ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد)	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1984
47	ایضاً جلد دوم	ایضاً	ایضاً
48	ایضاً جلد سوم	ایضاً	ایضاً
49	ایضاً جلد چہارم	ایضاً	ایضاً
50	ایضاً جلد پنجم	ایضاً	ایضاً
51	تذکرہ مخطوطات جلد ششم	مرتبین: محمد اکبرالدین صدیقی، محمد علی اثر	ڈاکٹر ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، دکن 1983 (1403ھ)
52	تذکرۃ الذاکرین	سید آغا اشہر لکھنوی	شمسی پریس جھانسی 1946
53	تذکرۂ سرور (عمدہ منتخبہ)	اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور مرتب: خواجہ احمد فاروقی	شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی مارچ 1961
54	تذکرۂ شعرا	ابن امین اللہ طوفان مرتب: قاضی عبدالودود	مطبوعہ آزاد پریس پٹنہ 1954
55	تذکرہ شعرائے اردو	میر حسن دہلوی، مع مقدمہ از محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی	انجمن ترقی اردو ہند دہلی طبع جدید 1940
56	تذکرہ شعرائے جے پور	احترام الدین احمد شاغل	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ 1958
57	تذکرہ شورش	از: غلام حسین شورش مرتب: ڈاکٹر محمود الٰہی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ پہلا ایڈیشن 1984
58	ترجمہ حدائق البلاغت	شیخ امام بخش صہبائی	مطبع منشی نولکشور لکھنؤ
59	تذکرہ نادر	میرزا کلب حسین خاں نادر مرتب: مسعود حسن رضوی ادیب	میر کتاب نگر لکھنؤ 1957
60	تذکرۂ نعت گویان بریلی	ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب	روشن پبلیکیشنز بدایوں 1986

61 تذکرۂ ہندی	شیخ غلام ہمدانی مصحفی مرتب: مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن طبع اول 1933
62 تفصیلی فہرست مخطوطات متفرقہ	منظور احسن عباسی	پنجاب پبلک لائبریری لاہور 1964
63 تقویۃ الایمان مع دو ابواب یعنی:	مولانا محمد اسماعیل شہید	مطبع مجتبائی میرٹھ
باب اول تقویۃ الایمان رسالہ بیان الصفات	از مولوی محمد حسین فقیر	
وباب دوم تقویۃ الایمان تذکیر الاخوان	مترجم مولوی محمد سلطان	
مع رسالہ عصائے فقیر	از مولوی محمد حسین فقیر	
64 تلاش وتعارف	ڈاکٹر حنیف نقوی	نصرت پبلشرز لکھنؤ 1987
65 تلخیص معلی	ڈپٹی کلب حسین خاں نادر مرتب: ڈاکٹر انصار اللہ نظر	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی اشاعت اول 1975
66 ایضاً	ڈپٹی کلب حسین خاں نادر مرتب: ڈاکٹر انصار اللہ نظر	لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ بار اول 1976
67 تواریخ کانپور جلد اول، دوم، سوم	منشی درگا ہی لال	مطبع شعلۂ طور کانپور
68 تواریخ گورکھپور (قلمی) سرورق ندارد		
69 تواریخ نادر العصر	منشی نولکشور	خدا بخش اورنٹل پبلک لائبریری پٹنہ نقش ثانی 1990
70 ثلاثۂ غسالہ	حکیم حبیب الرحمٰن مرتب: ڈاکٹر سید عارف نوشاہی	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور مارچ 1995

71 جامع الحکایات ہندی	شیخ صالح محمد عثمانی مرتب: پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر	مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول جون 1963
72 جائزۂ مخطوطات اردو جلد اول	مولف مشفق خواجہ	مرکزی اردو بورڈ لاہور طبع اول فروری 1979
73 جلوۂ خضر (تذکرہ)	صفیر بلگرامی تلخیص وتنقید: ظفر اوگانوی	اقدار کتاب گھر، کلکتہ دسمبر 1973
74 جنگ نامۂ آصف الدولہ ونواب رامپور	خلیفہ محمد معظم عباسی مرتب: محمد ایوب قادری	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی اشاعت اول 1980
75 چمن انداز (تذکرہ مراۃ خیالی کا دوسرا حصہ)	درگا پرشاد کھتری دہلوی نادر تخلص	اکمل المطابع دہلی 1883
76 چند اہم اخبارات ورسائل	قاضی عبدالودود	ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ 1993
77 حکیم آغا جان عیش اور ہریانہ کے مشاہیر	بلجیت سنگھ مطیر	کایا پبلیکیشنز بہادر گڑھ پہلا ایڈیشن دسمبر 1981
78 خلاصۂ قوانین یعنی تلخیصات مجدد نادری	کلب حسین خاں نادر	مطبع اسعد الاخبار اکبر آباد 1265ھ (1849)
79 خمخانۂ جاوید (تذکرۂ ہزار داستان) جلد دوم	لالا سری رام دہلوی	امپیریل بک ڈپو پریس دہلی 1911
80 ایضاً جلد سوم	ایضاً	دلی پرنٹنگ ورکس دہلی 1917
81 ایضاً جلد چہارم	ایضاً	ہمدرد پریس دہلی، بار اول 1926
82 ایضاً جلد پنجم	مرتب: پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی	ناشر لالا امیر چند بک سیلر دہلی 1940

83 ایضاً جلد ششم — مرتب: خورشید احمد خاں یوسفی — مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1990

84 خندۂ گل (ظریف شاعروں کا تذکرہ) — مولانا عبدالباری آسی الدنی — نگار مشین پریس لکھنؤ 1929

85 خوش معرکۂ زیبا جلد اول — سعادت علی خاں ناصر مرتب: مشفق خواجہ — مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول 1970

86 ایضاً جلد دوم — ایضاً — ایضاً مارچ 1972

87 دارالسرور برہانپور — مولوی معین الدین ندوی — جامعہ اشرفیہ برہانپور نومبر 1978

88 دربار اکبری مع دیباچہ واشاریہ از شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد پروفیسر محمد انصار اللہ — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی پہلا ایڈیشن

89 دستور الفصاحت وخاتمہ) — (مقدمہ حکیم سید اج علی خاں یکتا بہ تصحیح امتیاز علی خاں عرشی — ہندوستان پریس، رامپور 1943

90 دفتر فصاحت (دیوان وزیر) — خواجہ محمد وزیر وزیر — مطبع مصطفےٰ لکھنؤ 1308ھ (1891)

91 دکن میں اردو — نصیر الدین ہاشمی — ترقی اردو بیورو نئی دہلی پہلا ایڈیشن 1985

92 دہلی کی آخری شمع — مرزا فرحت اللہ بیگ — اسٹار بک ڈپو کلکتہ

93 دہلی کے اردو مخطوطات کی وضاحتی ڈاکٹر صلاح الدین فہرست — انجمن ترقی اردو ہند دہلی ستمبر 1975

94 دیوان اعظم — اعظم علی اعظم الہ آبادی — مطبع نور الابصار الہ آباد 1285ھ (1868)

95	دیوان جہاندار	شاہزادہ جواں بخت جہاندار شاہ مع مقدمہ از ڈاکٹر وحید قریشی	مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول جنوری 1966
96	دیوان حیدری	سید حیدر بخش حیدری دہلوی مرتب: ڈاکٹر عبادت بریلوی	اردو دنیا کراچی 1966
97	دیوان ذوق (خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق)	مولف: شمس العلما محمد حسین آزاد دہلوی	علیمی پرنٹنگ ورکس دہلی 1933 (1351ھ)
98	دیوان شاداں دیوان اول	مہاراجا چندو لال شاداں مرتب: راجا کشن پرشاد شاد	محبوب پریس حیدرآباد دکن سال ترتیب 1239ھ
99	ایضاً دیوان دوم	ایضاً	ایضاً 1243ھ
100	دیوان شیفتہ	نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1985
101	دیوان ظفر	بہادر شاہ ثانی ظفر تخلص پیش لفظ: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	اعجاز پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی بار اول جنوری 1997
102	دیوان عرش	میر حسن عسکری عرف میر کلو عرش مرتب ایم حبیب خاں	انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی دسمبر 1987
103	دیوان غافل	منور خاں غافل ابن صلابت خاں	مطبع منشی نولکشور کانپور بار اول دسمبر ۱۸۹۷
104	دیوان غالب کامل (تاریخی ترتیب سے)	مرزا اسد اللہ خاں غالب مرتب: کالی داس گپتا رضا	ساکار پبلشرز پرائیوٹ لمیٹڈ بمبئی بار اول فروری ۱۹۸۸
105	دیوان غالب جدید المعروف بہ نسخۂ حمیدیہ	مرزا اسد اللہ خاں غالب مرتب: مفتی محمد انوار الحق	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ پہلا فوٹو آفسٹ ایڈیشن 1982

106 دیوان غالب نسخہ حمیدیہ	مرزا اسد اللہ خاں غالب مرتب: پروفیسر حمید احمد خاں	مجلس ترقی ادب لاہور طبع دوم سنہ 1983
107 دیوان غالب (مطبوعہ اکتوبر 1841 عکسی)	مرزا اسد اللہ خاں غالب پیش لفظ: کالی داس گپتا رضا	ول پبلکیشنز بمبئی 1986
108 دیوان غالب (چوتھا ایڈیشن، مطبوعہ مطبع نظامی کانپور، جون جولائی 1962 عکسی)	مرزا اسد اللہ خاں غالب پیش لفظ: کالی داس گپتا رضا	ول پبلکیشنز بمبئی 1987
109 دیوان فراق (عکس نسخہ قلمی)	ثناء اللہ خاں فراق دہلوی	مخزونہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند دہلی
110 دیوان گویا	فقیر محمد خاں گویا بلیخ آبادی	مطبع منشی نولکشور لکھنؤ 1288ھ (1871)
111 دیوان مصحفی	شیخ غلام ہمدانی مصحفی مرتبین: اسیر لکھنوی، و اسیر مینائی	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ 1990
112 دیوان مصحفی (دیوان ہشتم)	شیخ غلام ہمدانی مصحفی	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ 1995
113 دیوان مومن	حکیم محمد مومن خاں مومن دہلوی	مطبع جوہر ہند دہلی 1299ھ / 1882
114 دیوان مہر (نسخہ ناقص الآخر)	امین الدولہ سید آغا علی خاں مہر، کتبہ: جعفر	مطبوعہ 1263ھ (1847)
115 دیوان نوازش	آغا نوازش حسین خاں نوازش مرتب. قاضی عبدالودود	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ 1993
116 دیوان نیاز (فارسی و اردو)	شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی	مطبع نامی منشی نولکشور، کانپور اپریل 1875

117 دیوان ولا	مظہر علی خاں ولا مرتب: ڈاکٹر عبادت بریلوی	ادارۂ ادب وتنقید، لاہور دسمبر 1983
118 ذخیرۂ شیرانی میں اردو مخطوطات	سید جمیل احمد رضوی	مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد 1986
119 راجستھان میں اردو زبان وادب (1857 تک)	ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی	راجستھان اردو اکادمی جے پور مارچ 1992
120 رسالۂ قواعد صرف ونحو اردو	مولوی امام بخش صہبائی	مطبع منشی نولکشور لکھنؤ
121 ریاض الفصحا (تذکرہ)	شیخ غلام ہمدانی مصحفی مرتب: مولوی عبدالحق	جامعہ برقی پریس دہلی 1934
122 ریاض دلربا	منشی گمانی لعل مرتب: ڈاکٹر ابن کنول	کنول پبلیکیشنز دہلی مئی 1989
123 سخن شعرا (تذکرہ)	ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ	اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ پہلا آفسٹ ایڈیشن 1982
124 سخنوران قصبہ کڑا (تذکرہ شعرائے الہ آباد)	محمد واصل عثمانی	مکتبہ ذی النورین کراچی اشاعت اول 1978
125 سخنوران گجرات	سید ظہیر الدین مدنی	ترقی اردو بیورو نئی دہلی 1981
126 سراپا سخن (تذکرہ)	سید محسن علی موسوی محسن	مطبع نامی منشی نولکشور لکھنؤ بار سوم اپریل 1898 1315ھ
127 سراج نظم	شیخ امام بخش ناسخ مرتب: میر علی اوسط رشک	مطبع محمد حسین لکھنؤ 1265ھ (1849)
128 سرگذشت غالب (مرزا اسداللہ خاں غالب)	میرزا محمد بشیر بھرتپوری	عزیزی پریس آگرہ 1942

129 سعادت یار خاں رنگین	ڈاکٹر صابر علی خاں	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی 1956
130 سکھلا (کہانی)	کاظم علی جواں مرتب: ڈاکٹر محمد اسلم فرخی	مجلس ترقی ادب لاہور دسمبر 1963
131 شاہان اودھ کے کتب خانے	ڈاکٹر اے اشپرنگر مرتب و مترجم: محمد اکرم چغتائی	انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی 1973
132 شاہ حسین حقیقت اور ان کا خاندان	مشرف احمد	ادارۂ ادبیات پاکستان کراچی بار اول 1977
133 شعرائے اردو کے تذکرے	ڈاکٹر سید حنیف نقوی	نسیم بکڈپو لکھنؤ بار اول جون 1976
134 شمیم سخن (تذکرہ)	مولوی عبدالحی صفا بدایونی	مطبع منشی نولکشور لکھنؤ بار دوم 1891
135 شوکت نادری (تذکرہ)	میرزا کلب حسین خاں نادر ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر شاہ عبدالسلام	نامی پریس لکھنؤ ستمبر 1984
136 شہر چارہ گراں	احسان آوارہ	ماہنامہ برگ حنا، چھاؤنی باندہ بار اول 1991
137 شیو برت لال ورمن اور ان کی علمی و ادبی خدمات	ڈاکٹر ذکیہ خاتون	شیو برت لال ایجوکیشنل ریسرچ سوسائٹی علی گڑھ 2001
138 صبح گلشن (تذکرہ)	سید علی حسن خاں بہادر	مطبوعہ بھوپال 1295ھ (1878)
139 صوبۂ متوسط و برار میں اردو کی حالت	سید علی شمیم حاتمی	انجمن ترقی اردو ہند حیدر آباد دکن 1938

140 صوبہ شمالی ومغربی کے اخبارات ومطبوعات	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پہلی بار 1962
141 صہبائی ایک مختصر تعارف	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ 1986
142 طبقات الشعرا (تذکرہ)	قدرت اللہ شوق مرتب: نثار احمد فاروقی	مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول: جنوری 1868
143 طبقات شعرائے ہند	مولوی کریم الدین پانی پتی	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1983
144 طبقات سخن (تذکرہ)	غلام محی الدین مبتلا و عشق میرٹھی مرتب: ڈاکٹر بیگم نسیم اختر ارعلی	نظامی آفسیٹ پریس لکھنؤ 1991
145 عروس الاذکار (تذکرہ)	نصیر الدین نقش حیدرآبادی مرتب: افسر صدیقی امروہوی	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی 1975
146 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کے اردو مخطوطات	ڈاکٹر عطا خورشید	خدا بخش اورنٹل پبلک لائبریری پٹنہ 1995
147 عود ہندی	مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی	مطبع نامی منشی نولکشور لکھنؤ 1331ھ (1913)
148 عین المعارف (دیوان آسی)	مولوی عبد العلیم آسی مرتب: سید شاہ مشاہد علی فانی گورکھپوری	طبع دوم
149 غالب کے لطیفے	مفتی انتظام اللہ شہابی	حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی پہلی بار سنہ ندارد
150 غزلیات ذوق ردیف الف مع مقدمہ وغیرہ	شیخ محمد ابراہیم ذوق مرتب: محمد انصار اللہ	مقالہ برائے ایم اے غیر مطبوعہ 1963

151 فسانۂ عجائب	مرزا رجب علی بیگ سرور	رام نارائن لال ازن کمار پبلشرو
	مرتب: مخمور اکبرآبادی	الہ آباد 1990
152 فہرست (قلمی) کتب خانۂ	مرتب: محمد انصار اللہ	فارسی اردو کتب مطبوعہ
ذاتی نواب سید حیدر علی خان بہادر		وغیر مطبوعہ
جعفری گوالٹولی کانپور		
153 فہرست (قلمی) کتب خانۂ	مرتب: محمد انصار اللہ	فارسی اردو کتب مطبوعہ و قلمی
ذاتی نواب سید قیصر حسین		
خاں قیصر پٹکاپوری کانپور		
154 فہرست کتابہائے فارسی	مرتب سید عارف نوشاہی	مرکز تحقیقات فارسی ایران
چاپ سنگی و کمیاب کتابخانۂ گنج		و پاکستان اسلام آباد 1986
بخش جلد یکم		
155 فہرست مخطوطات اردو	مرتب: عابد امام زیدی	بیسٹ مشین پریس کلکتہ
خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری،		1962
باکی پور پٹنہ جلد اول		
156 فہرست مخطوطات اردو مملوکہ	مرتب امتیاز علی عرشی	ہندوستان پرنٹنگ ورکس
رضا لائبریری رامپور جلد اول		رامپور 1967
157 فہرست مخطوطات اردو	مرتب سید عارف نوشاہی	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور
کتابخانۂ گنج بخش		جولائی 1978
158 فہرست مخطوطات شیرانی	مرتب: ڈاکٹر محمد بشیر حسین	ادارۂ تحقیقات پاکستان،
(حافظ محمود خاں شیرانی)		دانشگاہ پنجاب لاہور چاپ دوم
جلد اول		اگست 1975
159 ایضاً جلد دوم	ایضاً	چاپ اول جون 1969
160 ایضاً جلد سوم	ایضاً	چاپ اول جون 1973

161 فہرست نمائش ادارۂ تحقیقات اردو جلد اول حصہ مخطوطات وغیرہ — مرتب قاضی محمد سعید — ادارۂ تحقیقات اردو پٹنہ 1959

162 قاموس الکتب اردو جلد اول مذہبیات — زیر نگرانی: ڈاکٹر مولوی عبدالحق — انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی اشاعت اول جون 1961

163 ایضاً جلد دوم تاریخیات — انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی اشاعت اول جون 75-1974

164 ایضاً جلد سوم عمرانیات — انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی اشاعت اول جون 80-1978

165 قطعہ منتخب (تذکرہ) — عبدالغفور خاں نساخ، تلخیص و ترتیب: انصار اللہ نظر — انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی اشاعت اول جون 1974

166 قیصر التواریخ (تواریخ اودھ) — سید کمال الدین حیدر — مطبع نامی نولکشور لکھنؤ 1896

167 کاشف الحقائق عرف بہارستان سخن — سید امداد امام اثر — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی دوسرا ایڈیشن 1998

168 کاملان رامپور (تذکرہ) — حافظ احمد علی خاں شوق — خدا بخش اورنٹل پبلک لائبریری پٹنہ 1985

169 کتاب الہند جلد دوم — ابو ریحان البیرونی ترجمہ: سید اصغر علی، نظر ثانی: مولوی سید عطا حسین — انجمن ترقی اردو ہند دہلی 1942

170 کتابیات تراجم جلد اول علمی کتب	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد طبع اول 1986
171 کتابیات قانون اردو	عطش درانی، نظر ثانی: محمود الحسن	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد طبع اول 1984
172 کتابیات قواعد اردو	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد طبع اول 1985
173 کتابیات لغات اردو	ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد طبع اول 1986
174 کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات	ڈاکٹر حامد اللہ ندوی	موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی 1990
175 کچھ غالب کے بارے میں حصہ اول	قاضی عبدالودود	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ 1995
176 ایضاً حصہ دوم	ایضاً	ایضاً 1995
177 کلام انشا	انشاء اللہ خاں انشا مرتب: مرزا محمد عسکری و محمد رفیع	ہندوستان اکیڈمی اتر پردیش الہ آباد 1952
178 کلکتہ کے قدیم اردو مطابع اور ان سید مقبول الحسن کی مطبوعات ایک تذکرہ		عثمانیہ بکڈپو کلکتہ ۱۹۸۱
179 کلیات آتش جلد اول	خواجہ حیدر علی آتش مرتب: مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی	مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول
180 ایضاً جلد دوم	ایضاً	طبع اول جون 1975
181 کلیات احسان (زیراکس)	حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان، مرتبہ: ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ	اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد ستمبر 1968

182 کلیات انشا	سید انشاء اللہ خاں انشا	مطبع نامی منشی نولکشور، کانپور بار اول دسمبر 1894
183 کلیات ذوق (اردو)	شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی	ترقی اردو بیورو نئی دہلی دوسرا ایڈیشن 1989
184 کلیات صہبائی	شیخ امام بخش صہبائی دہلوی	(مشتمل بر: ریزۂ جواہر تفسی، بیاض شوق پیام، رسالہ نحو فارسی، دیوان صہبائی، کافی در علم قوافی، وافی شرح کافی، جواہر منظوم رباعیات، مخزن اسرار وغیرہ)
185 کلیات ظفر (ضروری اوراق کے زیر اکس)	بہادر شاہ ثانی ظفر تخلص	سنگ میل پبلیکیشنز لاہور 1994
186 کلیات عیش	حکیم آغا جان عیش دہلوی مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو	ترقی اردو بیورو، نئی دہلی پہلا ایڈیشن 1992
187 کلیات شیخ امام بخش ناسخ (مشمولات: دیوانِ اول مسمّٰی بہ دیوانِ ناسخ در متن دیوان دوم مسمّٰی بہ دفتر پریشان و دیوانِ سوم مسمّٰی بہ دفتر شعر بر حاشیہ)	مرتب میر علی اوسط رشک	مطبع میر حسن رضوی، مطبع حسنی لکھنؤ، 1258ھ، مع تصحیح اغلاط و تحقید الفاظ کلیات ناسخ از میر علی اوسط رشک 1259ھ (1843)
188 کلیات شیخ امام بخش ناسخ	کارخانہ علی بخش خاں لکھنؤ	ہفتم جمادی الاولی 1267ھ
189 کلیات شاہ نصیر جلد اول	شاہ نصیر الدین نصیر دہلوی مرتب: ڈاکٹر تنویر احمد علوی	مجلس ترقی ادب لاہور نومبر 1971
190 ایضاً جلد دوم	ایضاً	1977
191 ایضاً جلد سوم	ایضاً	جون 1986

192 ایضاً جلد چہارم	ایضاً	مئی 1988
193 گزشتہ لکھنؤ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ	مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی مرتب: شمیم انہونوی	نسیم بک ڈپو لکھنؤ جولائی 1965
194 گلدستۂ عشق (دیوان رند)	نواب سید محمد خاں رند	مطبع منشی نولکشور، کانپور بار ہفتم ذی قعدہ 1304ھ جولائی 1887
195 گلدستۂ نازنیناں	مولوی کریم الدین پانی پتی	مطبع رفاہ عام شاہجہاں آباد رجب 1304ھ جولائی 1887
196 گلزار ابراہیم (تذکرہ) مع گلشن ہند (تذکرہ)	علی ابراہیم خاں خلیل مرزا علی لطف مرتب: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 1352ھ، 1934
197 گلزار ابراہیمی مثنوی بحر الحقیقت کا دوسرا دفتر	میر حسن	مطبع نامی منشی نولکشور، کانپور اپریل 1904 محرم 1321ھ
198 گلستان بے خزاں عرف نغمہ سبز لیب	حکیم سید قطب الدین باطن	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1982
199 گلستان سخن جلد اول	مرزا قادر بخش صابر گورگانی مع مقدمہ از خلیل الرحمٰن داودی و ڈاکٹر وحید قریشی	مجلس ترقی ادب لاہور جون 1966
200 ایضاً جلد دوم	ایضاً	جون 1966

201 گلشن بے خار تذکرہ اشعار زبان اردو (چند اوراق نقل کردہ محمد انصار اللہ از نسخہ حلیم انٹر کالج کانپور بہ سال 1962) — مولف نواب مصطفا خاں بہادر متخلص بہ شیفتہ بہ اہتمام: مولوی محمد باقر سپرنٹنڈنٹ — مطبع لیتھو گریفک دہلی اخبار 1253ھ نبوی 1837 عیسوی

202 ایضاً — نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ — اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1982

203 گلشن سخن — مردان علی خاں بتلا لکھنوی مرتب: سید مسعود حسن رضوی ادیب — انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ 1865

204 گلشن ہمیشہ بہار — نصر اللہ خاں خویشگی مرتب: ڈاکٹر محمد اسلم فرخی — انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی 1967

205 گلکرسٹ اور اس کا عہد — محمد عتیق صدیقی — انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ 1960

206 گل مغفرت — سید حیدر بخش حیدری مرتب: ڈاکٹر ناظر حسین زیدی — مجلس ترقی ادب لاہور 1965

207 مثنوی حدیث رجعت — سید علی اوسط رشک — مطبع متین لکھنؤ، 1263ھ (1847)

208 مثنوی گلدستۂ انجمن — اشرف خاں شاہجہاں آبادی متخلص بہ خان — نسخہ قلمی مملوکہ سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ، کتابت: ذی الحجہ 1246ھ (1830-31)

209 مثنوی مہر و ماہ — نواب علی بہادر ثانی علی نواب باندہ، برگ اکاڈمی، چھاؤنی باندہ مرتب: احسان آوارہ — 1990

210 مثنوی ناسخ — شیخ امام بخش ناسخ مرتب: حبیب اللہ کتابستان الہ آباد 1931 خاں مظفر

211 مثنوی شہادت نامۂ آل نبی	شیخ امام بخش ناسخ	مطبع منشی نول کشور کانپور، تیسری مرتبہ اپریل 1888
212 مجالس رنگین	سعادت یار خاں رنگین دہلوی، مرتب: سید مسعود حسن رضوی ادیب	نظامی پریس لکھنؤ پہلا ایڈیشن نومبر 1929
213 مجمع الاشعار (فارسی و اردو) ناقص الآخر		مطبوعہ 1268ھ (1852)
214 مجموعۂ نثر غالب (مشمولات: نکات و رقعات غالب، لطائف غیبی، سوالات عبدالکریم، نامۂ غالب، تیغ تیز، اور متفرق نثر پارے)	مرزا اسداللہ خاں غالب مرتب: خلیل الرحمٰن داودی	مجلس ترقی ادب لاہور نومبر 1967
215 مجموعۂ نغز یعنی تذکرہ شعرائے اردو	حکیم قدرت اللہ خاں قاسم مرتب: حافظ محمود خاں شیرانی	ترقی اردو بورڈ دہلی اکتوبر 1973
216 مخزن آلام (دیوان احمد) (الطرفین)	(ناقص محمد احمد خان بہادر احمد تخلص بیخ آبادی	مطبوعہ 1307ھ (1889-90)
217 مخزن شعرا یعنی تذکرہ شعرائے گجرات	قاضی نور الدین خاں رضوی فائق، مرتب: مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن 1933
218 مخطوطات انجمن ترقی اردو (مخطوطات) جلد اول	(اردو افسر صدیقی امروہوی	انجمن ترقی اردو پاکستان
219 ایضاً جلد دوم	ایضاً	1967
220 ایضاً جلد سوم	ایضاً	1975
221 ایضاً جلد چہارم	ایضاً	
222 ایضاً جلد پنجم	ایضاً	1978

223 ایضاً جلد ششم	ایضاً	1982
224 ایضاً فارسی وعربی مخطوطات	سید سرفراز علی رضوی	انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی 1967
225 مذہب عشق (قصہ گل بکاؤلی)	نہال چند لاہوری	اگروال بک ڈپو دہلی، سال ندارد
226 مراثی خلیق	میر محمد محسن خلیق	قلمی مجلد، مملوکہ سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ
227 مسرت افزا (تذکرہ)	امراللہ الہ آبادی تلخیص وترجمہ عطا کاکوروی	عظیم الشان بکڈپو پٹنہ اپریل 1968
228 مصباح الحیات	مولانا میر محمد حیات، حیات تخلص (متوفی 1281ھ)	اردو پبلشنگ ہاؤس، بنگلور سٹی، سال اشاعت ندارد

(مشمولات: مجموعہ اول مسمی بہ عشرۃ المبشرۃ، رسالہ سراج العقائد، رسالہ سراج الفقہ، رسالہ مرآۃ الاحکام، رسالہ تاج الفرائض، رسالہ تاج النصائح، رسالہ آداب سعادت، رسالہ احوال النبی، رسالہ نور الہدایت، رسالہ شفاعت نامہ، رسالہ دیدار نامہ۔

مجموعہ دوم: یعنی حضرات خمسہ: رسالہ تاج العقیدہ، رسالہ شرف الایمان، رسالہ نجات نامہ، رسالہ نور الاسلام، رسالہ ہدایت نامہ، رسالہ مفتاح الایمان۔

مجموعہ سوم: مسمی بہ کشف کبری، رسالہ آب حیات رسالہ کلید معرفت، رسالہ سوم باب المغفرت یعنی رسالہ دستور الایمان، رسالہ زاد الایمان اور رسالہ نور الایمان)۔

229 مضامین شرر	مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی	مرکنٹائل پریس لاہور بار اول
230 مطالعہ میر نظام الدین ممنون حیات شخصیت اور شاعری	ڈاکٹر غشاء الرحمٰن خاں منشا	نیشنل فائن پرنٹنگ پریس حیدر آباد دکن بار اول
231 معتمد الدولہ آغا میر	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی اگست 1988

232	مغرب کے نثری تراجم	ڈاکٹر مرزا حامد بیگ	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1988
233	مفید الشعرا (رسالہ تذکیر و تانیث)	حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی	مطبع مجیدی کانپور 1922
234	مقالات شیرانی جلد دوم	حافظ محمود خاں شیرانی مرتب: مظہر محمود شیرانی	مجلس ترقی ادب لاہور جنوری 1966
235	ایضاً جلد سوم	ایضاً	جولائی 1969
236	ایضاً جلد نہم	ایضاً	جون 1999
237	تذکرہ مہدانواں	ڈاکٹر سید شاہد اقبال	آستانہ حق نیو کریم گنج گیا سال اشاعت 2000
238	نادرات شاہی	شاہ عالم ثانی بادشاہ ہندوستان مرتب: امتیاز علی خاں عرشی	ہندوستان پریس رامپور 1943
239	تاریخ تجزیہ و تقدیر	ڈاکٹر سید شبیہ الحسن نونہروی	اردو پبلشرز لکھنؤ فروری 1975
240	ناگپور میں اردو کا ارتقائی سفر	ڈاکٹر شرف الدین ساحل	مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی بمبئی 1993
241	نسخۂ شیرانی اور دوسرے مقالات	سید قدرت نقوی	مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور مارچ 1988
242	نشتر عشق	آقا حسین علی خاں عظیم آبادی مرتب و مترجم: عطا کاکوی	دی آرٹ پریس پٹنہ مارچ 1968
243	نظم آخریں (رشک کا تیسرا دیوان)	میر علی اوسط رشک مرتب: ڈاکٹر محمد انصار اللہ	1966 غیر مطبوعہ

244	نظم مبارک ونظم گرامی (رشک کا پہلا اور دوسرا دیوان)	میر علی اوسط رشک	مطبع مولوی محمد حسین لکھنؤ 1261ھ(1855)
245	ایضاً بعد تصحیح واضافہ ومع صحیح نامہ ہر دو دیوان	تاج الشعرا میر علی اوسط رشک مملوکہ محمد انصار اللہ	مطبع مولوی محمد حسین لکھنؤ 1263ھ(1847)
246	نفس اللغہ حصہ اول	میر علی اوسط رشک	نیر پریس لکھنؤ طبع اول
247	مجموعہ منثورات	احسن مارہروی	مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1986
248	نو دریافت بیاض غالب بخط غالب	نقوش غالب نمبر حصہ دوم مدیر: محمد طفیل	ادارۂ فروغ اردو لاہور جولائی 1984
249	نوطرز مرصع	میر محمد حسین عطا خاں تحسین مرتب: سید نور الحسن ہاشمی	ہندوستان اکیڈمی الہ آباد 1958
250	واقعات اظفری (اردو ترجمہ)	میرزا علی بخت محمد ظہیر الدین اظفری گورگانی مترجم: عبدالستار بہ تصحیح وترمیم: محمد حسین محوی صدیقی	مودی پور پرنٹنگ ورکس بنگلور سنہ مارچ 1937
251	وزیر نامہ	وزیر السلطان سید محمد امیر علی خان بہادر	مطبع نظامی کانپور 1293ھ(1876)
252	ہادی ہریانہ (شاہ محمد رمضان شہید مہمی کے حالات)	پروفیسر منظور الحق صدیقی	حرا پبلیکیشنز لاہور 1993
253	ہندوستانی پریس	نادر علی خاں	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو 1990
254	ہندو شعرا	خواجہ عشرت لکھنوی	نامی پریس لکھنؤ بار اول جنوری 1931

255 یادگار شعرا	ڈاکٹر اسپرنگر مرتب: طفیل احمد	ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد 1943
256 یادگار حسینم	عبداللہ خاں نسیم	مطبوعہ 1303ھ (1886)
257 یادگار غالب	خواجہ الطاف حسین حالی	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی دوسرا ایڈیشن 1996
258 یادنامۂ داودی (خلیل الرحمٰن داودی)	مرتبین: حسین فراقی و جعفر بلوچ	دارالنذیر لاہور 2003
259 یورپین شعرا اردو	مولوی محمد سردار علی	نظام دکن پریس حیدرآباد دکن 1344ھ (1925-26)
260 شعرائے اردو کے اولین تذکرے	ڈاکٹر محمد انصار اللہ	لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ 1978

(ب رسالے وغیرہ)

1-سہ ماہی ''اردو'' انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی

(1) شمارہ جولائی اگست ستمبر 1968 میں

خلیق کی مرثیہ گوئی از: ڈاکٹر مسیح الزماں،

معراج نامۂ ناسخ از: رشید حسن خاں

(2) شمارہ خصوصی بیاد غالب جنوری فروری مارچ 1969

2-سہ ماہی ''اردو ادب'' انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

(1) شمارہ جون 1953 میں

مثنوی سراپا سوز از محمد علی شاہ میکش اکبر آبادی

فہرست مخطوطات از محمد ابرار حسین فاروقی

(2) شمارہ جولائی تا ستمبر 1954 میں

تذکرہ شعرائے فرخ آباد از ڈاکٹر مختار الدین احمد

فہرست مخطوطات از محمد ابرار حسین فاروقی

3-تماہی ''تحریر'' علمی مجلس دلی

(1) جلد ۴ نمبر 4 1970 تذکرہ صدر الدین آزردہ مرتب: مختار الدین احمد

4-ماہنامہ ''ماہ نو'' ادارۂ مطبوعات پاکستان کراچی

غالب کی صد سالہ برسی پر خصوصی اشاعت جنوری فروری 1969

5-''معاصر'' دائرہ ادب پٹنہ

(1) حصہ 2 میں

سراج لظم مصنفہ ناسخ از: قاضی عبدالودود

اور دوسرے میں متعلق مضامین

(2) حصہ ۲۱ میں

دیوان غالب کے دو نسخے از: قاضی عبدالودود

(3) حصہ 18، جولائی 1962 میں

تذکرۃ الابرار (خلاصہ) از: قاضی عبدالودود

خلاصہ سوانح لکھنؤ از: سید حسن

6-ماہنامہ ''نگار'' نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مومن نمبر دوسری اشاعت 1951

7-رضا لائبریری جرنل شمارہ نمبر 2 رامپور رضا لائبریری رامپور

رامپور کے دبستان شاعری کی ایک جھلک از شبیر علی خاں شکیب

فہرست مخطوطات اردو رضا لائبریری از ڈاکٹر شعایر اللہ خاں وجیہی

اور دوسرے متعلق مضامین

8-ہفتہ وار ''ہماری زبان'' انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

شمارہ مورخہ 15 راگست 1960

ایضاً یکم نومبر 1960۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو سفرناموں میں ہندوستانی تہذیب وثقافت

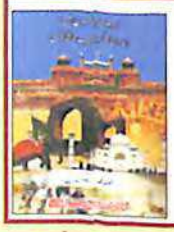

مرتب : خواجہ محمد اکرام الدین

صفحات:494

قیمت :-/166روپے

کلیات سجاد ظہیر

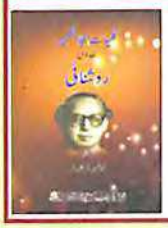

مرتبین: نجمہ ظہیر باقر علی باقر

صفحات:388

قیمت :-/146روپے

تاریخ ادب اُردو (جلد اوّل)

مصنفین :گیان چند جین

سیّدہ جعفر

صفحات:462

قیمت:-/454روپے (سیٹ)

تاریخ ادب اُردو (جلد دوم)

مصنفین : گیان چند جین

سیّدہ جعفر

صفحات:527

قیمت: -/545روپے (سیٹ)

تاریخ ادب اُردو (جلد سوم)

مصنفین :گیان چند جین

سیّدہ جعفر

صفحات: 464

قیمت :-/545روپے (سیٹ)

تاریخ ادب اُردو (جلد پنجم)

مصنفین گیان چند جین

سیّدہ جعفر

صفحات: 443

قیمت :-/545روپے (سیٹ)

₹ 164/-

ISBN: 978-81-7587-980-5

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025